تاریخ ادب اُردو

(1811 تا 1837)

جلد نہم

محمد انصار اللہ

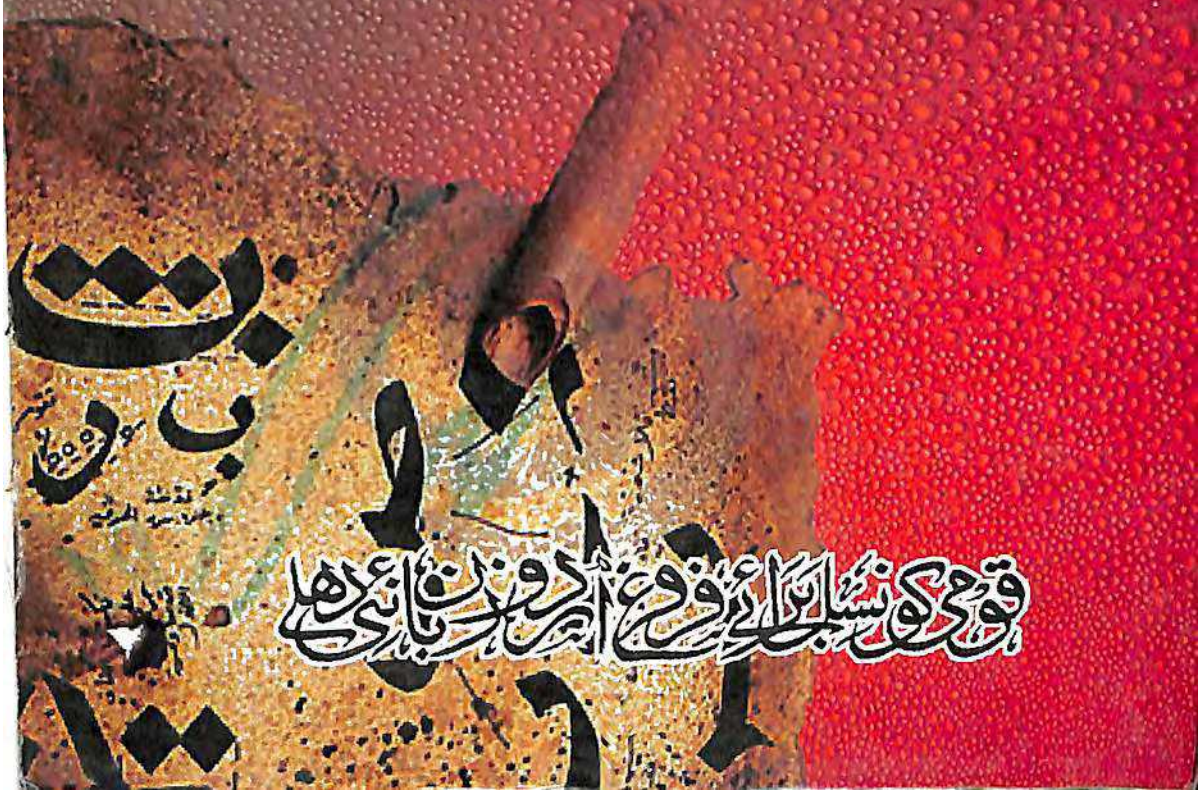

تاریخ ادب اردو

(1811 تا 1837)

جلد نہم

محمد انصار اللہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت	:	2012
تعداد	:	550
قیمت	:	-/126 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1586

Tareekh-e-Adab-e-Urdu Vol- IX

By : Mohd. Ansarullah

ISBN :978-81-7587-770-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159

ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

اردو دنیا کی ان مقبول ترین زبانوں میں سے ہے جس کے بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے والے دنیا کے مختلف ممالک میں آباد ہیں اور اب اس زبان کی عمر تقریباً ہزار سال کے قریب ہوگئی ہے۔ گذشتہ ڈھائی سو سال میں اس نہایت شیریں، وقیع اور دل پذیر زبان کی چھوٹی بڑی متعدد تاریخیں اور بہ کثرت تذکرے لکھے اور شائع کیے جا چکے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے، اردو زبان و ادب کے فروغ، ترویج اور توسیع پر نہایت عمدہ اور مثبت مقاصد کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ کونسل کی کوشش رہی ہے کہ عوام وخواص میں یکساں اس ہر دل عزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تذکرے اور تاریخ کی معیاری کتابوں کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔ تذکرہ نویسی میں جامع التذکرہ کے نام سے تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

تاریخ میں پہلی کوشش پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر سیدہ جعفر کا سترھویں صدی کی نظم ونثر سے متعلق ہے، پانچ جلدوں پر مشتمل مکرر اشاعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ جبکہ

دوسرا کام پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا اٹھارھویں صدی عیسوی کی نظم سے متعلق ہے جو ایک ضخیم جلد کی صورت میں جلد منظر عام پر آنے والی ہے۔ تیسرا کام پروفیسر محمد انصار اللہ کا انیسویں صدی عیسوی کی زبان و ادب کی نظم و نثر کے ارتقا سے متعلق ہے جو تین جلدوں اور ہر جلد تین حصوں پر مبنی ہے۔

اس طرح تاریخ ادب اردو کا یہ پروجیکٹ 17 جلدوں پر مشتمل ہوگا جن میں پہلے کی پانچ جلدیں جیسا کہ ذکر کیا گیا منظر عام پر آ چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب تاریخ ادب اردو کی 9 ویں جلد ہے جو پروفیسر انصار اللہ کی تصنیف ہے۔

ہماری کوشش ہے کہ بقیہ جلدیں بھی جلد از جلد اور بہتر انداز سے سامنے لا سکیں، اس کے لیے قارئین کرام اور ارباب علم و بصیرت کی طرف سے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ نیز اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تا کہ جو خامی رہ گئی ہے وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

(اقتباس)

''دو چار آدمی کیا، دس ہزار آدمی ایک ہی غلطی کر سکتے ہیں، اور کرتے ہیں تحقیق سے لکھنے والے پرانے زمانے میں تو بہت کم تھے۔ مگر اب بھی زیادہ نہیں۔ ایک بار کوئی شخص کچھ لکھ دیتا ہے وہ کالنقش فی الحجر ہو جاتا ہے اور مٹائے نہیں مٹتا۔''

(قاضی عبدالودود)

مقدمہ

جس طرح آدمی کی معاشرت اور گذر بسر کے طور طریق، اس کے علاقے کے موسمی اور جغرافیائی حالات کے زیر اثر بدلتے رہتے ہیں اسی طرح اس کے فکر و خیال اور اعمال و افعال کے انداز میں بھی اس کی خورش، پوشش اور رہائش کی مناسبت سے تبدیلی آتی رہتی ہے۔ چھوٹی، نیچی اور تنگ جھگی جھونپڑی میں بسر کرنے والوں کے معاملات میں عموماً خیالوں کی پستی اور تنگ نظری کا وصف دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اونچے، کشادہ اور وسیع مکانوں کے خوش باش معمولاً، خوش نظری، خوش فکری اور خوش خیالی کے ساتھ ساتھ وسیع المشربی اور وسیع القلبی جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف ہوتے ہیں۔

کسی سرمست بادۂ ناب کے حال پر نظر کرو۔ اس کے جذبات نہایت برانگیختہ بلکہ مشتعل ہوں گے۔ وہ چیختا چلاتا ہوگا۔ پہاڑوں سے ٹکرا جانے اور آسمان کے تارے توڑ لانے کا دعویٰ کرتا ہوگا۔ اس کے کلام کا انداز یہ ہوگا کہ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اس کے برخلاف کسی افیونی کے معاملات کو دیکھو۔ وہ کہیں خاموش بیٹھا، اپنی کیفیت میں غرق ہوگا۔ چیخنے چلانے سے اسے سروکار نہ ہوگا۔ بات بھی کہے گا تو لہجے میں آہستگی ہوگی۔ ہر لفظ

ٹھہر ٹھہر کر زبانِ فیض ترجمان سے اس طرح ادا کرے گا گویا ایک کے بعد دوسرے کلمے کے نازل ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے سخن کی کیفیت وہ ہوگی کہ گویا ع

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں

اس صورت حال کا تقاضا تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نظم و نثر کی تاریخ لکھتے وقت ارباب قلم کی زندگی کے ہر ہر پہلو پر بخوبی نظر کی جائے، خصوصاً ان کے قیام و سکونت کے مقام کے حالات وغیرہ کا بغور جائزہ لینے کے بعد وہاں کی علمی، ادبی اور شعری تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے تاکہ صحیح صورتِ حال کا اندازہ اور علم حاصل ہو سکے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی طرف سے جب راقم سطور سے اُنیسویں صدی عیسوی (تیرھویں صدی ہجری) کی ادبیاتِ اردو کی تاریخ لکھنے کے لیے کہا گیا تو اسی طور پر اُس نے ایک مجمل سا خاکہ تیار کیا۔ پہلے اجلاس میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے بہ حیثیت صدر جلسہ فرمایا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ تاریخ دہلی اور لکھنؤ (یا زیادہ سے زیادہ حیدرآباد) کے روایتی دبستانوں تک محدود نہ ہو بلکہ اس میں چھوٹے بڑے، معروف اور غیر معروف مختلف مراکز کی علمی خدمات کا بھی بہ حدِّ مناسب مذکور ہو۔ اس اعلان سے دل کو جو خوشی حاصل ہوئی اس کا اندازہ کیا جانا کچھ مشکل نہیں۔ میرے تیار کردہ خاکے کی بھی موصوف نے بہت پذیرائی کی اور اس کی زیراکس کاپیاں بنوا کر تمام حاضرین میں تقسیم کیں۔ الحمدللہ

کچھ شک نہیں کہ تاریخ نویسی کا کام میری دلچسپی کا ہے اور بلاشبہ میں نے بڑے شوق سے اس کو شروع کیا ہے لیکن اس کی دشواریوں اور پیچیدگیوں کے بارے میں اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ: من دانم و دانندۂ من

خیال کرنے کی بات ہے کہ ایک شخص کی ساری عمر ایک مخصوص ڈھب اور متعین خطوط پر بسر نہیں ہوتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ع

ذوق کا دل ابھی ہنستا ہے ابھی روتا ہے

زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور حالات میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور ان سے آدمی کے فکر، خیال اور عمل کا طور کم و بیش متاثر بلکہ متبدل اور منقلب ہوتا رہتا ہے۔

زمانۂ گذشتہ کی کسی تخلیق کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ وہ کس قسم کے حالات اور کس کس نوع کے محرکات کے زیر اثر وجود میں آئی ہے کس حد تک دقت طلب ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے اس قسم کا کام کیا ہو۔

اس سلسلے میں ایک طمانیت بخش واقعہ یہ بھی ہے کہ پہلے اجلاس میں ہی یہ بات بھی سامنے آئی کہ قومی کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تاریخ نویسی کے اس کام میں جن کتابوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ قومی کونسل اپنے وسائل سے کام لے کر ان کی فراہمی کی بھی کوشش کرے گی۔

زبان اردو کا، خصوصاً ہندستانی اصل کی بولیوں میں ایک قابلِ ذکر امتیاز یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اس میں تاریخوں کو محفوظ کر لینے کا رجحان رہا ہے۔ اس زبان کی اولین دستیاب منظوم تصنیف مولانا داؤد کی چندائن میں بھی ہے۔

برس سات سے ہوئے اُناسی تہیا یہ کبی سُرُ سے بھاسی

اور اس وقت سے یہ روایت بدستور چلی آتی ہے۔

احمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں اردو میں تذکرہ نویسی کی ابتدا ہوئی تھی۔ شمالی ہند میں جو تذکرے لکھے گئے، ان میں قدیم ترین دستیاب تذکرہ فتح علی خاں گردیزی کا ہے جس کا سالِ تکمیل 1165ھ (1752) ہے[1]۔ اس تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ احمد شاہی دور تک دہلی اور مضافات میں اردو شاعری کی سب سے زیادہ مقبول و مروّج صنف "غزل" تھی۔ اس کے علاوہ تذکرۂ گردیزی میں مرثیہ، مثنوی اور ساقی نامہ وغیرہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ بادشاہ اور امرا کے لیے اس زمانے میں قصیدے بھی لکھے گئے تھے۔

کم و بیش اسی زمانے میں شیخ محمد قائم قائم چاند پوری نے بھی اپنا تذکرہ شروع کر دیا تھا۔ قائم کا کہنا ہے کہ اس کے تذکرے کے لیے خواجہ اکرام نے ایک قطعہ تاریخ نظم کیا تھا اور :

"از آنجا کہ مادّۂ تاریخ مناسب نام کتاب بود بناءً علیہ بہ ہماں اسم موسوم نمود۔"

---

[1] مشہور ہے کہ اردو شاعروں کا اوّلین تذکرہ محمد تقی میر کا تالیف کردہ نکات الشعرا ہے لیکن راقم سطور کے خیال میں یہ شہرت غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کے لیے کوئی قابلِ اعتنا ثبوت موجود نہیں ہے۔

اس سے پتہ چلا کہ محبت اور خلوص کے اظہار کے لیے بھی اُس قدیم زمانے کے شاعر تاریخیں کہتے تھے۔ قائم کے تذکرے سے بھی غزل کے مقبولِ خاص و عام ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شعرا اپنی ضرورت اور شوق سے دوسری اصنافِ شعری میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

قائم کے تذکرے میں تاریخ نویسی کی طرف میلان زیادہ نمایاں ہے۔ اس نے شاعروں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے، اس طرح:

طبقۂ اول - دربیان اشعار شعرائے متقدمین

طبقۂ دوم - درذکر کلام سخنوران متوسطین

طبقۂ سوم - دربیان اشعار واحوال سخن طرازانِ متاخرین

طبقات کی یہ تقسیم بہت مقبول ہوئی۔ اکبر شاہ ثانی کے بعد جب مولوی کریم الدین نے اپنا تذکرہ لکھا تو انھوں نے اپنے وقت تک کے شاعروں کے احوال پر مشتمل ایک طبقہ کا اضافہ کر دیا۔ پھر جب محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' تصنیف کی تو اس میں طبقات (ادوار) کی تعداد پانچ ہوگئی۔

جنوبی ہند میں اردو شاعروں کا سب سے قدیم دستیاب تذکرہ خواجہ خاں حمید کا ''گلشنِ گفتار'' ہے۔ حمید نے اس کی تاریخ اس مصرع سے نکالی ہے ع

کہا گلشن بزمِ گفتار ہے

1165

جن لوگوں نے شعرائے دکن کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے، ان کے علم میں یہ حقیقت ہے کہ اس اطراف میں اگرچہ غزل بھی کہی جارہی تھی، سب سے زیادہ مقبول مثنوی کی صنف تھی۔ خواجہ خاں حمید نے بھی اپنے تذکرے کی ابتدا میں ''تعریف تالیف'' میں فارسی اور اردو کے جو اشعار درج کیے ہیں وہ سب مثنوی ہی کے ہیں۔ شعرا کے تعارف میں بھی اس نے اس صنف پر نظر رکھی ہے چنانچہ نصرتی کی ''مدمالتی'' اور شاہ حاتم کی ''مثنوی حقہ'' وغیرہ کے اشعار نقل کیے ہیں۔

غالباً اپنے عقیدے کے مطابق حمید نے اس تذکرے کے شروع میں چند شعر

''منقبت ائمہ معصومین الطہرین علیہم السلام''

میں بھی لکھے ہیں اور یہ ذکر بھی کیا ہے کہ وہ ''گفتن مدح و مرثیہ حضرات ائمہ'' کو بہت بڑی سعادت

سمجھتا ہے۔ اسی لیے اس نے کامل تخلص کے ایک شاعر کا ذکر کیا ہے، جس کے بارے میں لکھا ہے :

''تمام عمر خود را در گفتن مدح و مرثیہ حضرات صَرف نمودہ، دیگر شعر اصلاً و مطلقاً گاہے قصداً و عمداً بر زبانش نہ رفتہ۔''

حمید کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ احمد شاہی دور میں دکن کے شاعروں میں سے بھی بعض ''اشعار قبیح'' اور ہجو لکھتے تھے۔ شاعروں کی معاصرانہ چشمک سے متعلق بھی کچھ شعر حمید نے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دکن میں خمسے کہنے کا بھی کچھ لوگوں کو شوق تھا۔ اکبر شاہ ثانی کے دور میں یہ شوق ترقی کر گیا تھا چنانچہ اس وقت دکن میں ایسے شاعر بھی موجود تھے جنھوں نے خمسے کا دیوان مرتب کر لیا تھا۔

اکبر شاہ ثانی اور ان کے پدر والا قدر یعنی شاہ عالم ثانی کے وقت میں شمالی ہند کے بعض ممتاز اور نام برآوردہ شاعر جنوب کے علاقے میں جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ ایسے شاعروں کی زیادہ تعداد حیدرآباد وغیرہ مرکزی مقاموں پر تھی۔ ان کے اثر سے وہاں بھی غزل کا رواج زیادہ ہو گیا تھا البتہ جن مراکز پر شمال کے شاعروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی، وہاں کی شاعری کی کیفیت بدستور رہی۔

کلکتہ کو شاہ عالم ثانی کے زمانے میں عملاً ہندوستان کے پایۂ تخت کا درجہ حاصل ہو گیا تھا وہاں کی تحریروں کو جنوب کے علاقوں میں بھی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور بعض لوگ ان کی روش پر نظم و نثر بھی لکھنے لگے تھے۔

اہل فرنگ کی ضرورت تھی کہ وہ اہل ہند کی معاشرت، بول چال اور ان کے طرز فکر و بیان وغیرہ سے متعلق اچھی واقفیت حاصل کر لیں۔ کلکتہ میں یہ کام فورٹ ولیم کالج میں بڑی خوبی سے کیا گیا تھا۔ پھر انھیں خطوط پر بمبئی، دکن اور مدراس وغیرہ میں بھی کاموں کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان مراکز پر اکبر شاہ ثانی کے عہد میں اردو کی قواعد اور لغت کی کتابیں مرتب کی گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ علم عروض کو ان مراکز پر زیادہ اہمیت دی گئی چنانچہ اس سے متعلق رسالے نثر ہی نہیں، نظم میں بھی لکھے گئے۔ کرناٹک اور مدراس کے علاقے میں اردو تحریر کے اصول اور ضوابط کو بھی قلمبند کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ گجرات میں بھی اس طرف توجہ کی گئی اور طالب علموں کو اردو اور انگریزی وغیرہ زبانوں کو سکھانے کے لیے بعض رسالے تالیف کیے گئے۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں اردو نثر نے بھی خاصا رواج پالیا تھا۔ نثر میں زیادہ کتابیں مذہب سے متعلق لکھی گئی تھیں لیکن دوسری نثری اصناف کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ قصے کہانی لکھے گئے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں کام آنے والی بھی کچھ کتابیں لکھی گئیں جو مصنف کے ذاتی تجربوں پر عموماً مبنی ہوتی تھیں۔

اکبر شاہ کے عہد کے دانشوروں کو ممالکِ غیر کے بسنے والوں کے حالات اور معاملات سے بھی بخوبی دلچسپی رہی ہے۔ بنگال ہی نہیں، گجرات وغیرہ کے علاقوں میں بھی سمندر کے راستوں سے مختلف اقوام کی آمد و رفت کے سلسلے جاری تھے۔ ان مراکز کے اہلِ قلم نے روم، شام اور فرنگ وغیرہ کے احوال اور واقعات قلمبند کیے تھے۔ اس قسم کی تحریروں کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس زمانے کے جدید ترین علوم سے بھی زبان اردو کا دامن بھرنے لگا تھا۔ اسی زمانے میں مختلف زبانوں کی تحریروں کو اردو میں منتقل کرنے کا رواج ہوا۔

اردو نثر کے سرمایے میں سفرناموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ عام طور سے یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامہ ''عجائبات فرنگ'' کو اردو کا پہلا سفرنامہ تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اب یہ بات سامنے آئی ہے کہ ارکاٹ کے علاقے میں اس سے بھی پہلے ایک منظوم سفرنامہ لکھا جا چکا تھا۔

ہندوستان کی سرزمین پر سولھویں صدی عیسوی کے وسط (دسویں صدی ہجری کے ربع ثالث) میں چھاپے خانے وجود میں آ گئے تھے اور سترھویں صدی میں جنوبی ہند کی زبانوں کی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا البتہ اردو خط (نستعلیق) میں اب تک کی معلومات کے مطابق جو پہلی کتاب چھاپی گئی تھی وہ ''انشاے ہرکرن'' تھی جس کا سالِ طباعت 1781 (1195ھ) ہے۔ چھاپے خانے کی صنعت بتدریج ترقی کرتی گئی اور اکبر شاہ ثانی کے آخری زمانے میں دہلی، کانپور، لکھنو وغیرہ کے علاوہ حیدرآباد (دکن) میں بھی چھاپے خانوں کا قیام عمل میں آیا اور اس طرح اردو کی دنیا میں زبردست انقلاب رونما ہوا۔

تاریخ ادب اردو کی اس جلد میں محمد اکبر شاہ ثانی، بادشاہ دہلی کے عہد میں برِّصغیر ہندوستان کے مختلف مراکز میں ادبیاتِ اردو کے ارتقائی کوائف کو بہ حدِ امکان صحت کے ساتھ قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہر مرکز دہلی اور لکھنو یا کلکتہ اور

حیدرآباد کی برابری نہیں کرسکتا ہے لیکن چھوٹا اور کم حیثیت ہونے کے باوجود زبان وادب کے ارتقا میں اس کا ایک کردار ہے اس لیے اس کا یہ حق بھی ہے کہ تاریخ میں اس کا ذکر کیا جائے، جنوب کے کئی مقاموں کا احوال لکھے جانے کا سبب یہی ہے۔

آخر میں بیرونِ ملک میں زبان اردو سے دلچسپی لیے جانے کا مذکور بھی ضروری معلوم ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر شاہ کے زمانے میں ہی یہ زبان بتدریج بین الاقوامی سطح پر پھیلنے لگی تھی۔ اسی صورتِ حال کا فائدہ ہوا تھا کہ کچھ ہی مدت کے بعد دنیا کی کئی ترقی یافتہ زبانوں سے ہماری اردو کسبِ فیض کرنے لگی تھی۔

اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کے زمانے میں ملک ہندوستان کی حدود میں اور بیرون ملک میں بھی زبان اردو کے چھوٹے بڑے توجہ طلب اور لائق اعتنا مراکز کی تعداد چار درجن سے زیادہ ہوگئی تھی۔ ہر مرکز پر نثر اور نظم کی معروف اور کسی قدر غیر معروف اصناف کے بھی نمائندہ اور قابل ذکر نمونوں کے اختصار کے ساتھ تعارف کے لیے بھی ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات درکار تھے۔ ناچار اکبر شاہ کے عہد کے تواریخی اور جغرافیائی حقائق کو پیش نظر رکھ کر زبان وادب کے اس سرمایہ کو تین جلدوں میں تقسیم کردیا، اس طرح

جلد 9

ہریانہ، پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، دہلی، آگرہ، گوالیار، راجستھان (اجمیر، الور، بھرت پور، ٹونک، جودھ پور، جے پور)، بندیل کھنڈ (کالپی، باندہ) اور بنارس

اس زمانے میں کاشی کے راجا کو سرکار انگریزی کے حکم کی تعمیل میں بنارس کو چھوڑ کر کچھ مدت تک گوالیار میں اور زیادہ عرصہ تک آگرہ میں مقیم رہنا پڑا تھا اور خود بنارس میں علم وادب کی محفلیں خاموش ہوگئی تھیں۔ ان حالات کا تقاضا یہ ہوا کہ بنارس اگرچہ بہت پورب میں واقع ہے، اس کا ذکر اسی جلد میں کیا جائے۔

کانپور کو اس زمانے میں ملک نصارا کہا جانے لگا تھا اور لکھنؤ کی ریاست عملاً کانپور کے ماتحت ہوگئی تھی اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ان دونوں بڑے مراکز کا حال بعد کی جلدوں میں شامل کیا جائے۔

جلد10

روہیل کھنڈ (بریلی، مرادآباد، بدایوں، رامپور، شاہجہانپور، فرخ آباد) اور لکھنؤ

جلد11

فیض آباد، کانپور، الہ آباد، خطۂ بہار، بنگال اور مضافات (مرشد آباد، کلکتہ، ہوگلی، ڈھاکہ، سلہٹ) صوبہ متوسط (برار، برہان پور، بھوپال، جبل پور، ناگپور) گجرات (احمد آباد، بڑودہ، بھڑوچ، چمپین، سورت، کھمبایت)، بمبئی، دکن (حیدرآباد، اورنگ آباد، کرنول) کرناٹک اور متعلقات میسور، کرناٹک اور مدراس

ضمیمہ

بیرون ملک ایران، افغانستان، نیپال، برما، لنکا، فرنگ

اس تاریخ میں کوئی واقعہ بھی ''من گڑھت'' نہیں ہے۔ ہر واقعہ کے لیے بہ حد وسائل اوّلین ماخذ سے رجوع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مشہور روایتوں اور مفروضوں پر بھی اعتماد نہیں کیا گیا ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اردو اپنی اصل کے اعتبار سے ہندستانی زبان ہے چنانچہ ہندستانی نظم ونثر کی سبھی اصناف اردو میں رائج رہی ہیں۔ یہی نہیں، ٹھیٹھ ہندستانی اصناف کے جو نمونے اردو میں محفوظ ہیں، وہ دوسری بولیوں کی نظم ونثر کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ، معتبر اور مستند ہیں۔

میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور اپنے مخلص وکرم گستر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا ممنون ہوں کہ ان حضرات نے مجھے یہ کام کرنے کا موقع دیا۔ خدا کرے کہ اس سے متوقع فوائد حاصل ہوسکیں۔ اس مقام پر عزیزی ڈاکٹر سجاد اختر کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ ان کی تگ ودو اور مشقتوں کی بدولت یہ کتاب بروقت شائع ہوسکی۔ فقط

محمد انصار اللہ

فہرست

		صفحہ
1-	صوبہ جات مغربی:	
	(الف) ہریانہ	1
	(ب) پنجاب	9
	(ج) کشمیر	23
	(د) صوبہ سرحد	25
	حواشی	29
2-	دہلی	31
	حواشی	279
3-	آگرہ، گوالیار	289
	حواشی	358

4-	راجستھان	363
	(الف)اجمیر	367
	(ب)الور	373
	(ج)بھرت پور	375
	(د)ٹونک	381
	(ہ)جودھپور	389
	(و)جے پور	391
	حواشی	398
5-	بندیل کھنڈ	401
	(الف)کالپی	405
	(ب)باندہ	413
	حواشی	447
6-	بنارس	449
	حواشی	484
7-	ماخذ	487

أ-صوبہ جات مغربی

(الف) ہریانہ

حافظ محمود خاں شیرانی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہریانہ کے علاقے کی تالیفات کا پہلی مرتبہ تفصیل سے تعارف کرا کر اس علاقے کی علمی اور لسانی اہمیت کی طرف اہلِ تحقیق کو متوجہ کیا تھا۔ ''ہریانہ'' کی وجوہِ تسمیہ کے بیان میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''کہا جاتا ہے کہ ایک نامعلوم زمانے میں اودھ کے ایک راجا ہری چندر نے آ کر اس علاقے کو بسایا تھا اس لیے راجا کے نام پر یہ ملک ہریانہ کہلانے لگا۔''1

اس خطے کی بعض قدیم تصانیف سے بھی اس روایت کی تائید ہوتی ہے لیکن یہاں ان سے متعلق تفصیلات کے بیان کا موقع نہیں ہے۔ اس علاقے کی علمی اور معاشرتی اہمیت سے متعلق شیرانی کا خیال یہ ہے کہ:

''شمالی ہندوستان میں خوش قسمتی سے ہریانہ ہی وہ مقام ہے جہاں مقامی زبان میں ادبیات کی اشاعت کی تحریک سب سے پہلے شروع ہوتی ہے..... ہم ان اسباب سے جو اس تحریک کو بروئے کار لاتے ہیں قطعاً بے خبر ہیں لیکن ان کے آثار سے آگاہ ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ یہ تحریک مختلف شعبوں میں کام کر رہی ہے۔''2

اس میں شبہ نہیں کہ حافظ محمود خاں شیرانی نے ملک کے مختلف خطوں کی ادبی اور علمی فتوحات کا بہت

محنت سے مطالعہ کیا تھا اس لیے ان کی آرا سے سرسری گذر جانا بے جا ہے لیکن ان کا زمانہ وہ تھا جب تحقیقات کا سلسلہ ابتدائی مدارج میں تھا چنانچہ ان کے وقت میں قطعیت کے ساتھ حکم لگانا ممکن نہیں تھا۔ اب چونکہ اطراف ملک کے مختلف مراکز کی علمی اور شعری کارکردگی کا مجمل تعارف سامنے آچکا ہے صحیح صورت حال کا بہتر طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کچھ شبہ نہیں کہ شیرانی نے محمد شاہ بادشاہ سے شاہ عالم ثانی کے وقت تک کی ایک ایک دو دو تالیفات کا بڑی خوبی سے تعارف کرایا ہے لیکن محض ان چند کی موجودگی اس باب میں ہریانہ کی اوّلیت کے تسلیم کیے جانے کے لیے کافی نہیں ہے۔

مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہریانہ کے علاقے میں اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں قابلِ ذکر شاعروں کی تعداد خاصی تھی۔ اس علاقے میں ایسے شاعر بھی کئی تھے، جن کا ذکر صابر نے اپنے تذکرے میں نہیں کیا ہے۔ یہاں صرف بعض کا مجملاً تعارف کرایا جاتا ہے۔

1۔ محمد رمضان

چند سال پیشتر پروفیسر منظور الحق صدیقی نے شاہ محمد رمضان کے تعارف میں ''ہادیِ ہریانہ'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس میں مذکور ہے کہ:

> ''شاہ محمد رمضان سے پہلے بھی ہریانی زبان میں کتابیں لکھی جاتی رہیں اور بعد میں بھی، مگر یہ حقیقت ہے کہ آپ اس زبان کے سب سے کثیر التصانیف ہی نہیں، ممتاز ترین مصنف ہیں۔''[3]

شاہ محمد رمضان نے اپنی تصنیف ''آخر گت'' میں بتایا ہے کہ ان کا نام تاریخی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ 1183ھ (=1769) میں پیدا ہوئے تھے۔

محمد اور رمضان دونوں ملیں ہزار اور یک صد تراسی بنیں

92 + 1091 = 1183ھ

ان کا شجرہ اس طرح ہے:

محمد رمضان ولد عبدالعظیم ولد عبدالحکیم ولد عطا محمد خاں فدوی

بادشاہ غازی محمد شاہ ولد سیف اللہ ولد سلیمان بن کمال

شاہ محمد رمضان نے دہلی میں رہ کر شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے تعلیم پائی تھی۔ دو حج کیے اور

جمادی الاول 1240ھ (جنوری 1825) میں شہید ہوئے۔ میاں جی ظہور علی ظہور نے قطعہ تاریخ کہا۔

جناب شاہ رمضان قطب آفاق　　سراپا معرفت عرفاں مآبے
معزز شد بہ تشریفِ شہادت　　بہ جنت رفت آں عالی جنابے
ظہور از بہر تاریخ شہادت　　خرد گفتا　　خسوف آفتابے

1240ھ

شاہ محمد رمضان کی تصانیف درج ذیل بتائی گئی ہیں:

1۔عقائد عظیم	نثر در علم عقائد	مطبوعہ	مطبع فخر المطابع
2۔آخر گت	نظم	مطبوعہ	مطبع میرزائی شاہجہاں آباد 1264ھ
3۔بلبل باغ نبیؐ	نظم، سیرت رسولؐ	مطبوعہ	مطبع مفید عام آگرہ 1325ھ
4۔رنگیلی	نثر	مطبوعہ	
5۔قصیدہ امالی	اسی نام کے عربی قصیدہ کا ہریانی میں ترجمہ و شرح		
6۔وصیت نامہ	نظم	مطبوعہ	دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔1914
7۔ادب چھوکرہ	نظم، ہریانی۔بچوں کے لیے		آٹھ صفحے کا رسالہ، مطبوعہ
8۔ایک بوڑھی بیاض			
9۔فتاوائے محمدی	نظم، ہریانی میں		
10۔رسالہ رمضانی	علم فرائض پر نثر		
11۔رسالہ برق لامع	نثر		
12۔رسالہ ردِ روافض	نثر فارسی		
13۔فتاوائے اردو			

یہاں پہلی کتاب عقائد عظیم کا ایک اقتباس نمونہ کے طور پر نقل کیا جاتا ہے:

"عقیدہ مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے، اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر دو ہوتے تو دو قدرت والے ہوتے یا ایک عاجز ہوتا، تو دوسرا عاجز نہ ہوتا، وہ

خدائی کے لائق نہ ہوتا اور دو خدائی کے لائق تو نہیں ہو سکتے مثلاً ایک شخص کو ایک کہتا کہ مرجا اور دوسرا کہتا کہ جیتا رہ۔ اگر دونوں کا کہنا نہ ہوتا، دونوں خدائی کے لائق نہ ہوتے اور جو ایک کا کہنا ہوتا تو دوسرا عاجز ہوتا۔ خدائی کے لائق نہ ہوتا۔ اور جو دونوں قدرت والے ہوتے تو ایک وقت میں اس کا مرنا بھی ہو سکتا اور جینا بھی اور حالانکہ یہ نہیں ہو سکتا۔"[4]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمد رمضان کی نثر صاف، سلیس اور سریع الفہم ہوتی تھی۔ کہیں کہیں جملوں کی ساخت اور بعض لفظوں کی قدامت اپنے زمانے کی کیفیت اور روزمرہ کی صورت دکھا جاتی ہے۔

شاہ محمد رمضان کو تاریخیں کہنے کا شوق معلوم ہوتا ہے چنانچہ اپنی کتاب آخر گت میں کہتے ہیں۔

آخر گت میں تاریخ ہے اس کتاب ہے پھر آخرت نامہ نام کتاب

1221ھ

اسی طرح جلیلی باغ نبی میں بھی کہا ہے۔

سن ہوے چھبیس بارہ سے اوپر ہجرت احمد نبی کی سن خبر
12 26م
اتنے جب گذرے، ہوئی تھی یہ کتاب ختم تب واللہ اعلم بالصواب
ماہ رجب تیرویں دن اتوار جب ہوئی فضل خدا سیں یہ طیار

شاہ محمد رمضان نے بعض نظمیں اپنے علاقے کی بول چال کی زبان (ہریانی) میں بھی بڑی روانی کے ساتھ کہی ہیں چنانچہ چوتھی کتاب "رنگیلی" کے چند شعر یہ ہیں۔

چوتھی یہی ہے بات نیاری روٹی کا رن خلق بگاڑی
فرق حلال حرام نہ جانے منع کرے تو لیوے بہانے
طلب علم و تقوا سے رہے مولوی صاحب اس کوں کہے
دھرتی اوپر کوئی نہ ہیا جس کا رزق نہ پیدا کیا

روٹی کارن احمدی پتیم کو مت تیاگ
سر کے سانٹھے اب ملیں تو بھی دھن دھن بھاگ

یہ افسوس کی بات ہے کہ شاہ رمضان کے اس قسم کے کلام کو پاکستان کے صاحبانِ قلم بھی ''ہندی'' کہنے لگے ہیں۔ پروفیسر منظور الحق صدیقی نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

''گذشتہ ڈیڑھ دو صدی میں ہریانی زبان اس قدر تبدیل ہوگئی ہے کہ اب ہریانی زبان بولنے والے پاکستانی بھی آپ (محمد رمضان) کی تصانیف کے حصہ نظم کو کما حقہ، نہیں سمجھ سکتے البتہ علاقہ ہریانہ میں اب دیوناگری رسم الخط اختیار کیا جاچکا ہے۔ ایسے حالات میں آپ کے کلام کی دیوناگری رسم الخط میں اشاعت اسے پھر سے مفید بنادیتی ہے۔''5

جاننا چاہیے کہ کسی زبان کی شناخت رسم خط سے نہیں کی جاتی ہے۔ اس لیے اگر کسی شاعر کا کلام دیوناگری خط میں شائع کر دیا جائے تو وہ ہندی نہیں ہو جائے گا۔ زبان کی شناخت اس میں آئے ہوئے اسما سے بھی نہیں ہوتی ہے چنانچہ شاہ رمضان کے کلام میں اگر ہندستانی اصل کے یا قدیم اور متروک اسما آگئے ہیں تو محض ان کی موجودگی اس کلام کو اردو کے دائرے سے خارج کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ شاہ محمد رمضان کا سارا کلام اپنی قواعد اور اپنے کینڈے کے اعتبار سے اردو (ہریانی) ہے کوئی شخص یا جماعت اگر اس کو سمجھنے سے قاصر ہے تو یہ اس کا اپنا عیب یا نقص ہے۔ کلام کی زبان جو کل تھی، آج بھی وہی ہے۔

2۔ ظہور

علاقہ ہریانہ کے رہنے والے معروف شاعروں میں یہ ظہور بھی تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

''ظہور تخلص.... مولوی ظہور علی، وطن اصلی اس مظہر آثار اخلاق کا ہریانہ اور اب مدت سے مسکن وماوا خاک شاہجہاں آباد ہے۔ اس کے جدّ امجد بخارا سے آکر چندے نصبہ روہتک میں، پھر جھجھر میں ساکن ہوئے۔ پھر قصبہ دادری میں توطن اختیار کیا..... فن سخن کو حافظ عبدالرحمان خاں احسان اور شاہ نصیر اور مومن مرحوم سے کسب کیا ہے۔ تاریخ گوئی کی طرف توجہ تام اور مادہ ہائے غریب کو استخراج کی جانب التفات تمام ہے.....''6

اپنے علاقے میں تاریخیں کہنے کے لیے ظہور معروف تھے۔ انھوں نے شاہ محمد رمضان کی شہادت کے لیے دو قطعے لکھے تھے۔ ایک نقل کیا جا چکا ہے۔ دوسرا یہ ہے۔

در خلد رفت چوں شاہ رمضاں اے شیخ شہید گفت رضواں

1240ھ

ظہور اپنے زمانے کے اچھے غزل گویوں میں بھی شمار ہوتے تھے۔ یہاں ان کے کچھ شعر نمونہ کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔

گردش ہے مجھے چشم کی مانند ہمیشہ آوارہ میں گھر میں ہوں، مسافر ہوں وطن میں

خط کے آنے پہ کہاں وہ رخ گلگوں کی بہار باغ سبز اب نہ دکھا اے گلِ خنداں ہم کو

سامنے اس کے نکلنے کی نہیں بات ظہور گھر میں تم بیٹھ کے باتیں ہی بنا جانتے ہو

اے اشک مرے دیدۂ نمناک سے باہر جاتا ہے کہاں تو تو مرا لختِ جگر ہے

ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ نے ظہور کو "اولاد میں محمد بن ابوبکر کی" بتایا ہے۔7

3۔ امین

معلوم ہوتا ہے کہ ظہور کے ہم عصروں میں چند شاعر اور بھی تھے جن کو تاریخیں کہنے سے دلچسپی تھی۔ ان میں سے ایک کا نام اس طرح آیا ہے:

"قاضی امین الرحمٰن امین صدیقی بھی ثم لاہوری"8

اس سے ظاہر ہے کہ یہ صاحب مہم سے لاہور میں جا کر رہنے لگے تھے۔ انھوں نے بھی شاہ محمد رمضان مہمی کی شہادت کی تاریخ کہی تھی، اس طرح

ولی و سالک و عالم محمد رمضاں کہ بود مثلِ صحابہ معینِ دین متین

چو کرد عزم جناں از برائے سالِ وصال برفت ہادیِ منزل شناس گفت امین

140ھ

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امین اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

4۔ فضل

یہ بھی مہم کے قاضی زادوں میں سے تھے۔ شاعر کی حیثیت سے انھیں اُس علاقے میں شہرت حاصل تھی چنانچہ مرزا قادر بخش صابر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"فضل تخلص، فضل الرحمان ولد شیخ حامد علی ابن قاضی احمد مرحوم، ساکن قصبہ مہم، ضلع روہتک صوبہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد۔ بزرگ اس کے یمن کے وارد ہند ہو کر قصبہ مذکور میں متوطن ہوئے۔ فن شعر میں اول اپنے برادر زادہ محمد رفیع الدین نام سے استفادہ کرتا تھا۔ اب محمد حیات خاں حیات تخلص سے مشورہ کرتا ہے۔ یہ شعر اس کا مسموع ہوا۔ 9

حاجتِ دام نہیں عاشق بیدل کے لیے گیسوِ یار ہی کافی ہے سلاسل کے لیے

یہ خود بھی اچھے شاعر تھے اور ان کے گھرانے میں اور بھی بعض لوگ شعر کہتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے بھائی کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔

5۔ متین

معلوم ہوتا ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں روہتک کو اس علاقے میں اہمیت حاصل تھی اور دور دور سے بعض لوگ وہاں تلاش معاش میں جاتے تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے ایسے ایک ہندو شاعر کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

"متین تخلص، رائے کانجی سہائے متوطن قدیم شہر لطافت نہاد الہ آباد..... یہ والا جاہ بالفعل سدِ صدر الامنی رہتک پر متمکن ہے۔ فنِ سخن سے از بسکہ مناسبت ذاتی اور ذوق طبیعی ہے، گاہ گاہ اوقاتِ فرصت میں شعر فارسی کا فکر دامنگیر ہوتا ہے، ہر چند اس فن میں کسی سے مشورے کا اتفاق نہیں ہوا۔" 10

بظاہر یہ شخص فارسی گو تھا اور زبانِ اردو میں شعر نہیں کہتا تھا چنانچہ صابر نے اس کے جتنے شعر اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں سب فارسی میں ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہوئی ہے کہ اردو شاعروں کے سبھی معاصر تذکرے اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

ہریانہ کے علاقے میں قصبہ قصبہ میں اکبر شاہ کے زمانے میں اردو شاعر موجود تھے۔ یہاں صرف چند کے نام لکھے جاتے ہیں:

(الف) جھجھر (1) جعفری، شیخ جعفر علی قاضی زادہ، متوطن دادری، ملازم نواب عبدالرحمٰن خاں بہادر والیِ جھجھر

(2) غالب، انور علی، ملازم نواب فیض محمد خاں بہادر والیِ جھجھر

(3) مشتاق کریم خاں، رفیق نواب حسن علی خاں برادر فیض محمد خاں

(ب) کرنال (1) ثواب، سعادت علی خلف میر شہاب الدین

(2) صفدر تخلص، صفدر بیگ ولد حیدر بیگ

(ج) نارنول (1) ثروت، میر محمد شاہد، ملازم سابق والیِ جھجھر

(2) صبور تخلص، شیخ معین الدین ابن شیخ محب اللہ

ہریانہ کا علاقہ پایۂ تخت دہلی سے متصل تھا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ اس علاقے میں علم و شعر کا معیار کچھ بلند نہیں ہو سکا۔ یہاں کے شاعر عموماً غزلیں کہتے تھے۔ ممکن ہے کہ بعض نے قصیدے بھی لکھے ہوں لیکن وہ قابلِ ذکر نہیں تھے۔

(ب) پنجاب

غزنوی، غوری اور التمش وغیرہ کے سکّوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان بادشاہوں کو ہندوستان کی زبانوں سے دلچسپی تھی۔ ان کے درباریوں میں بعض امرا ہندو بھی تھے اور ان کی مدد سے جو لوگ شائق ہوتے تھے وہ یہاں کی زبانوں کو سیکھ لیتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اہل پنجاب کو شروع سے زبانِ اردو سے بھی دلچسپی رہی ہے اور وہ زمانۂ قدیم سے نظم و نثر میں علمی کارنامے انجام دیتے رہے تھے لیکن محمد شاہ بادشاہ کی وفات کے بعد جب سلطنت پر ادبار آیا اور خود اہلِ دہلی حالات سے لاچار ہو گئے تو پنجاب کے باکمالوں کو بھی گھر سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا البتہ مہاراجا رنجیت سنگھ کے وقت میں ہوا کا رخ بدلا تو وقتی طور پر پٹیالہ کی رونق دوبالا ہو گئی اور بعض بعض صاحبانِ علم و فن اس شہر میں آ کر مقیم ہو گئے۔ وہ زمانہ تھا جب لکھنو میں ناسخ و آتش اور دہلی میں شاہ نصیر اور شیخ ذوق کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اہل پنجاب بھی کم و بیش انھیں کے زیرِ اثر تھے چنانچہ وہاں بھی زیادہ تر چرچا غزل ہی کا تھا۔

1۔ برکت

سید برکت علی خاں، نام، برکت تخلص، خیرآباد کے رہنے والے، خندہ رو، کشادہ پیشانی، سلیم الطبع، با اخلاق شخص تھے۔ علوم متعارفہ میں بہرۂ وافی رکھتے تھے اور اہل علم کی عزت کرتے تھے۔[1]

جنرل اختر لونی کی سرکار میں منشی گری اور مختاری کی وجہ سے مرجع اکابر دہلی تھے 2۔ پھر بقول شیفتہ

"یک چند بہ مختاری راجا پٹیالہ بہ وقعے ولخواہ ملک نشیں ماندہ "3

برکت علی خاں کو اردو شاعری کا بہت شوق تھا۔ اپنے گھر پر مشاعرہ کرتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ ان کے اشعار میں برجستگی بھی ہوتی تھی۔ ان کے کچھ شعر یہ ہیں ۔

شریک جلسے کے جب آ کے تم ہمارے ہوئے — جو مدعی تھے ہمارے، وہ سب تمھارے ہوئے

لپٹ کے روے، یہ بولے کہ دیکھیو ہاں جی — نہ تم ہمارے ہوے اور نہ ہم تمھارے ہوئے

ہمارے آتے ہی مجلس میں اہل محفل سے — خدا ہی جانے کہ آنکھوں میں کیا اشارے ہوئے

برکت قطعے بھی خوب کہتے تھے۔ ان کا قطعہ ایک یہ ہے۔ قطعہ

تھی کل شب وصال پس از عمر ہمنشیں — تو سرگذشت پوچھ نہ کیا ماجرا کہیں

بُرساں تھے وہ تو حال جدائی کا اور ہم — اس سوچ میں تھے کیا نہ کہیں اور کیا کہیں

مولوی کریم الدین نے لکھا ہے کہ برکت 1244ھ (=1828-29) میں فوت ہوا۔4

2۔ خموش

مرزا قادر بخش صابر نے ان کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

"خموش تخلص، گویائے خوش گفتار مرزا خدا یار، متوطن قدیم شاہجہاں آباد۔ مدت سے زمین پنجاب اس کی سکونت سے انتخاب رشک مسکوں ہے۔ مرد عزیز الوجود اور مظہر آثار سخاوجود ہے۔ اوائل میں قدردانی راجا رنجیت سنگھ سے بہت سرمایہ بہم پہنچایا لیکن کثرت ایثار سے جب دیکھا گیا، جامدانی میں ایک دو جامہ پوشاک کے سوا کبھی ذخیرہ نہ ہوا تھا۔ اب بھی اس نواح میں غالباً حکام وقت کی طرف سے عہدۂ تحصیلداری پر مامور اور حرف اس کے جود و کرم کا زبان خلائق پر مذکور ہے۔ مصداق اس شعر کا گویا وہی بزرگ منش ہے۔5

نمی باشد نشانے غیر درویشی کریماں را — کہ افشاندن تہی می سازد آخر دستِ دہقاں را"

ان کے کلام کا انداز یہ ہے۔

کیا ترا احوال ہے ہم سے بھی تو کچھ کہہ خموش — آشناؤں سے نہیں اچھا چھپانا راز کا

دیکھ آیا تھا خموشِ خستہ جاں کو میں وہاں دل کو دھڑکا ہے کہ کہتے ہیں کوئی مارا گیا

عالمگیر ثانی کے مقتول ہونے کے بعد شاہی کی ساکھ اکھڑ گئی تھی۔ پھر غلام قادر روہیلہ کے ہنگامے کے بعد تو رہا سہا رعب داب بھی جاتا رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگ بادشاہی ملازمت کو چھوڑ کر پنجاب کے علاقے میں جا رہے تھے۔ وہ زمانہ تھا جب شاہ نصیر کی استادی کا گویا ڈنکا بجتا تھا۔ ان کے شاگردوں کا بھی لوگ احترام کرتے تھے۔ وہ جہاں جاتے تھے قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

3۔غم

مرزا قادر بخش صابر نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''غم تخلص مہتاب سنگھ، قوم کائتھ، شاگرد شاہ نصیر مرحوم۔ اول سرکار بادشاہی میں سلکِ متصدیاں علاقہ بخشی گری میں نوکر تھا۔ پھر ترکِ روزگار کر کے لاہور میں جا کر امرائے سرکار راجا رنجیت سنگھ میں سے کسی امیر کی رفاقت میں رہا اور وہیں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔''6

ان کے دو شعر یہ ہیں ؎

طاقت اٹھنے کی نہیں ہے، ورنہ میں بھی اے صبا ساتھ تیرے اک چمن کیا، دشت و در کو روندتا

صیاد بے خبر ہی رہا اور قفس سے ہائے
ٹکرا کے سر کو بلبلِ ناشاد گئی

4۔شہیدی

اپنے زمانے کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ محسن نے ان کو باشندۂ لکھنو مقیم بریلی اور شاگردِ مصحفی و میاں نصیر دہلوی لکھا ہے7۔ شیفتہ نے ان کے تعارف میں تحریر کیا ہے:

''شہیدی تخلص، کرامت علی نام، باشندۂ لکھنو۔ طبع خوشے دارد و در عروض دستگاہے معقول و در حساب مکنتے مقبول۔ در بلادِ پنجاب و گجرات بیشتر بسر بردہ گاہ گاہ بہ دہلی وارد شدہ۔ ہنگامِ ورود دہلی بارہا راقم آثم را بار خود دادہ۔ مردِ بے تکلف و وارستہ مزاج و وسیع المشرب است۔ آزادانہ زید''8

میاں شہیدی کے [illegible] کا نمونہ یہ ہے ؎

شہیدی میں تو [illegible] لے کے بوسہ سنگِ اسود کا کیا خوشنود اُس بت نے خدا کو ایک بوسے میں

دل کے جانے کا شہیدی حادثہ ایسا نہیں کچھ نہ روئے اگر ہم عمر بھر رویا کیے

5۔ولی

یہ بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ان کے حالات اس طرح منقول ہیں۔

"ولی تخلص شیخ ولی محمد خلف شیخ منگلو، وطن اصلی اس کا سیالکوٹ اور مولد اس کا شاہجہاں آباد۔ والد ماجد اس کا نواب نجابت علی خاں مرحوم والیِ جھجھر کی سرکار میں عہدۂ کرنیلی سے سرفراز اور اقران و امثال سے ممتاز تھا اور یہ بزرگ منش عہدِ طفولیت سے اب تک نواب بہادر جنگ خاں بہادر والیِ بہادر گڑھ کی سرکار میں اعتبار و جاہ سے بسر کرتا ہے۔ کبھی عہدۂ کوتوالی اور کبھی ندیمی اور مصاحب سے سربلند ہو کر اخوانِ روزگار کیا بلکہ آقائے قدرشناس کی نظر میں عزت و وقار رکھتا ہے۔عمر پینتالیس چالیس برس کی ہے اور فکرِ سخن ہنوز جوان ہے۔سخن کی مشق شاہ نصیر مرحوم سے کی اور بہ سبب کم فرصتی کے ترتیبِ دیوان ہنوز صورت پذیر نہیں ہوئی۔"[9]

ان کے دو شعر یہ ہیں ۔

کیونکہ بتلاؤں نشاں تجھ کو ستمگر اپنا عالم خانہ بدوشی میں کہاں گھر اپنا

رتبہ تھا کیا قمر کا جو کرتا وہ ہمسری جب آفتاب رخ کے برابر نہ ہو سکا

کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سامنے کی باتوں بلکہ واقعات کو شعر کے قالب میں ڈھالتے تھے۔باوجود اس کے کلام میں پختگی پائی جاتی ہے۔

6۔نکہت

یہ بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔نوکری کی خاطر لاہور گئے۔وہاں ان پر جو گذری اس کا مرزا قادر بخش صابر نے ذکر کیا ہے،اس طرح:

"نکہت تخلص مرزا ایاز علی بیگ، خاندانِ شرافت اور دودمانِ نجابت سے تھا۔مزاج میں مزاح اور عین حالت انقباض میں انشراح۔فنِ سخن کو شاہ نصیر مرحوم سے کسب کیا تھا۔ سکندر نامہ زبانِ اردو میں نظم کیا اور اس میدان میں اپنی حد سے قدم باہر رکھا ہے جو کہ

فراخ رو اور کشادہ دست تھا، ذخیرۂ سابق نے کفایت نہ کی، ہر چند پاؤں ضرب شدید پہنچنے سے ایسا بے کار ہو گیا تھا کہ راہ نوکری اور عرصۂ چاکری میں لائق دوانہ رہا تھا، اس نسخے کو وسیلۂ قدر شناسی سمجھ کر لنگ لنگاں سفرِ لاہور اختیار کیا۔ اس وقت وہ زمانہ تھا کہ راجا شیر سنگھ پسر راجا رنجیت سنگھ حکومت موروثی پر متمکن تھا۔ ایک قصیدہ اس کی مدح میں گزرانا۔ اتفاق تقدیر اس کو پسند آیا اور اس متوقع کرم کو قدر دانی کا امیدوار کیا کہ غالباً اور متوقع معاش کے واسطے مشاہرے کے نام سے مقرر نہ ہوتا اور رفتہ رفتہ اس کے دل میں ایسی جگہ ہو گئی کہ ہنگامۂ سیر و شکار بھی اس کی رفاقت سے خالی نہ تھا۔ یہ سمجھے کہ شاید آسمان اب راہِ صلح میں گامزن ہے۔ ایک روز وعدۂ واثق درمیان آیا کہ کل فلانے باغ میں دربار کے وقت مرزا صلۂ نمایاں سے کامیاب کیا جاوے اور دوسرے دن واقعی وہی باغ اس کی ہوائے اقبال سے شگفتہ ہوا۔ اس طرف بہانہ جوئی کرم قصیدہ خوانی کی منتظر اور اس طرف جنبشِ لب اجازت سخن کی متوقع۔ ناگاہ ایک طلغائے عظیم پیدا ہوا اور ایک شورِ محشر نما برپا۔ آنکھ اٹھا کر کیا دیکھا کہ مسندِ ریاست خونِ داورِ وقت سے ایسی سرخ تھی.....راہیں مسدود ہو گئیں اور دروازہ بند اور قاتل کی تلاش ہونے لگی۔ نگہت بوئے گل کی مانند بیخود ہو گئے اور ان کو باوجود شکستہ پائی کے یہ مضمون سوجھا کہ جس طرح سے ہو اس مجلس سے نکلنا چاہیے۔ ممالک پنجاب میں وہ صبا کے دوش پر سوار ہو کر راہی ہوئے۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہوا اور نونہال سنگھ مسند پدر پر جائے گیر ہوا یہ برگشتہ بخت سر پر پاؤں رکھ کر شاہجہاں آباد کی طرف راہی ہوا اور تادمِ مرگ خانہ نشینی میں بسر کی۔ اس عرصے میں ایک فرہنگ مصطلحاتِ زبانِ اردو میں پچاس ساٹھ جزو کے قریب مرتب کی۔ عرصہ کئی سال کا ہوا کہ گلشنِ جناں میں خرامِ ناز میں مصروف ہے۔"10

ڈاکٹر رحمت علی خاں (حیدر آباد) نے اگرچہ کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، ان کے حالات میں مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں:

"مرزا نیاز علی بیگ ولد مرزا بندہ علی بیگ کا تعلق ترکی سے ہے۔ تخلص ان کا تخلص تھا اور یہ تقریباً 1212ھ (=1797-98) میں بہ مقام دہلی پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم گھر ہی

پر پائی تھی۔ عربی، فارسی، اور اردو کے ماہر تھے۔ شاعری میں شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی کے دربار سے متوسل تھے۔ بادشاہ کے حکم سے سکندر نامۂ نظامی گنجوی کا اردو ترجمہ بھی شروع کیا مگر اس کا کیا ہوا کچھ پتہ نہیں۔ قصائد البتہ اس کے دیوان میں کافی مل جاتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر نے مگر آپ کی خاطر خواہ قدر نہیں کی۔ پھر رامپور کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد مہاراجہ شیر سنگھ والیِ پنجاب کی خدمت میں رہے۔ آخری دفعہ ریاست کپورتھلہ گئے لیکن واپسی میں 1267ھ (=1851) میں بہ مقام انبالہ فوت ہو گئے۔"11

کہتے ہیں نہایت بلند قامت اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ بہترین مقرر بھی تھے۔ آپ کے ایک لڑکے کا تذکروں سے پتہ چلتا ہے۔

نکہت کے دیوان میں زیادہ تر قصائد ہیں۔ غزلیں بہت کم ہیں۔ ان سے زیادہ مخمس، مسدس اور قطعے ہیں۔ کلام میں زبان صاف اور شستہ اور بیان کا انداز پسندیدہ ہوتا ہے۔ ان کے دو شعر یہ ہیں۔

کھیلتا ہے ساقیا گر تو بط مے کا شکار　　تو لب دریا بنا موج مے احمر سے دام

ترحم کب کسی پر یہ ستم آثار کرتے ہیں　　نمک اس پر چھڑکتے ہیں جسے افگار کرتے ہیں

نکہت اپنے وقت کے قابلِ ذکر مثنوی لکھنے والوں میں سے بھی تھے۔ اکبر شاہ بادشاہ کی خاطر سے انھوں نے نظامی کے سکندر نامے کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ امتدادِ زمانہ سے اب وہ نایاب ہے۔ رامپور جا کر نواب احمد علی خاں رند کی فرمائش سے فیضی کی مشہور مثنوی مل دمن کو اپنی زبان میں نظم کیا۔ کلکتہ والے اس زبان کو عموماً ہندیِ ریختہ کہتے تھے۔ لیکن دہلی اور لکھنو میں اسے ریختہ اور ہندی کہتے تھے۔ چنانچہ ناصر نے مرزا قتیل کے حال میں لکھا ہے:

"مگر یہ کہ ہندی گویوں کا تذکرہ ہے اور اکثر ہندی گو اس کے شاگرد ہیں اس واسطے لکھا گیا۔"

نکہت بھی اپنی زبان کو "ہندی" ہی کہتے ہیں۔ اس سے یہ مغالطہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اُس زبان کے شاعر تھے جو دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہے اور جو زمانہ حال میں سنسکرت کی آمیزش سے اردو سے بعض مقامات پر اپنے تلفظ اور قواعد کے اعتبار سے بھی مختلف ہو گئی ہے۔12

نکہت کی اس مثنوی کی ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شاعر کو جہاں موقع ملا ہے اس نے ٹھیٹھ ہندستانی اشیا اور رسوم وغیرہ کا ذکر کیا ہے مثلاً ؎

مرغانِ چمن صفیر سنجاں جوں برہمنان دبید خواناں

نواب احمد علی خاں رند کے لیے یہ مثنوی لکھی گئی تھی چنانچہ اس کے شروع میں ان کی مدح شامل کی ہے اور بیان میں صنعتوں کا اس طرح استعمال کیا ہے کہ بعض وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ شعر اسی صنعت کو صرف کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

واں تجھ کو بنادے سروکار یاں بگڑے ہے دم بدم دلِ زار

صناعی کے باوجود اس مثنوی کی زبان دقیق اور پیچیدہ نہیں ہے۔ مقصود اگر عیب جوئی نہ ہو تو کہا جانا چاہیے کہ یہ ایک کامیاب مثنوی ہے۔ 13

اس مقام پر یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظم ہو یا نثر، اس کے زمانہ تخلیق پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص نکہت کی مثنوی کو دبیر اور بزم وغیرہ کی بھی تخلیقات کے بعد رکھ کر اس کے معیار کے بارے میں حکم لگائے تو ؎

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

مرزا نیاز علی بیگ نکہت کا ایک مفید کام ''فرہنگِ مصطلحاتِ زبانِ اردو'' ہے۔ یہ کام انھوں نے آخر عمر میں پریشان حالی کے زمانے میں کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم میں وہ یہ کام جیسا کہ چاہیے تھا نہ کر سکے۔ محمد نصیر الدین نقش نے اس کی بے ترتیبی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''واضح ہو کہ کترین محمد نصیر الدین نقش تخلص نے حسب استدعا بعض احباب کے یہ
کتاب کہ مخزن اسرار و فوائد ہے، تالیف کی ہوئی نیاز علی بیگ نکہت ساکن شاہجہاں
آباد کی بے ترتیب، حشو و زوائد سے جمع کر کے لکھا ہے۔ الخ'' 14

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ نکہت کی کتاب ایک مفید ماخذ کے طور پر بعد میں استعمال کی جاتی رہی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے راقم کو اطلاع دی تھی کہ اس کتاب میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کے بہت شعر نقل کیے گئے ہیں۔

7۔ فنائی

میر ساجد علی نام، فنائی تخلص، اکبر شاہ ثانی کے عہد کا کوئی غیر معروف شاعر امرتسر میں تھا۔

اس کی ایک مثنوی کے دو قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ قاموس الکتب میں ایک نسخے کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

''فنائی ۔ محمولی برقلب صفحات 264

سال تصنیف: 1233ھ (=1818)

حوالہ: ہندوستانی مخطوطات دفتر دیوانی دہلی، حیدرآباد دکن

نواب مظفر خاں والی ملتان کے سوانح حیات، رنجیت سنگھ سے جنگ اور مظفر خاں کی شہادت کے حالات'' 15

یہ تعارف ناقص ہے اور کتاب کا نام غلط فہمی پر مبنی ہے۔ صحیح نام اس کا ''عاقبت بخیر'' ہے چنانچہ شاعر نے اس کے آخر میں خود کہا ہے ۔

کہی میں نے یہ مثنوی دل لگا کہ خلق اس کو سنکر کرے پھر دعا
ہوئی ختم جب یہ بخیرعاقبت رکھا نام اس کا بخیر عاقبت
ہے محمول برقلب اس کا یہ نام کہ ہو قافیہ عاقبت کا تمام

یعنی شاعر نے قافیہ میں لفظ عافیت کی رعایت سے اس مثنوی کے نام کو الٹا نظم کر دیا ہے، چنانچہ بخیر عاقبت کو اُلٹو تو ''عاقبت بخیر'' اس کا نام حاصل ہو جائے گا۔ اس مثنوی میں شاعر کے ولی نعمت کی شہادت کا بیان ہوا ہے اور یہ صورت خود شاعر کی عافیت کے برخلاف تھی البتہ ممدوح کو شہادت کا درجہ حاصل ہوا اور یہ اس کی عاقبت کے بخیر ہونے کی دلیل ہے چنانچہ مثنوی کا یہ نام حسب حال اور مناسب ہے۔

اس مثنوی کے نسخہ کراچی کو شاعر کے ایک شاگرد نے نقل کیا تھا۔ ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:

''ہذا مثنوی مسمی عاقبت بخیر بہ ید احقر الناس گورمکھ قوم کھتری، ساکن لاہور تلمیذ میر ساجد علی متخلص بہ فنائی برائے خاطر حافظ صاحب حافظ از مقام انبرت سرور، عہد اکبر شاہ بادشاہ بہ وقت چاشت ہشتم ماہ ذی الحجہ باتمام رسید۔

نوشتہ بماند سیہ ۔ برسفید
نویسندہ را نیست فردا امید''

افسر صدیقی امروہوی نے مثنوی کے مطالب کا خلاصہ اس طرح قلمبند کیا ہے:

''عاقبت بخیر میں اس جنگ کے حالات نظم کیے گئے ہیں جو نواب مظفر خاں سدوزئی حاکم ملتان اور راجہ رنجیت سنگھ کے درمیان 1233ھ (=1818) میں قلعہ ملتان کے لیے ہوئی تھی۔ اس میں عبدالصمد خاں جس کا باپ نواب مظفر خاں کا ملازم تھا، رنجیت سنگھ کی طرف سے لڑا تھا۔ اس جنگ میں نواب مظفر خاں اور ان کے کئی جواں مرد وشیر دل بیٹے شہید ہوئے۔''16

امرتسر وغیرہ مقاموں کو اس زمانے تک اردو شاعری کے مرکز کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہاں کی بول چال پر پنجابی زبان کے اثرات سے قطع نظر قدامت کا بھی غلبہ تھا چنانچہ فنائی کی اس مثنوی میں بعض لفظوں کا استعمال اور قوافی وغیرہ کا طور بھی اس صورت حال کا مظہر ہے مثلاً۔

ترے حکم سے کوئی باہر نہیں ترے حکم سے کوئی ماہر نہیں

اور۔

نہ ہوتا گنہ ہم سے اے کردگار ۔ نہ ہوتا ترا نام آمرز گار

قافیہ کے ان عیوب کے علاوہ کہیں کہیں کوئی مصرع ناموزوں بھی لکھا ہوا ہے مثلاً۔

کیا عقل کو اس نے پیدا یقین اور پیدا کیا اس نے عرشِ بریں

ان عیوب سے قطع نظر مثنوی کی زبان بطور مجموعی صاف اور آسان ہے چنانچہ نمونہ کے طور پر دو شعر یہ لکھے جاتے ہیں۔

خدایا جہاں کا تو ہے بادشاہ ترے حکم میں ماہی سے تا بہ ماہ

ترے حکم میں سب زمین و زماں ترے حکم میں سب مکین و مکاں

مثنوی کے اس مخطوطے سے متعلق افسر صدیقی امروہوی نے یہ اطلاع بھی قلمبند کی ہے کہ:

''کاتب بے حد غلط نویس ہے۔ پورے مخطوطے میں کسی صاحب نے پنسل سے املا کی اصلاحیں کی ہیں، حتی کہ بعض مقامات پر مصرعے بھی تبدیل کر دیے ہیں۔''

مخطوطہ چونکہ تصنیف کے فوراً بعد کا لکھا ہوا ہے اور کاتب مصنف کا شاگرد ہے، قوی امکان ہے کہ یہ تصحیح خود مصنف نے کی ہو۔

نثر

پنجاب (اور ہریانہ) کے علاقے میں اردو نثر کی طرف بھی اکبر شاہ ثانی کے عہد میں توجہ کی جانے لگی تھی لیکن نثر نویسی کا رواج عام نہیں ہو سکا تھا:

گمانی لعل۔ اس شخص نے 1248ھ (=1832) میں اپنی کتاب ریاضِ دلربا میں اپنا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے:

> ''مسکین ذرّہ مثال گمانی لعل ولد منشی موہن لال کایستھ رامپوری، حال وارد قصبہ رہتک ''17

> ''رامپور سے مراد رامپور منہیاران ضلع سہارنپور ہے اور اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ گمانی لعل اس قصبہ سے 1248ھ سے کچھ پہلے رہتک میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ یہیں انھوں نے شادی کی اور سرکار کمپنی بہادر کے محکمہ مال میں ملازمت کر لی۔ اسّی برس سے زیادہ عمر پا کر انھوں نے ہردوار میں 1881 (1298ھ) میں وفات پائی۔

گمانی لعل نے چمن دلکشا میں جو غالباً ان کی پہلی کتاب ہے اپنا نام اس طرح تحریر کیا ہے:

> ''عقیدت خصال گمانی لعل ولد موہن لعل کایستھ بھٹناگر رامپوری۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھٹناگر کایستھ تھے اور چمن دلکشا کی تالیف (1238ھ

=1823) تک اپنے قدیمی مسکن ہی میں قیام پذیر تھے۔

گمانی لعل نے کم عمری میں تالیف وترجمے کے کام سے دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔شروع زمانے میں وہ فارسی کی طرف مائل تھے چنانچہ انھوں نے دوستوں کی فرمائش سے ایک کتاب ''عجایب الحکایت'' کا زبان ہندی (=اردو) سے زبانِ فارسی میں ترجمہ کرکے اس کا نام ''چمنِ دلکشا'' رکھا۔اس کی تاریخ اس نے اس طرح کہی۔

بگفت ازروے بہجت ملہم حال ہزارو دوصدوی ہشت امسال

1238ھ = 1236 + 2

کچھ مدت بعد گمانی لعل نے اردو لکھنا شروع کیا۔اردو میں ان کی جو داستان دستیاب ہوئی ہے اس کا نام ''ریاضِ دلربا'' ہے۔یہ نام تاریخی ہے اور اس سے سالِ تکمیل 1248ھ = 1832 برآمد ہوتا ہے۔مصنف کا کہنا ہے۔

مقرر ساختم بعد اختتامش ریاضِ دلربا تاریخ ونامش

1284ھ

اور۔

نسخہ ہوش وخرد سے دور کر آخر حرف بیگماں ہوجاے سالِ حضرتِ عیسیٰ عیاں

1832 = 4 ـ 1836

ان سے ظاہر ہے کہ گمانی لعل ہر قسم کی تاریخیں کہہ لینے پر قدرت رکھتا تھا۔

اُس زمانے کے طریق کے مطابق گمانی لعل بھی نثر نظم آمیز لکھتا تھا چنانچہ ریاض دلربا میں اشعار فارسی کے علاوہ اردو کی غزلوں، مثنویوں کے متفرق اشعار اور رباعی بھی موقع بہ موقع نقل کی ہیں۔اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

نظم

شوق میں اس کے طوطیانِ چمن ہیں غزلخواں خوشی سے درگلشن

قدرتیں اس کی دیکھ کر طاؤس رقص و خنیا گری سے ہے مانوس

دیکھ غنچے کو ذوق سے گُلِ گُل ہوئی مفتوں پہ جان ودل بُلبُل

عشق سے قمریاں ہیں کو کو زن طوق الفت کا ڈال در گردن

گمانی لعل کی زبان مصنوعی اور خلاف روزمرہ ہے۔ عربی فارسی کے الفاظ بہت کثرت سے اور اکثر بے محل لائے گئے ہیں بلکہ بسا اوقات فارسی میں مرکب افعال وغیرہ ایسے گڑھے ہیں کہ وہ کانوں ہی نہیں مذاقِ سلیم پر بھی گراں گذرتے ہیں۔ یہی صورت ان کی نثر میں بھی ہے۔

ریاضِ دلربا کے سببِ تالیف کا بیان کرتے ہوئے گمانی لعل نے واقعہ کا بیان اِس طرح کیا ہے:

''ناگہاں ایک نے دوستانِ صمیم وعیانِ قدیم سے یہ مصرع برجستہ حافظ شیرازی کا مصرع

چہ دلاور است دُزدے کہ بہ کف چراغ دارد''

بہ زبان فصیح پڑھا اور دوسرا مضمون اس مصرع پر اعتراض لے جا کر کہنے لگا کہ اے ناقدانِ عیارِ سخن وصیرفیانِ بازارِ این فن، دزدِ بدچلن شبِ تار وشکن میں خفیہ و پنہاں مالِ مردم کا چُراتا ہے اور جس مقام پر کہ نشانِ روشنی کا مبرہن ہو اس جگہ سے آپ کو جائے تیرہ وتار میں چھپاوے۔

اس تمہید کے مطابق ریاضِ دلربا ایک چور کا قصہ ہے جو شاہی کارکنوں اور خود بادشاہ کو بھی زچ دیتا ہے۔ قصہ کو ختم کرنے کے بعد مصنف نے ''خاتمۂ کتاب'' کے عنوان سے جو لکھا ہے وہ ان لفظوں پر تمام ہوا ہے:

''پس ازاں طاعتِ واجب الاطاعتِ الٰہی کے تئیں سب چیز پر مقدم جان کر بہ عبادتِ خداوندِ ذوالجلال کے اشتغال کرا ور یادِ پروردگار سے لحظہ غافل وعاطل نہ ہو کہ زندگانی انسان ضعیف الیقین کی جاودانی نہیں اور یہ جہانِ نیت اساس بمصداق کُلُّ نَفْسٍ ذائقۃ المَوت کے گزارانِ وفانی ہے۔''

اس کا ایک قطعہ تاریخ فارسی میں اور ایک اردو میں ہے۔ تتمہ کی عبارت سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب چھپ چکی ہے:

''الحمدللہ کہ قصہ ریاضِ دلربا من تصنیف منشی گمانی لعل قوم کایستھ ساکن قدیم قصبہ رامپور، حال وارد قصبہ رہتک در مطبع جیل پریس بہ ہنگام ٹھیکہ حرفت کاری جیل خانہ

رہتک، حسب ایمائے منشی کدارناتھ خزانچی وٹھیکہ دار حرفت کاری حلیۂ انطباع پوشیدہ۔

تاریخ دہم اکتوبر 1863 (=1280ھ)"

کنول ڈبائیوی مرحوم نے ذکر کیا تھا کہ گمانی لعل نے بھگت مال کو بھی اردو میں لکھا تھا۔ اس کا ترقیمہ اس طرح ہے:

"تمام شد بعون عنایت ایزد سخن آفریں وتوجہ ہائے صورت گزیں؟ پوتھی سری بھگت مال..... بہ تالیف وترقیم بصد نیاز گمانی لعل بندہ نیاز۔ بتاریخ نوزدہم اگست 1838 بمطابق جون بدی اشٹمی 1895 (=1254ھ)"

معلوم ہوتا ہے کہ گمانی لعل نے کئی برس میں اس کتاب پر نظر ثانی کی تھی چنانچہ اس کی تاریخ انھوں نے اس طرح کہی تھی ۔

پس از سعی فراواں، جستجوہا چوگل بشگفت باغ آرزوہا

اس شعر سے مطلوبہ سال یعنی 1267ھ (=1851) برآمد نہیں ہوتا ہے۔ شاید نقل کرنے میں کچھ فرق ہو گیا ہے۔

بھگت مال ہندستانی سنتوں اور فقیروں کا تذکرہ ہے جس کی فارسی اور اردو میں متعدد روایتیں موجود ہیں۔ ہر روایت کے مولف نے اپنی معلومات کے مطابق اس میں ترمیم واضافے کر لیے ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ گمانی لعل نے ان میں سے کس روایت سے استفادہ کیا تھا اور انھوں نے اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی یا ردوبدل کی تھی یا نہیں۔

(ج) کشمیر

کشمیریوں میں سے بیشتر صاحبان علم وفن دہلی اور لکھنو وغیرہ علمی مراکز پر منتقل ہو گئے تھے۔ پھر بھی کچھ قناعت پسند اہلِ ذوق ترکِ وطن پر آمادہ نہیں ہو سکے اور وہیں اپنے علمی شوق کی آسودگی کے سامان فراہم کرتے رہے۔ انجمن ترقی اردو، پاکستان کے کتب خانے میں سری بھگوت گیتا کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جس کے ترقیمہ کی عبارت اس طرح ہے:

''ایں پوتی دسم اسکند حسب الفرمائش لالہ ہرنج رائے کپور قصبہ حافظاں بادر خطہ کشمیر درسال سسفا نیل، بہ دستخط حبیب اللہ نوشتہ شد۔ سمبت 1885 بتاریخ اول ماہ ماگ۔''1

اس سے ظاہر ہے کہ صاحبانِ علم نسبتاً غیر معروف مقامات میں بھی سکونت پذیر تھے اور علمی معاملات میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہتے تھے۔

کشمیر کے علاقوں میں جو اربابِ قلم مقیم تھے، بُعدِ مکانی کے سبب ان کو شہرت حاصل نہیں ہو سکی اور شعرائے اردو کے متداول تذکرے ان کے ذکر سے خالی رہ گئے۔ کسی کسی کا کلام اگر دہلی اور لکھنؤ تک پہنچ گیا تو اس کے حالات کا وہاں مذکور نہیں ہوا مثلاً

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرے میں ان (حسن) کا حال اس طرح تحریر ہے:

''حسن تخلص حسن علی خاں، چونکہ ازمردم کشمیر است۔ دیگر از حالش وقوف نہ
شد۔اوراست ؎

آنکھوں میں مری قطرۂ خوں ناب نہ ٹھہرا ہر چند کیا ضبط، یہ سیماب نہ ٹھہرا''؎

(د) صوبہ سرحد

1۔ رنگین

شاہ عالم ثانی کے وقت میں بھی صوبہ سرحد کا صدر مقام پیشاور تھا اور اس اعتبار سے اس شہر کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس علاقے کی زبان اردو نہیں تھی لیکن اس بارے میں بھی شک کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ زبانِ اردو اس صوبہ میں بالکل غیر مانوس اور غیر مروّج بھی نہیں تھی حافظ محمود خاں شیرانی نے تیمور شاہ ابن احمد شاہ ابدالی متوفی 1205ھ (91-1790) کے عہد کے ایک غیر معروف شاعر جس کا تخلص رنگین تھا، کی دو نظموں کا پتہ لگایا تھا:

> ''پہلی نظم داستان فیض اللہ خاں ہے جس میں فیض اللہ خاں افغان کی تیمور شاہ کے خلاف بغاوت کرنے اور پھر تیمور شاہ کے حامیوں کی جدوجہد سے اس بغاوت کے کچلے جانے کا حال نظم کیا گیا ہے۔ یہ نظم تاریخی ماخذ کی حیثیت سے بہت اہم ہے۔
>
> رنگین کی دوسری نظم داستانِ پیشاور ہے جس کے تعارف میں کہا گیا ہے:
>
> ''داستان پیشاور ایک شہر آشوب ہے..... یہ نظم پشاور میں لکھی جاتی ہے اور غالباً کسی مقامی شاعر کے قلم کی یادگار ہے۔ شاعر کا تخلص رنگین ہے..... رنگین کی اور نظموں سے

معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی کرتا تھا.....اس کی بے محاورہ زبان صاف ظاہر کرتی ہے کہ وہ کوئی ہندستانی نہیں ہے اور نہ زبان پر اس کو عبور ہے.....موں، سوں، تیں وغیرہ کا استعمال بجائے ظرفیہ میں اور جارہ سے بہت عام ہے۔ نظم میں مقامی زبان کی خصوصیت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی" 1

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ شخص رنگین ہندوستان کے کسی شہر سے صوبۂ سرحد میں گیا ہوگا اور وہاں اس کو بہ گمانِ غالب تیمور شاہ تک رسائی حاصل ہوگئی ہوگی۔

داستان پشاور کے کچھ شعر یہ ہیں ۔

وقت ہے اجلاف کا تم کوں نہ آوے گر یقیں — میں بتاوتا ہوں ہر یک قوم کوں کر کر شمار
اولاً اول تو نخوت گھر موں جا چھور کی دیکھ — جس کو آتا ہے مغل سوں اور افغان سوں بی عار
دوم جس کے محتسب ہر روز کرتا تھا علاج — اب وہ وہ باشی کہادے آپ کوں کر کر تیکار
عمر جن کی گزر گئی باندگی کرتے ہوئے — فقر کا جبہ انھوں کے تن سوں ہیگا سا زوار
گل کش و گل کار ایسے ہوگیے مغرور سب — گر کسی کا گھر گرا ہو کس سوں کر وادے طیار

رنگین کی اس نظم کے بارے میں شیرانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"اس کی.....مگر شکستہ و بستہ ہے جس سے روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی بالکل مفقود ہے۔ شاعر سیدھے سادے انداز میں اہل پیشہ کی برائی کر رہا ہے۔ جن اہل حرفہ کا مذکور ہے یہ ہیں:

دوم، نائی، ترچراں، چوہڑ (چھور) یعنی خاکروب، مصلی، باندہ، گل کش و گل کار، نعل بند، شمشیر گر، بندوق ساز، خوردہ فروش، آٹا فروش، موچی، سرتراش، خیمہ دوز، جوتی فروش، زرگر، کلال، سبزی فروش، نجار، لوہار، عطار، کہابی، وغیرہ وغیرہ۔"

یہ نظم اپنے انداز میں ابتدائی نوعیت کی ہے اور قابل قدر ہے۔ ان نظموں کے علاوہ یہ شاعر غزل بھی کہتا تھا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ۔

مشرف گر کبھو تجھ حسن سیں مہتاب ہوجاتا
قیامت لگ پھر آتا رات کو نایاب ہوجاتا

2۔حیدر

ان کا نام میر حیدر علی خاں اور تخلص نام کی مناسبت سے حیدر تھا۔ یہ حضرت غوث الاعظم کی اولاد میں تھے2 ۔مولد ان کا لاہور تھا لیکن انھوں نے دہلی کے نواح اور دیار مشرق تک سفر کیا تھا۔ بتایا گیا ہے کہ شاہزادہ مرزا شگفتہ بخت کی مصاحبت میں یہ شہر محمد آباد بنارس میں بھی مقیم رہے تھے۔آخر عمر میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ پشاور میں جا کر مقیم ہوگئے تھے3۔ وہاں کے لوگ بیشتر ان کے عقیدت مند تھے۔ان کے اردو کلام میں ان کی مذہبیت صاف جھلکتی ہے چنانچہ عقیدت مندوں میں وہ خوب مقبول رہا ہوگا۔

حیدر کی زبان عموماً سلیس اور رواں اور طرز بیان دلکش رہا ہے۔ان کے کچھ شعر نمونہ کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔

بے وجہ نہیں حسن دل افروز بتاں کا — دیکھا تو یہ مظہر ہے خداوندِ جہاں کا
ارادہ ہے بیڈھب کچھ اس چشمِ تر کا — خدا حافظ آج اپنے دیوار و در کا
مشرب ہم اپنا کیا کہیں مستِ الست ہیں — بندے تو ہیں خدا کے یہ صورت پرست ہیں
گھر میں خوباں کے تو جانا ترک مدت سے کیا — لیکن حیدر اب تلک جاتی نہیں یہ تاک جھانک

3۔غلامی

صوبہ سرحد میں زبانِ اردو بتدریج پھیلی چلی گئی اور اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ پشاور کے علاوہ دوسرے مقاموں پر بھی ایسی کتابیں لکھی جانے لگیں جو اس کے سیکھنے سکھانے میں معاون تھیں۔ڈاکٹر سید عارف نوشاہی نے ایسی ایک دو کتابوں کا تعارف کرایا ہے مثلاً لکھتے ہیں:

''انشائے ہنرفروز (قلمی) مصنف نامعلوم

چونکہ یہ نسخہ انشائے معشوقہ اور تعلیم نامہ کے ساتھ ہے اور یہ دونوں کتابیں غلام علی شاہ کوہاٹی کی تصنیف ہیں اور تمام کتب ایک ہی قلم سے لکھی ہوئی ہیں، قیاس کیا جاتا ہے

کہ انشائے ہنر فروز بھی کوہاٹی ہی کی تصنیف ہوگی۔ کتاب کا سال تصنیف 1250ھ (1834) واضح ہے۔ انشا کے پندرھویں مکتوب میں برصغیر میں اردو زبان کی تدریس وتعلیم کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

آغاز۔ حضرت قبلہ گاہی صاحب فرزندی کے وسیلے شفقت ونوازش..... نستعلیق، مجموعہ کی تاریخ کتابت 1277ھ (1860-61) مجموعہ میں از صفحہ 112 تا 143"4

اس اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصنف فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتا تھا۔ زبان اردو کی تدریس وغیرہ سے متعلق اس کی معلومات وسیع تھیں۔ اس کی تحریریں کوہاٹ سے نکل کر دوسرے مقامات تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

حواشی

(الف)۔ ہریانہ

1	مقالات شیرانی	جلد2	ص351
2	ایضاً	جلد2	ص358
3	ہادی ہریانہ		ص128
4	ایضاً		ص139
5	ایضاً		ص129
6	گلستان سخن	جلد2	ص191 تا192
7	سخن شعرا		ص311
8	ہادی ہریانہ		ص153
9	گلستان سخن	جلد2	ص283
10	ایضاً	جلد2	ص337

(ب)۔ پنجاب

1	مجموعۂ نغز	جلد1	ص101
2	عمدۂ منتخبہ		ص138
3	گلشن بے خار		ص31
4	طبقات شعرائے ہند		ص311
5	گلستان سخن	جلد1	ص430-431

6	گلستان سخن	جلد2	ص259
7	سراپا سخن		ص101
8	گلشن بے خار		114
9	گلستان سخن	جلد2	ص472
10	ایضاً	جلد2	ص448تا450
11	اردو مخطوطات سمینار 1987		ص362
12	خوش معرکۂ زیبا	جلد1	ص297
13	اردو مثنوی شمالی ہند میں		ص587
14	آصفیہ کے اردو مخطوطات	جلد1	ص363
15	قاموس الکتب	جلد2	ص308
16	اردو مخطوطات انجمن کراچی	جلد5	ص373
17	ریاض دلربا		ص14تا15

(ج)۔ کشمیر

1	اردو مخطوطات انجمن کراچی	جلد5	ص128
2	گلشن بے خار		ص60

(د)۔ صوبہ سرحد

1	مقالات شیرانی	جلد9	ص142تا145
2	عمدۂ منتخبہ		ص226
3	مجموعہ نغز	جلد1	ص255
4	مخطوطات اردو گنج بخش		ص87

2-دہلی

1-	آفتاب-شاہ عالم ثانی	39
2-	شعاع-محمد اکبر شاہ ثانی	41
(الف)	غزل	45
	(1)	
1-	احسان حافظ عبدالرحمٰن	45
	احسان کے شاگرد	48
	ذکی، ثابت، قمر، سلطان	
2-	سید-غالب علی خاں	50
	سید کے شاگرد	51
	سخنور، طالب	
3-	شکیبا شیخ غلام حسین	53
	شکیبا کے شاگرد	54
	غم خوار	
4-	قاسم حکیم میر قدرت اللہ	55
5-	فراق-ثناء اللہ خاں	56

(2)

6-	عشق-میرعزت اللہ	58
7-	مائل-شاہ محمدی	60
8-	آشفتہ-بھورے خاں	60
9-	نصیر-شاہ نصیرالدین	61

(3)

10-	ظفر-مرزا ابوظفر	70
11-	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	75
12-	معروف-نواب الٰہی بخش	82
13-	غالب-مرزا اسداللہ خاں	92
14-	ممنون-میرنظام الدین	100
15-	مومن-حکیم محمد مومن خاں	103
(ب)	قصیدہ	109
1-	ممنون-میرنظام الدین	110
2-	احسان-حافظ عبدالرحمٰن	113
3-	نصیر-شاہ نصیرالدین	113
4-	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	117
5-	مومن-حکیم محمد مومن خاں	123
5-	غالب-مرزا اسداللہ خاں	134
(ج)	ہجو و ہزل	141
1-	احسان-حافظ عبدالرحمٰن	141
2-	اوج-عبداللہ خاں	143
3-	خلیفہ-رجبی حجاب	144

4-	فدا-سید محمد علی	144
5-	کرم-شیخ غلام ضامن	145
6-	غالب	145
(د)	واسوخت	147
1-	مومن-حکیم محمد مومن خاں	147
(ہ)	مثنوی	155
1-	منشی-مول چند	155
2-	عاجز-زور آور سنگھ	156
3-	سرور-اعظم الدولہ میر محمد خاں	162
4-	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	169
5-	غالب-مرزا اسد اللہ خاں	170
6-	مومن-حکیم محمد مومن خاں	170
7-	حسن-مولوی ابوالحسن	182
8-	ممنون-میر نظام الدین	186
9-	متفرق مثنویاں	187
(و)	نامۂ منظوم	189
1-	احسان-عبدالرحمٰن خاں	189
2-	مومن-حکیم محمد مومن خاں	191
3-	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	193
(ز)	مرثیہ وغیرہ	197
1-	احسان عبدالرحمٰن	197
2-	نصیر-شاہ نصیر الدین	198
3-	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	199

-4	مومن-حکیم محمد مومن خاں	200
-5	مضطر-کنور سین	203
-6	افسر-غلام اشرف	204
(ح)	رباعیات و مستزاد	205
-1	احسان-عبدالرحمٰن	205
-2	نصیر-شاہ نصیرالدین	206
-3	معروف-نواب الٰہی بخش	207
-4	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	207
-5	غالب-مرزا اسداللہ خاں	209
-6	مومن-حکیم محمد مومن خاں	210
(ط)	قطعات	213
-1	احسان-حافظ عبدالرحمٰن	213
-2	نصیر-شاہ نصیرالدین	214
-3	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	214
-4	غالب-مرزا اسداللہ خاں	217
-5	مومن-حکیم محمد مومن خاں	217
(ی)	تضمین	221
-1	احسان-عبدالرحمٰن خاں	222
-2	نصیر-شاہ نصیرالدین	222
-3	ممنون-میر نظام الدین	223
-4	معروف-نواب الٰہی بخش	223
-5	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	225
-6	ظفر	226

7-	مومن-حکیم محمد مومن خاں	227
(ک)	تاریخ گوئی	231
1-	احسان-عبدالرحمٰن	231
2-	ممنون-میر نظام الدین	232
3-	نصیر-شاہ نصیر الدین	232
4-	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	233
5-	غالب-مرزا اسد اللہ خاں	234
6-	خرد نواب فخر الدین خاں	235
7-	مومن-حکیم محمد مومن خاں	236
8-	صہبائی-امام بخش	237
(ل)	معمہ	239
1-	مومن-حکیم محمد مومن خاں	239
2-	صہبائی-امام بخش	240
(م)	پہیلیاں، گیت وغیرہ	243
1-	ذوق-شیخ محمد ابراہیم	244
2-	ظفر-مرزا ابو ظفر	246
3-	صہبائی امام بخش	247
(ن)	مذہبی نثر	249
1-	رشید الدین	249
2-	سید احمد شہید	250
3-	اسماعیل شہید	253
4-	محمد سلطان	254
5-	اکرام الدین	256

6-	سید صالح محمدی	258
7-	نصراللہ	260
(س)	تذکرے	263
1-	تذکرہ سرور	263
2-	طبقات سخن	266
3-	تذکرہ بے جگر	269
4-	تذکرہ آزردہ	271
5-	گلشن بے خار	273
(ع)	مطبعے	277
	حواشی	279

1- آفتاب

عالی گہر، ابوالمظفر، جلال الدین محمد، شاہ عالم ثانی بادشاہ غازی سخن گو اور سخن پرور تھے۔ آفتاب تخلص کرتے تھے اور حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کے بقول:

''آنحضرت تفریحاً لطیع اللطیف بدیں شغل شریف کہ عبارت از ابتکار شعر و شاعری است، فارسی باشد یا ریختہ، سنسکرت بود خواہ بھاکھا، صرف می شود۔ دیوان فارسی و ریختہ مکمل و مردف مشتمل بر قصاید و غزلیات و دیگر انواع سخن و قصہ شاہ شجاع الشمس در سلک ریختہ ریختہ.....''[1]

ان کی تصانیف میں ''نادرات شاہی'' خصوصاً لائق ذکر ہے کہ اس میں غزل اور ترانہ کے علاوہ ہوری، استتی، کبت، دوہرے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ایسے صاحب سخن اور سخن پرور بادشاہ کی سرپرستی میں نظم و نثر کی مختلف اصناف اور اقسام کا فروغ پانا گویا قدرتی بات تھی۔

2-شعاع

شاہ عالم ثانی نے 7۔رمضان 1221ھ (=19 نومبر 1806) کو دارالخلافہ دہلی میں بوقت صبح کاذب وفات پائی اور اسی دن ان کے صاحبزادے ابوالنصر، معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔اپنے زمانہ شاہزادگی میں تو یہ کسی نہ کسی طور پر شاعری اور مشاعروں سے دلچسپی لیتے رہے تھے، لیکن بادشاہت کا بار سر پر آجانے کے بعد غالباً شعر گوئی کی طرف بالکل توجہ نہیں دے سکے تھے۔قاسم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''شعاع تخلص.....ولی عہد محمد اکبر شاہ.....خوش عقیدہ، نیک دین، پاکیزہ مذہب، صاحب یقین واقع شدہ۔درایام حیات مرزا جہاندار شاہ، بہ منصب وزارت عظمیٰ سلطنت کبریٰ ممتاز وسرفراز بودند.....طبع قویم آں سلطنت نظام بنابر موزوں بودن، گاہ گاہ مایل بہ شعر وسخن می شدہ.....لہٰذا بہ دام غلہ' 2

تجھ زلف کے عہدے سے یہ دل کیونکہ برآوے تا حشر نہ چھوٹے یہ بلا جس کے سر آوے
واں بار شعاع ذرہ نمط ہم کو کہاں ہے دن رات جہاں مجرے کو شمس وقمر آوے''2

اکبر شاہ نے اپنے والد کے تخلص کی مناسبت سے اپنا تخلص شعاع مقرر کیا تھا۔غزل کی طرف ان کی توجہ معلوم ہوتی ہے۔زبان صاف اور سلیس تھی البتہ الفاظ قدیم ان کی زبان پر جاری تھے۔

7-رمضان 1173ھ (=1759) کو مکند پور ریواں میں بروز چہار شنبہ اکبر شاہ پیدا ہوئے تھے اور 28- جمادی الثانی 1253ھ (1837) کو پایہ تخت دہلی میں کوئی اَسّی برس کی عمر میں وفات پائی۔ لالا سری رام نے لکھا ہے کہ:

" درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے قریب اپنے پدر والا قدر کے پہلو میں آرام کیا۔ مرقدِ منور پر حضرت ظفر کی کہی ہوئی تاریخ کندہ ہے ۔

شاہ اکبر فروغ بخش جہاں مخسف گشت از قضا چوں بدر
بے سال وفات گفت ظفر عرش آرامگاہ عالی قدر

1253

موزونیِ طبع ظلِ سبحانی کی موروثی ہم تھی لیکن فکرِ سخن کی طرف توجہ کم بلکہ برائے نام تھی۔"[3]

اکبر شاہ تمام خرابیوں کے باوجود، شاہی کی روایتوں کو بحد امکان نباہ رہے تھے۔ اپنے والد کے دور کے شاعروں کی بھی کماحقہ، سرپرستی کرتے رہتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے ضمناً لکھا ہے کہ:

"اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی مگر مرزا ابوظفر ولی عہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے عاشق شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا، اس لیے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے مثلاً حکیم شاہ اللہ خاں فراق، میر غالب علی خاں سید، عبدالرحمان خاں احسان، برہان الدین خاں زار، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق، میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم، مرزا عظیم بیگ عظیم شاگرد سودا، میر قمرالدین منت، ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب مشاعرہ میں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا، مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔"[4]

ان میں سے منت اور عظیم شاہ عالم ثانی کے عہد میں وفات پا گئے تھے۔ سید نے اکبر شاہ کا زمانہ پایا تھا لیکن وہ خوزان کی زندگی کے آخری دن تھے۔ زار اور ممنون کا تعلق قاسم اور فراق کے

بعد کی نسل سے تھا چنانچہ ان کا حال اُسی موقع پر لکھا جائے گا۔

سلطنت پر ادبار آ چکا تھا۔ تباہیوں اور بربادیوں کے سلسلے جاری تھے۔ دہلی کے باکمال اکثر اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسرے مراکز کی طرف چلے گئے تھے۔ جو رہ گئے تھے ان میں سے بھی بعض نے آنا جانا لگا رکھا تھا۔ پایۂ تخت میں علم و دانش کے سلسلوں کو جاری اور برقرار رکھ کر، ان کے معیاروں کو پھر بلندی کی طرف لے جانے کی ذمہ داری اب انھیں حوصلہ مندوں کی تھی جن کے پائے استقامت کو لغزش نہیں ہوئی تھی اور جو استقلال کے ساتھ اب تک اپنے گھروں میں رہ رہے تھے دہلی میں اب سودا اور میر، جرات اور انشا وغیرہ نہیں تھے۔ یہاں شکیبا اور فراق، قاسم اور احسان وغیرہ تھے۔ انھیں سے یہاں کی محفلوں کی رونقیں تھیں اور انھیں نے یہاں وہ فضا پیدا کر رکھی تھی جس میں ایسے باکمالوں نے پرورش پائی جن کے ناموں پر اردو دنیا تا دیر فخر کرتی رہے گی۔

(الف) غزل

شاہ عالم ثانی کے عہد کے جن باکمالوں نے اکبر شاہ ثانی کا زمانہ پایا تھا اور دلی میں استقلال کے ساتھ رہ رہے تھے، ان میں سے بعض کا حال مختصراً لکھا جاتا ہے۔

1 - احسان - قدرت اللہ قاسم کے معاصر تھے چنانچہ انھوں نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"حافظ عبدالرحمان سلمہ اللہ المنان، در ابتدا رحمٰن تخلص می کرد و شعر فارسی ہم می گوید۔ وے جوانیست متین باتمکین، خوش اختلاط، کشادہ پیشانی، سراپا محبت، سربسر مہربانی، بزرگانش اکثر حافظِ قرآں و بیشتر از نیاگانش فقہ داں.... خودش در سلک شعرائے پائے تخت منسلک است، شیریں زبان و خوش فکر واقع شدہ، کلامش حلاوت دارد۔"[4]

ان کی شاعری کے بارے میں اعظم الدولہ سرور کی رائے بہت واضح ہے، یعنی:

"بہ صحت محاورہ شعر، بستہ می گوید و نزاکت لفظ و معنی در اجارہ قلم بدیع رقم ادست۔ در بدیہہ گوئی حاضر جواب۔"[5]

اس زمانے کے ان کے چند شعر یہ ہیں ۔

پل میں مریض وہ کرے، دم میں شفا یہ دے مجھے — آہ وہ چشم مے پرست، واہ وہ لعل بادہ نوش

غازہ بہ رو، مسی بہ لب، پاں بہ دہن، حنا بہ کف — سلک در عدن بہ سر، طرۂ عنبریں بہ دوش

معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہیں اور جس کو جس طرح چاہتے ہیں نظم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ذیل کے شعر میں خوبیِ فکر نے عیب کو حُسن بنا کر پیش کر دیا ہے۔

چہرے پر آپ کے بے وجہ نہیں داد ہوا　　داد دو میری کہ یہ باعث بیداد ہوا

اس زمانے کی ایک طرحی غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

ہو کے شاگرد لکھا خط میں ہے، بھائی مجھ کو　　قیس گستاخ کی یہ بات نہ بھائی مجھ کو

ہائے چلون سے جھلک کیا ہے دکھائی مجھ کو　　آگ اُس دستِ حنائی نے لگائی مجھ کو

بال پھر کھولے ہیں اس بت نے خدا خیر کرے　　ایک اندھیر سا دیتا ہے دکھائی مجھ کو

کیا کروں سلطنتِ جم کو کہ جم جم ہو نصیب　　آستانِ شہِ جیلاں کی گدائی مجھ کو

اس خرابات میں اے بادہ کشاں ہووے نصیب

خوشۂ تاک تمھیں، آبلہ پائی مجھ کو

وہ زمانہ تھا جب سلطنت کے کاروبار میں تزلزل کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ طبیعتوں میں بھی استقلال نہیں رہ گیا تھا۔ شاعروں کی فکر بھی ایک حال پر قائم نہیں تھی۔ بعض اپنے تخلص بدل لیتے تھے اور کچھ کی شاعری کے طرز میں فرق آ جاتا تھا۔ احسان کے حال میں شیفتہ نے لکھا ہے:

"احسان.... از سخن طرازان عہد فردوس منزل شاہ عالم بادشاہ است۔ سالہائے عہدۂ مختاری سرکار مرزا ایزد بخش بہادر سرفراز ماندہ..... باوجود پیرانہ سالی اکثر و بیشتر شاملِ بزم مشاعرہ می شود۔ اشعار عاشقانہ اش ناخن بہ دل زن است و صنایع لفظی مانند جناس و اشتقاق و طباق وغیرآں اصرار از حد افزوں دارد و بارِ تکلم تعارفش است صاحب اخلاق نیک است۔ دیوانش ملاحظہ شد۔"[7]

ان کے تلمذ کا ذکر سعادت خاں ناصر کے تذکرہ میں بھی آیا ہے، اس طرح:

"حافظ عبدالرحمان، تخلص احسان، شاگرد خان آرزو۔"[8]

خان آرزو صاحب علم شخص تھے اور زبان و بیان کے ضابطوں اور لغت کے اصولوں پر اچھی نظر رکھتے تھے۔ ان کی تربیت کا فیض احسان کے یہاں بھی نمایاں تھا۔ لفظوں کی اصل، ان کے مفہوم اور محلِ استعمال سے متعلق وہ غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ اسی صورت حال نے صنائع بدائع

سے دلچسپی کی شکل اختیار کر لی چنانچہ مولوی کریم الدین نے بھی اعتراف کیا ہے کہ:

''عمر 1263ھ (=1847) میں قریب اسی برس ہے.... صنائع لفظی میں مانند تجنیس اور اشتقاق اور طباق وغیرہ کے نامور، بدائع تلفظی میں مثل ایہام واضداد وغیرہ کے باخبر۔''9

صنعتوں کے برمحل صرف کے ساتھ ساتھ، احسان کے کلام میں اُس زمانے کی دہلی کی بول چال کا لطف بھی پایا جاتا ہے اور بعض شعروں میں انھوں نے اپنے دور کی معاشرت کی عکاسی کی بھی اچھی کوشش کی ہے۔ ایسی غزلوں سے بھی جو آسان ردیف اور قوافی میں مکمل کی گئی ہیں، شاعر کی مشاقی اور قدرتِ کلام کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے احسان کے تعارف میں خاصی مفید باتیں تحریر کی ہیں:

''بھلا دلّی شہر میں کون ہے جو 'حافظ جیو' کو نہ جانتا ہو۔ جگت استاد ہیں۔ پہلے تو قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا، مگر استاد ذوق کے قلعے میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اس بڑھاپے میں خم ٹھونک کر سامنے آ گئے اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا، نہ ہٹے۔ کوئی نوے برس کی عمر تھی۔ اپنے زمانے کے 'جلیم باعور' تھے۔ غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ شاہ عالم ثانی بادشاہ ان کو 'حافظ جیو' کہتے تھے۔ اسی نام سے تمام قلعے میں مشہور تھے۔ مصرعے پر مصرع لگانے میں کمال تھا اور سند ایسی فراخ سے دیتے تھے کہ معترض مُنہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ بڑے دبلے پتلے آدمی تھے۔ رنگ بہت کالا تھا۔ شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اڑایا ہے'' 10

اے خالِ رخِ یار تجھے ٹھیک بناتا پر چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

وہ صناعی اور صنعت گری کا زمانہ تھا اور حافظ احسان اس فن میں ممتاز تھے۔ شاہ نصیر نے ان پر پھبتی کسنی چاہی تو اپنے شعر میں کئی صنعتوں کو صرف کیا۔

حافظ احسان کی استادانہ حیثیت شاہ عالم کے زمانے میں ہی مسلّم ہو چکی تھی اور اُس دور کے اُن کے کلام کا نمونہ پیش کیا جا چکا۔ اب اکبر شاہ کے دور کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں ۔

خاک ہوکر بھی رہوں، تھا یہ وفا نے چاہا　　کیا کروں لیک، نہ کمبخت صبا نے چاہا
ہوگی یک دست تری اور ہی اے یار نمود　　جب تجھے ہم سے کسو بے سروپا نے چاہا
نام عنقا سے مجھے ننگ ہے آتا احساں
شہرۂ نام کو کیوں اہل فنا نے چاہا

مجھ کو مت ٹھکراؤ، بس چلیے، سنبھل کر، دیکھ کر　　چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پرور دیکھ کر
دیکھیو میری طرف، سچ کہیو اے اختر شناس　　کیوں فلک کو تو نے دیکھا، میرے اختر دیکھ کر
کہاں وہ گریہ، وہ نالہ، وہ جاں بلب رہنا　　کسی کا کام ہمیشہ بنا نہیں رہتا
کوٹھے پہ چڑھا کر تو مری جان سمجھ کر　　پریاں نہ اُتر آئیں پرستان سمجھ کر
گلے سے لگتے ہی جتنے گلے تھے بھول گئے　　مگر نہ یاد تھیں مجھ کو شکایتیں کیا کیا
خفا مت ہو مجھ کو ٹھکانے بہت ہیں　　مرا سر رہے، آستانے بہت ہیں

اب حافظ احسان کے بعض شاگردوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

الف- ذکی - یہ شاہ عالم بادشاہ کے زمانے کے احسان کے شاگردوں میں نامور ہوئے۔ قاسم نے ان کی بعض خوبیوں کا ذکر کیا ہے:

''میاں محمد ذکی خلف الصدق قاری محمد تقی، وے نوجوانیست، سعادت نشاں، ذکاوت تواماں، طالبعلم سراپا علم، میل ریختہ در سردارد و سخن خود بہ اصلاح حافظ عبدالرحمان احساں می رساند۔'' [11]

ان کا ایک شعر یہ ہے۔

میرا دل سودا زدہ اس میں سے نہ گر جائے　　کر زلف کو شانہ تو مری جان سمجھ کر

اس زمین میں احسان اور شاہ نصیر کی غزل بھی موجود ہے۔ شاید کسی طرحی مشاعرے کے لیے لکھی ہوگی۔

ب-ثابت- یہ اکبر شاہ کے زمانے کے شاگردوں میں سے تھے۔ شیفتہ نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''ثابت، مرزا معز الدین، کہین برادر مرزا احسن بخت بہادر، از حافظ عبدالرحمان خاں

احسان تہذیب سخن پرداختہ۔"12

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جگر میں درد ہے آنکھوں سے اشک آتے ہیں　　تڑپ کے پھوٹ گیا شاید آبلہ دل کا

دل کو تو لے کے مرے، مفت ہوا ہے بدنام　　اب میں کس طرح مروں تجھ پہ، بھرم جائے گا

اس قدر ادبے مروت مجھ سے استغنا تجھے　　جان دیتی تھی مجھے، پر دل نہ دینا تھا تجھے

سحر ہونے کے دھڑکے سے ہمارا ہے بدن ٹھنڈا　　کہ تیرا ہار موتی کا ہوا ہے سیم تن ٹھنڈا

ج- قمر - یہ نوجوان شاہزادوں میں سے تھے۔قلعہ معلیٰ میں رہتے تھے۔شاعری ان کے خاندان میں موروثی تھی چنانچہ شیفتہ کے تذکرے میں ہے:

"مرزا قمر طالع، میانہ پور۔مرزا ایزد بخش بہادر است کہ مرزا نیلے عرف ایشاں بود وکسب سخن از حافظ عبدالرحمان خاں احسان کردہ صاحب دیوان است۔"13

ان کے دو شعر یہ ہیں۔

نہ آئی تاب تو بھی دل کی بیتابی کے ہاتھوں سے　　قمر پہلو میں وہ رشک قمر ہوتا تو کیا ہوتا

بعد مدت خط لکھا ہے یار نو خط نے تجھے　　تو بھی اب تو اے قمر شکووں کا دفتر کھول دے

ان کا کوئی شعر صنعت سے خالی نہیں معلوم ہوتا اور اسے استاد کا فیض سمجھنا چاہیے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے قمر کے والد کو حافظ احسان کے اولین شاگردوں میں شمار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"ان (احسان) کی استادی کا سکہ ایک زمانے میں تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا نیلے کے استاد ہوئے۔رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہ تک رسائی ہوگئی۔"14

مرزا نیلے کا تخلص سلطان تھا اور وہ شاہ عالم کے بیٹے ہونے کی وجہ سے قلعہ میں ممتاز تھے۔ ان کا ایک مطلع یہ ہے۔

دور رکھ دورانِ سر سے گردش دوراں مجھے　　مت رکھ اے دیر خراب آباد سرگرداں مجھے

دیکھا جا سکتا ہے کہ حافظ احسان کے تقریباً سبھی تلامذہ کے یہاں زبان کی پختگی اور بیان کی شائستگی موجود ہے۔وہ سب شاعری کو عملاً صنعت گری سمجھتے رہے ہیں اور ان کے کلام میں صنائع

بدائع کے صرف کی طرف زور زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

2-سید- یہ بھی شاہ عالم ثانی کے عہد کے معروف شاعروں میں سے تھے اور جیسا کہ کہا جا چکا انھوں نے اکبر شاہ ثانی کا صرف ابتدائی زمانہ دیکھا تھا۔ پچاس سے کچھ اوپر عمر پا کر 1228ھ 1823 میں فوت ہوئے۔ لالا سری رام کا بیان ہے کہ:

''سید مرحوم نے 1228ھ میں انتقال کیا۔ نساخ نے 1218ھ میں وفات لکھی ہے، وہ غلط ہے۔''15

قاسم نے سید کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

''محب محبت نشاں میر غالب علی خاں سلمہ الرحماں میر منشی حضور والا لخاطب از چشگاہ خلافت بہ سید الشعرا کہ در آوان ☆ سالف غریب تخلص می نمود، پس ازاں چندے آں آشنائے بحر معانی آشنا تخلص کرد۔ در تعریض مثنوی مقترضے گوید ؎

آشنا میں خوش زبانِ گلشنِ تطہیر ہوں رجس کی آلودگی کوئی مجھ پہ کیا ثابت کرے
ہوں ازل کے روز سے میں پاک طینت ہی بنا ہے خطا اس کی ہی جو مجھ پر خطا ثابت کرے

بہر حال وے سید بیست بزرگ نہاد..... مقرب سریر خاقانی، واقف مریر سلطانی، خیلے خوش تقریر دشیریں مقال، بہ کتاب خوانی ایام تعزیہ التیام محرم الحرام یکتا و بے مثال، در انشا پردازی ید طولی دارد۔ بہ سخن طرازی صرف صنائع بہ درجۂ اعلیٰ رساند، بہر دو زبان سخن گوید۔ بسیار سیر مشق و خیلے بسیار گو.....''16

میر محمد خاں سرور کے تذکرے میں ان کا ذکر اس طرح آیا ہے ؎

''در علم انشا پردازی و سحر نگاری و شعر گوئی و شعر فہمی علم امتیاز بر افراشتہ و از اقران و امثال گوے سبقت ربودہ..... در اشعارش اکثر صنعت تضاد کہ آں را طباق ہم گویند مندرج ی باشد۔''17

شاہ عالم بادشاہ کے زمانے کا ان کا کچھ کلام یہ ہے ؎

☆ سالف = گزرا ہوا، اگلا

میں انھیں کون سی صورت سے نہ چاہا، پر آہ　　مجھ کو چاہیں نہ بتاں، یوں ہی خدا نے چاہا
زلف و کاکل، خط و خال، ابرو و چشم و گیسو　　اس دل زار کو کس کس نہ بلانے چاہا

لے کے دل مفت پھر مکرتے ہو　　تم بھی اچھے ہو واہ کیا کہیے
خون دل نے مے گل رنگ پلائی مجھ کو　　سیر باراں مژۂ تر نے دکھائی مجھ کو
دیکھ کس رنگ سے لیتا ہوں میں اے شوخ اٹھا　　گر لگے ہاتھ ترے پائے حنائی مجھ کو
میں ملوں آنکھیں، تو ٹھکرائے سر پا سے سر
ہے یہ حسرت ترے قدموں کی دہائی مجھ کو

تا وہ مہ بے مہر سر بام نہ آیا　　دردِ دلِ بیتاب کو آرام نہ آیا
نے غازہ، نہ گلگو نہ، نہ ہے رنگِ حنا تو　　اے خوں شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا
آرام زندگی ترے جانے سے اٹھ گیا　　جی دلبروں کے پاس بٹھانے سے اٹھ گیا

اوپر جو کلام نقل کیا گیا ہے بیشتر غالباً طرحی مشاعروں کا ہے کہ ان زمینوں میں معاصر شعرا کی غزلیں بھی موجود ہیں۔ ظاہراً اس زمانے تک طویل ردیفوں اور سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہنے کا چلن نہیں ہوا تھا۔ قاسم نے سید کو ''شاعر صنائع آما'' کہا ہے لیکن انھوں نے صنعت تضاد میں شعر کہنے کے لیے نام پایا تھا۔ سید اپنے وقت کے مسلم الثبوت استادوں میں سے تھے۔ ہر طبقے کے لوگ ان کے تلمذ سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ ذیل میں ان کے دو شاگردوں کا حال لکھا جاتا ہے:

1- سخنور

مغل بادشاہوں کے زمانے میں بھرد سے اور ذمہ داری کے مناصب پر عموماً ہندو اہلکار مقرر کیے جاتے تھے۔ یہ سخنور بھی ایسے ہی ایک باعزت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ قاسم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''سخنور تخلص، لالہ دیوالی سنگھ فرزند ارجمند رائے بچے سنگھ رائے منشی حضور پرنور (= شاہ عالم) است۔ وے جوانیست مودب و خلیق، قابل دوست شفیق، اوقات بہ خوشی می گذراند و شعر خود بہ سمع شاعر صنائع آما میر غالب علی خاں سید الخاطب بہ سید الشعرا می

رسائد۔18"

سخنور نے غالباً ساٹھ برس سے زیادہ عمر پائی تھی۔ انھوں نے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ کریم الدین کا کہنا ہے کہ:

"عمر ان کی 1847 (=1263ھ) میں کچھ اوپر ساٹھ برس کی ہے۔19"

ان کی ایک غزل کے کچھ شعر یہ ہیں ۔

گریاں رکھے ہے ابر ترے یہ چشم تر مجھے　　طوفان نوح آئے ہے اب پھر نظر مجھے
اس زلف ورخ کی یاد میں دل بیقرار ہے　　روتے ہی روتے گذرے ہے دو دو پہر مجھے
ہوتی عیاں ہے صورتِ ہستی ونیستی　　جوں نقشِ پا ہمیشہ سرِ رہگذر مجھے

2-طالب

یہ سید الشعرا کے خلف رشید تھے۔ شعر کم کہتے تھے لیکن اپنے والد کے طرز میں کہتے تھے اور اچھے کہتے تھے۔ قاسم کا بیان ہے کہ:

"طالب، میر طالب علی فرزند ارجمند سید الشعرا میر غالب علی خاں، وے جوانیست بسیار مہذب، بہ غایت مودب، خوش اختلاط، نیک ارتباط، باعلم پُر حیا، صاحب فہم بے ریا، گاہے فکر ریختہ ہی کند و اصلاح سخن از والد ماجد خودی گیرد۔"20

ان کی ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں ۔

جُو اشک مردم، اس کی آنکھوں کے سامنے سے　　میری نظر میں کوئی، بے آبرو نہ آیا
طالب رہا میں اس کے دیدار کا، پہ طالب　　مطلوب تھا جو میرا آئینہ رو نہ آیا

غالب علی خاں سید کے تلامذہ نے عموماً اپنے استاد کی اتباع کر کے ان کے طرز سخن کو رواج دینے کا کام کیا تھا۔

دلّی کے اس علمی ماحول میں جہاں سراج الدین علی خان آرزو اور مرزا محمد رفیع سودا جیسے باکمالوں کے فیض سے زبان کے محاوروں اور بیان و بدیع کے ضابطوں پر اصرار کیا جا رہا تھا، بعض شاعر ایسے بھی تھے جو فن کے اصولوں اور لغت کے قاعدوں کی پابندی کو غیر ضروری تکلف خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک مشاہدات کی بے تکلف عکاسی اور جذبات کی پُر اثر پیش کش ہی کو

شاعری کا حاصل و مقصود سمجھا جانا چاہیے تھا۔

3-شکیبا

ایسے شاعروں میں جو قلبی واردات اور ذہنی کیفیات کو موثر انداز سے نظم کر دینے کے دلدادہ تھے شکیبا کو امتیاز حاصل تھا۔ ان کے تعارف میں قاسم نے تو اتنا لکھا ہے کہ:

''شکیبا تخلص، شیخ غلام حسین است سلمہ، ربۂ، وے فقیر زادہ ایست، شایستہ مزاج وبسیار مودب، سلیم الطبع ونہایت مہذب۔ اگر چہ بہ عمدہ معاشی می برد (کذا) اما بنابر کساد بازاری بہ معقلی ایام بسر می کند۔ نسبت تلمذ بہ سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر دارد۔''21

میر محمد خاں سرور نے ان کی شاعری کے بارے میں رائے دیتے ہوئے، ان کی ملازمت کا بھی ذکر کیا ہے:

''شکیبا، جوانیست شایستہ، مودب و متواضع۔ کلامش رنگین و عاشقانہ و درد آلود، در زمرۂ شعرائے حضور والا (شاہ عالم) شرف ملازمت دارد۔''22

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

یاد اُس ساقِ بلوریں کی دلائی مجھ کو — شمع نے آگ نئے سر سے لگائی مجھ کو
جستجو اس کی جو کی، تجھ کو ہی پایا میں نے — کی دلِ گمشدہ نے را ہنمائی مجھ کو
مجھ میں طاقت نہیں اے عشق، سلامت ہر دم — دم بھی لینے دے کوئی آن تو بھائی مجھ کو

تجھ بن اے یار شکیبا کی بری حالت ہے
زندگی اس کی نہیں دیتی دکھائی مجھ کو

لالہ ساں بیٹھا اس چمن میں کون خوش دل اٹھ گیا — داغ بر دل اٹھ گیا، جو پائے در گل اٹھ گیا
نیم بسمل اس نے گر چھوڑا شکیبا غم نہیں — پر یہ غم ہے اعتبارِ دستِ قاتل اٹھ گیا
موزِ دل، دردِ جگر، کاوشِ غم، داغِ فراق — ہم پہ کیا کیا نہ ستم دوریِ جاناں میں رہا
دن نہ تجھ بن چین جی کو، شب نہ مجھ کو خواب ہے — تابشِ مہرِ قیامت جلوۂ مہتاب ہے
بیمارِ ہجر کو ترے، غم کھائے جائے ہے — جلد آ پہنچ، کہ سانس ابھی آئے جائے ہے
چنگا ہوں میں، طبیب، یہ امکان ہی نہیں — تو نبض دیکھتا ہے، یہاں جان ہی نہیں

یہ محض چند شعر ہیں غور کریں تو ان سے شکیبا کے یہاں عشق کے بدلتے ہوئے تصور کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قدما کے کلام میں حُسنِ مطلق کا ذکر تھا۔ یہاں حُسن سے آگے بڑھ کر حسین کا بھی ذکر ہے چنانچہ ایک شعر میں اس کی ''ساق بلوریں'' کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اس صورتِ حال کے مطابق طبیب کا کردار بھی سامنے آیا ہے اور اس کا عمل عام انسانی زندگی سے پوری طرح مطابق ہے۔ درد وسوز کے مختلف مضامین کو بھی اسی صورتِ حال سے مطابق کر کے دیکھنا مناسب ہے۔

اُن حالات میں جب زبان وبیان پر قدرت کو شعر گوئی کے لیے اہمیت دی جارہی تھی، شکیبا بھی اپنے کلام کو محاسن شعری سے آراستہ کرتے تھے۔ ان کے ایک شعر میں لفظ کیا (بروزن کا) اور کیا (بروزن دیا) کئی بار نظم ہوا ہے لیکن شعر میں نہ بے لطفی پیدا ہوئی ہے اور نہ کہیں حشو کا عیب آیا ہے۔ شعر یہ ہے ۔

ہمیں قتل تم نے کیا کیا، نہیں کہتے ہم کہ برا کیا　　یہ بھلا کیا پہ کہو گے کیا، جو کوئی کہے کہ یہ کیا کیا

الف۔ غمخوار۔

شکیبا بھی اپنے زمانے کے مسلم الثبوت استادوں میں سے تھے۔ قاسم نے ان کے ایک شاگرد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''غمخوار۔ سیدزادہ ایست، فرخندہ آغاز، مبارک فرجام..... سپاہی پیشہ، نیک اندیشہ، خوش خو، تازہ گو کہ مشق سخن از میاں غلام حسین شکیبای کندہ گاہ گاہ غزل طرحی سرنجام می دہد۔''[23]

ان کی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

آنسوؤں کے ساتھ آکر چشم میں دل رہ گیا　　بھر چکا یہ قافلہ جب میر منزل رہ گیا

کام آخر ہوگیا میرا بس اک تلوار میں　　مرتے مرتے دل میں شوقِ رقصِ بسمل رہ گیا

اٹھ سکا کوہ غمِ شیریں نہ جب فرہاد سے　　مار تیشہ سر میں، رکھ چھاتی پہ اک سل رہ گیا

میں ہی حیرانِ جمالِ یار کچھ تنہا نہیں
محوِ حیرت آئینہ بھی ہو مقابل رہ گیا

4۔ قاسم۔ اس زمانے کے معروف، صاحب تصانیف شعرا میں سے تھے۔ تلمذ کا سلسلہ خواجہ

میر درد سے ملتا ہے۔ اپنے بارے میں انھوں نے جو لکھا ہے، مختصراً اس طرح ہے:

''قاسم تخلص، سید ابوالقاسم عرف میر قدرت اللہ قادری، سلسلہ علیہ نسب آبائے کرام واجداد ذوی الاحترام کہ یکے از ایشاں سید اسماعیل غور بندی ودیگرے سید فاضل گجراتی کہ مزار ایں بزرگوار در گجرات بہ محلہ آہنگراں واقع شدہ، بہ جناب امامت انتساب حضرت امام موسیٰ رضا می رسد.....ایں احقر از بدو شعور بخدمت سراپا برکت مولانا محمد فخر الدین و مولوی خواجہ احمد خاں کسب علوم عقلیہ و اکتساب فنون نقلیہ می کرد واز خدمتِ شریف الحکما حکیم محمد شریف خاں مدظلہ بہ استفادہ فن شریف طبابت نمودہ واز ابتدائے سن تمیز خیال شاعری در سر دارد و استحصالِ طرز ایں فن از جناب ہدایت اللہ خاں ہدایت نمودہ، تا الیوم دیوان فراہم آمدہ و بیرون ازیں مثنوی در بحر مثنوی مولوی معنوی و مثنوی دیگر در بحر بوستان شیخ شیراز در کرامات محبوب سبحانی ہے''

قاسم نے شعرائے اردو کا ایک ضخیم تذکرہ فارسی زبان میں ''مجموعہ نغز'' کے نام سے لکھا تھا۔ اس کے بارے میں حافظ محمود خاں شیرانی نے لکھا ہے:

''یہ تالیف چھ سو تراسی ریختہ نگاروں کے حالات میں ہے۔ 1221ھ (= 1806) اس کی تاریخ اختتام ہے، اگرچہ اس سے بہت پہلے اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔''25

اور قاسم کی شاعری کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے:

''کثرت مشق نے کلام کو پختگی تک پہنچا دیا ہے مگر شاعری اس میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ ان کے پُر گو ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔''26

مولوی کریم الدین نے قاسم کے حالات میں اتنا اضافہ کیا ہے:

''صرف و نحو بقدر ضرورت اور علم طب خوب ان کو آتا تھا۔ محرم شریف میں کتاب شہادت سنایا کرتے تھے۔ عمر بہت بڑی پا کر 1246ھ میں انتقال فرمایا۔''27

کسی نے ''ساکن روضۂ جناں'' سے تاریخ نکالی۔

1830-31=(1246ھ)

اب ان کے چند شعر نمونہ کے طور پر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

یاد کرتے ہی تو آیا بزم میں اے شمع رو　　کیا بڑی ہے عمر، تیرا ہی ابھی مذکور تھا
یہ کہیے اب کہ بھول پڑے آج کس طرف　　اس طرف بارے آپ کا کیونکر گذر ہوا
ہم تو عشاق میں قاسم کو بھلا سمجھے تھے　　تم جو کہتے ہو بُرا ، خیر بُرا ہوویگا
جی ہے، آنکھیں ہیں، کلیجہ ہے، بغل ہے، دل ہے　　جون سا بھائے مکاں؛ کیجیے اُس میں ڈیرا
ہے عشق میں اس شوخ کے یاں خشک و تر آتش　　دل آتش و اشک آتش و خونِ جگر آتش
سینے میں اس انداز سے بھڑکے ہے دل اپنا　　مانگے ہے اسے دیکھ کے اب الحذر آتش
سر بسر قول ترا اے بتِ خود کام غلط　　دن غلط، رات غلط، شام غلط
غم، درد، رنج، محنت، آفت، ستم، قیامت　　فرقت میں تری دیکھیں بندہ نواز ساتوں
دشنام دے مناتے ہو روٹھے کو آن میں　　کیا جانے کیا فسوں ہے تمھاری زبان میں
دور بھی کیجیے کہیں روئے حسین کا پردہ　　یہ نکالا ہے بھلا تم نے کہیں کا پردہ
کام دل پاوے نہ تا عاشق بیدل پیارے　　آپ نے خوب یہ رکھا ہے، نہیں کا پردہ
ناصحا طرز محبت تری بھائی مجھ کو　　پر نصیحت یہ خوش آتی نہیں بھائی مجھ کو
نالہ برباد گیا، آہ ہے باقی سو کیا　　وہ بھی آتی ہے نظر باد ہوائی مجھ کو

قدرتِ کلام کے اظہار کے لیے قاسم نے لمبی ردیفوں اور مشکل زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں لیکن معمولاً انھوں نے سامنے کی باتوں اور عام خیالوں کو بول چال کی رواں اور سلیس زبان میں نظم کیا ہے چنانچہ برجستگی اور دلچسپی ان کے کلام کا امتیازی وصف ہے۔ ان کے اکثر شعروں میں ضرب المثل بن جانے کی لیاقت بھی موجود ہے مثلاً

شعلہ، شرار، اخگر، صد برگ، غنچہ، لالہ　　عاشق کے دل کو یارو، جو کچھ کہو بجا ہے
دن تو جوں توں کٹے ہے پر شب کو　　سخت دل بیقرار ہوتا ہے

قاسم کے بعض شاگردوں کا حال آگے لکھا جائے گا۔

5-فراق

یہ بقول حکیم قدرت اللہ خاں قاسم افاغنہ لودھی میں سے تھے۔[28] ہدایت اللہ خاں ہدایت

ان کے چچا تھے۔ یہ خود خواجہ میر درد کے مرید تھے۔ کبھی ان سے اور کبھی ہدایت سے اصلاح لیتے تھے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا بیان ہے کہ :

''دیوان ریختہ اش شستہ ورفتہ است۔ اکثر بانی صحبت مشاعرہ ہا او بود۔''29

میر محمد خاں سرور نے ان کی شاعری کے بارے میں رائے دی ہے کہ:

''در طرز بندی وصاف گوئی استادِ وقت خود ومشاق قدیم است وبسیار مردم استفادہ واصلاح شعر ازیں بزرگ می گیرند۔''30

انھوں نے شاہ عالم اور اکبر شاہ دونوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ کوئی ستّر برس کی عمر پا کر 1245ھ (=1829-30) کے قریب رحلت کی تھی۔ نواب مصطفا خاں شیفتہ نے لکھا ہے:

''فراق تخلص۔ از مشاہیر اہل سخن جہاں آباد است واز خواجہ میر درد ہم کسب باطن وہم کسب شعر نمودہ۔ در طب شایستہ مہارتے داشت۔ فکرش صاف وشستہ، طبعش خالی از اعوجاج واعتساف، وقائش را سالے چند آمدہ، صاحب دیوان است۔''31

زبان کی صفائی اور بیان میں سلاست کا حال یہ ہے کہ اکثر اشعار زبانوں پر جاری ہو جاتے ہیں۔ مضامین عموماً تصوف کے ہیں چنانچہ شاہ عالم ثانی کے زمانے کے ان کے چند شعر یہ ہیں۔

خنجر لو ہاتھ میں، نہ میاں تم کنار لو — اس صید ناتواں کو نگاہوں میں مار لو

یاران عدم سے کوئی کہہ دو کہ سدھاریں — ہم پیچھے چلے آتے ہیں، ہم کو نہ پکاریں

غیر کے دل میں نہ جا کیجے گا — میری آنکھوں میں رہا کیجے گا

زائرانِ حرم و دیر کبھو — میرے حق میں بھی دعا کیجے گا

گو جان سے جاوے تو فراق اس کے الم میں — پر دیکھیو تو نے جو کبھی آہ نکالی

سمجھائے کسی کے بھی سمجھتے ہیں دوانے — کیوں پاؤں میں پڑتی ہے سلاسل نہیں معلوم

چند شعر بعد کے زمانے کے یہ ہیں۔

گالیاں ہیں کہ پھول جھڑتے ہیں — ذکر یہ مہربان ہے کس کا

تیکھا ہے، نکیلا ہے، طرحدار ہمارا — اے سروچمن دیکھ یہ ہے یار ہمارا

صاف دل کو کیا، اور داغ جگر کو دھویا — کام کیا کیا نہ مرے دیدۂ تر سے نکلا

یار کا حسن جو میزان خرد میں تولا ہے کئی درجہ یہ ان شمس وقمر سے بہتر
آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں بھولے سے اس نے یاد کیا، عجب نہیں
دامن تلک گیا تھا کہیں اس کے دستِ وہم اللہ رے ناز کی وہیں چولی مسک گئی

فراق کے یہاں بھی کہیں کہیں حسین (= شخص) اور اس کے ملبوس وغیرہ کا ذکر موجود ہے اور یہ صورت ان کے بعض معاصروں کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں دلی میں عشق کے تصور میں تبدیلی کی صورت رونما ہونے لگی تھی۔

(2)

شاہ عالم ثانی کے آخر زمانے میں حالات نے جو رُخ اختیار کرلیا تھا اکثر شعرا، اُسی پر چلتے رہے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں کوئی بڑا ہنگامہ نہیں ہوا اور نہ کوئی خاص تبدیلی رونما ہوئی۔ شاہ عالم کے دور میں الگ الگ استادوں کے فیض تربیت سے نئی نسل کے شاعروں کے انفرادی مزاج اور ذاتی حالات کے مطابق ان کی شاعری کا جو انداز وجود میں آگیا تھا، اکبر شاہ کے وقت میں اسی میں پختگی آگئی تھی۔ اکبر شاہ کے عہد کے بعض معتبر اور موثر استادوں کا اختصار کے ساتھ یہاں تعارف کرایا جاتا ہے:

6- عشق

یہ قدرت اللہ خاں قاسم کے فرزند ارجمند تھے، چنانچہ باپ نے بیٹے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

"برخوردار کامگار، فرزند سعادت نشاں، میر عزت اللہ مدعمرہ، وے جوانیست صالح، عقبا دوست، دنیا دشمن، شیریں کلام، سلیم الطبع، مستقیم مزاج، حافظ قران شریف، صاحب طبع ظریف، در فن طبابت ید طولیٰ دارد..... زور شاعری وے از اشعارش پیداست وقوت سخنوری وے از کلام صحت نظامش ہویدا۔"32

میر محمد خاں سرور کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں یہ اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔ لکھا ہے:

"بہ سبب موزونی طبع قابلیت کہ ارشاد دارد، فکر شعر گوئی می کند و از نظر والد خودی گزراند۔"33

اس ابتدائی مشق کے ان کے چند شعر یہ ہیں ۔

اشک اور لخت جگر کا نہیں انبار لگا　　خانۂ چشم میں ہے جو ہری بازار لگا
سبز خط کی دل سے الفت ہم اٹھا سکتے نہیں　　جو خدا نے لکھ دیا اس کو مٹا سکتے نہیں
تم غیر کے گھر بیٹھ کے دل شاد کرو گے　　ہم کون ہیں، صاحب ہمیں کیوں یاد کرو گے
کل مرقع میں جو دیکھا غنچۂ تصویر کو　　یاد کر، رویا بہت اپنے دلِ دلگیر کو

اس نومشقی میں بعض مصرعے بہت صاف اور رواں نکل گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر گوئی کا ملکہ خداداد تھا۔ کچھ مدت کی مشق کے بعد غالباً اپنے والد کے مشورے سے میر عزت اللہ نے فراق کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ اس کا ذکر نواب شیفتہ نے اس طرح کیا ہے:

"عشق تخلص، حکیم عزت اللہ خاں، خلف الصدق حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، از معتبران دہلی است۔ بارقم اتحاد موفور دارد۔ اصلاح شعر از حکیم ثناء اللہ خاں فراق گرفتہ واز والد ماجد خود نیز استفادہ کردہ۔ در فن طب دستے بلند دارد۔ مرد سنجیدہ و متین است وصاحب دیوان..... بہ زعم فقیر اکثر اشعارش سزاوار رقم است۔" 34

اس سے ظاہر ہے کہ عشق اکبر شاہ ثانی کے عہد کے معتبر استادوں میں شمار ہوتے اور ان کا کلام پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ عشق نے بہادر شاہ ثانی کی بادشاہت کے بھی ابتدائی دو ایک سال دیکھے تھے مولوی کریم الدین نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ شخص بہت نیک بخت اور اچھے شاعر ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔ قریب پانچ یا سات برس کے ہوئے کہ یہ فوت ہوئے۔" 35

ان کے کچھ شعر نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں ۔

ترا اے صانعِ تقدیر ہم نے کیا بگاڑا تھا　　کہ اس نازک بدن کا دل بنایا سنگِ خارا سا
تجھ کو خبر نہیں بتِ خود کام اب تلک　　آیا کبھی کا دل تو مرا کام اب تلک
رسوائے خلق تو نے محبت کیا مجھے　　میرا نہ جانتا تھا کوئی نام اب تلک

پھر اپنے جاگے نصیب دلبر، ہوئے ہیں جو بارِ دیگر
وہ چشم میگوں، یہ دیدۂ تر، ادھر ہمارے، ادھر تمھارے

خال واں مکھڑے پہ ہر بار بنے بگڑے ہے یہاں سویدائے دلِ زار بنے بگڑے ہے
تختۂ سینہ پر اپنے مژۂ پُرخوں سے یک قلم چھینٹ فلکار بنے بگڑے ہے
دل کے ٹکڑوں سے کبھو پُر ہے، کبھو خالی ہے
روز یہ آئینہ بازار بنے بگڑے ہے

کلام میں سلاست اور روانی کا وصف نمایاں ہے۔ مضامین میں بھی دقت اور پیچیدگی نہیں ہے۔ کبھی مشاعروں کے لیے اور کبھی زورِ طبیعت اور مشاقی کے اظہار کے لیے لمبی اور مشکل ردیفوں میں بھی غزلیں کہی ہیں لیکن ایسی غزلیں بھی لطف سے خالی نہیں ہیں۔

7-مائل

شاہ عالم ثانی کے زمانے میں دہلی میں شاہ محمدی مائل ایک شاعر ہوئے۔ ان کا یہ شعر مشہور تھا۔

جیا جو ہجر میں، سو وصلِ یار دیکھے گا جو اس خزاں سے بچے گا، بہار دیکھے گا

اپنے زمانے کے استادوں میں سے تھے۔ انھوں نے دو شاگرد ایسے چھوڑے کہ انھوں نے استاد کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا چنانچہ قاسم نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''مائل، شاہ محمدی، نسبت تلمذ بہ میاں قیام الدین علی قائم داشت و استادِ بھورے خاں آشفتہ و محمد نصیر الدین نصیر است۔''36

8-آشفتہ-

حکیم قدرت اللہ قاسم نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''آشفتہ، عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں، وے جوانیست خوش فکر، شیریں زبان، عالی طبیعت، فصاحت بیان، غزل طرحی از دخوب سرانجام می یافت و بہ فصاحت می نگاشت و طرح سراختہ بہ خانۂ خود چندے انداخت و دل جویہائے اہل سخن بہ درجہ اعلیٰ نمود۔ بعد یک چندے..... ترک شاعری نمود و توجہ موجہ بہ زہد و ورع فرمود۔ گاہ گاہ شعر صوفیانہ موزوں می کند و در مقطع ہر غزل رعایت للتخلص مضمون زلف بمعنی لازم گزیدہ و شعرش بہ اصلاح شاہ محمدی مائل رسیدہ۔''37

ان کے کلام میں عموماً جوگ اور تصوف کے مضامین نظم ہوتے تھے۔ چند شعر یہ ہیں۔

جام گدائی ہاتھ میں لے، نت سانجھ سویرے پھرتے ہیں۔
شمس وقمر یہ دونوں بھکاری، حُسن کے تیرے پھرتے ہیں
جو گ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک ان زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیرے پھرتے ہیں

سر رشتۂ محبت ہم سب سے توڑ بیٹھے — اپنا سر آپ اپنے زانو سے جوڑ بیٹھے
برگشتہ بخت ہم سے دیکھے ہیں کم کسی نے — جب ہم ہوے مقابل وہ منہ کو موڑ بیٹھے
جو چاہو حسنِ عدیم المثال کو دیکھو — تو لے کے آئینہ اپنے جمال کو دیکھو
نبیؐ کو خاطر اصحاب کیوں نہ ہو منظور — کہ زیب و زینتِ مجلس ہے چار یاروں سے
ناخواندہ مرے خط کو الٹا ہی پھرالایا — قاصد کی خطا کیا ہے، قسمت کا لکھا لایا
آفت ہے، قیامت ہے، بھبھوکا ہے، پری ہے — عالم سے نرالی یہ تری جلوہ گری ہے

آشفتہ شاعروں کے شاعر تھے۔ خود بھی اپنے گھر پر مشاعرہ کرتے تھے اور میر محمد خاں سرور کے بقول :

''اکثر در مشاعرہ مہدی علی خاں مرحوم داردی شد۔''38

مشاق اور قادرالکلام تھے۔ طرحی غزلیں خوب کہتے تھے۔ طرحی مشاعرے میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری تھا کہ کیسی ہی مشکل اور سنگلاخ زمین ہو، اس میں غزل کہہ لی جائے۔ آشفتہ اس اعتبار سے کامیاب اور نام برآوردہ تھے۔

آشفتہ کی زبان بول چال اور روزمرہ کے مطابق تھی۔ محاوروں کے صرف سے اسے پُر لطف بنا لیتے تھے۔ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ہندستانی اصل کے الفاظ، جہاں موقع دیکھتے، بے تکلف لے آتے تھے۔ مذہب پسندی کا فائدہ یہ تھا کہ عموماً خیالات صاف ستھرے اور ابتذال سے پاک ہوتے تھے۔ بیان میں دقت اور پیچیدگی بھی نہیں ہوتی تھی۔

9۔ نصیر

شاہ نصیر نے بھی شاہ عالم ثانی کے زمانے میں شاعر کی حیثیت سے نام پیدا کرلیا تھا۔ قدرت اللہ قاسم نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''شاہ نصیر الدین دہلوی عرف میاں کلو، پدر والا قدر وے کہ شاہ غریب نام داشت، بہ
دلق فقرا آراستہ، بہ لباس درویشاں پیراستہ، پرورش دادۂ زبدۂ صوفیانِ زماں حضرت
میر جہاں قدس سرہ بود.... وایں محمد نصیر الدین بسیار با ناز و نعمت پرورش یافتۂ والد
ماجدش..... بعد رحلت آں صاحب اقتدار، ایں ستودہ کردار شوق ریختہ گوئی بہم
رسانیدہ، شاگرد شاہ محمدی مائل کہ بہ نسبتِ خویشی بہ آں مرحوم داشت گردیدہ، سلسلۂ تلمذ
وے بہ دو واسطہ کہ مائل و قائم بود بہ مرزا سودا می رسد و بہ اعتبارے بہ ہمیں دو واسطہ و بہ
اعتبار دیگر بہ سہ واسطہ کہ قائم شاگرد ہدایت ہم ہست، بہ خواجہ میر درد می پیوندد۔ بہر
کیف وے اگر چہ از احوال فن و قواعدِ سخن چنداں آگہی نہ دارد، لنا مناسبت کلی بہ سخن
پردازی دارد، بنا بر تناسب طبعی و میر مشقی سخنش نغز و بہ سبب کثرت فکر و بسیاری توغل
کلامش پُر مغز معلوم می شود۔ اکثرے از تازہ مشقاں نسبت تلمذ بہ وے دارند..... خیال
شاعری چناں در نہادش جاگرفتہ کہ تا سودا و میر در نظرش نمی سنجد تا بہ دیگراں چہ رسد.....
خود را ملک الشعرا پندارد''39

شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ہی شاہ نصیر استادی کے درجے کو پہنچ گئے تھے اور ان کے احباب ان کے کلام کی ستائش کرنے لگے۔ ان کے استاد بھائی آشفتہ کا حال اوپر لکھا ہے۔ ایک مقطع میں شاہ نصیر نے کہا ہے ۔

غزل نصیر کی اب تو بقول آشفتہ رکھے ہے مطلعِ خوش انتخاب سے نسبت

اس قسم کی تعریفوں نے شاہ نصیر کے حوصلے بلند کر دیے اور ان کے دل میں ملک الشعرا کہلانے کا خیال موج مارنے لگا۔ اپنی غزلوں میں شاہ صاحب تعلّی کے مضامین نظم کرنے لگے۔ ذیل میں محض ایک غزل کا مطلع اور مقطع لکھا جاتا ہے ۔

نکلے شانے سے تری زلف گرہ گیر کے پر آج تک ہم نے نہیں دیکھے تھے زنجیر کے پر
کیا غزل اب کوئی یکدست لکھے ایسی نصیر راستی یوں ہے کہ جلتے ہیں یہاں میر کے پر

اس زمانے کے شاہ نصیر کے چند اشعار یہ ہیں ۔

میں نے بٹھلا کے جو پاس، اس کو کھلایا بیڑا قتل پر میرے رقیبوں نے اٹھایا بیڑا

اے نصیر اس کے گلے کا ہوں نہ میں کیونکر ہار　　آج گلرو نے مجھے دیکھ، چبایا بیڑا
پشتِ لب پر ہے تری یہ خطِ ریحاں ایسا　　منہ تو دیکھو، لکھے یاقوت رقم خاں ایسا
اس کے ابرو پہ ذرا مدِّ نظر کچھ نصیر　　کیا ہلالی کا ہے مطلع سرِ دیواں ایسا

اس زمانے کے ایک دو غزلے کے مطلعے اور مقطعے اس طرح ہیں۔

پہلو میں رکھ اس تیر کے پیکان کا لوہا　　اے دل دہ نگہباں ہے تری جان کا لوہا
اس بحر میں اک اور نصیر اب تو غزل لکھ　　سب مانتے ہیں تجھ سے سخندان کا لوہا
کیا دیکھوں ترے خنجرِ بران کا لوہا　　بیدم کرے ہے دم میں اس عنوان کا لوہا
لازم ہے نصیر اس کو کرے آئینہ ساں صاف　　سختی میں ہو گر دل کسی انسان کا لوہا

شاہ نصیر کا اسی زمانہ کا ایک مطلع بہت مشہور ہوا۔ اس کے بارے میں رنگین نے ایک واقعہ اس طرح قلمبند کیا ہے:

"مرزا سبحان قلی بیگ فرمودند کہ دریں ایام در شاہجہاں آباد بلکہ در دیگر جاہا نیز برابر میاں نصیر صاحب کے شعر ہندی تہ دار و دقیق و مشکل نمی گوید۔ گفتم، بلے، دریں کار یگانۂ زماں و بے بدل روزگارند۔ فرمودند کہ مطلع اوشاں می خوانم، چیزے قباحت اگر بتوانند برآرند۔ گفتم مشقِ اوشاں، ایں قسم نیست کہ دراں جائے سخن باشد و سوائے ایں در خدمتِ اوشاں بندگی دارم۔ چوں اوشاں قسم دادہ، ایں مطلع خواندند

چرائی چادرِ مہتاب شب میکش نے جیحوں پر　　کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

ناچار شدہ گفتم کہ ایں مطلع بہ از مطلعِ آفتاب است لیکن مرا دریں تامل است کہ چادر مہتاب را میکش بر جیحوں چگونہ دزدید؟ اگر بجائے میکش لفظ بادل می بود البتہ بہتر بود..... سبب ایں است کہ ہرگاہ ابر بر ماہ می آید البتہ چادر مہتاب نمی ماند گویا دزدیدہ می شود۔ بطور لطیفہ عرض کردم مضمون از عالم بالا دوزد بر زمیں، یعنی چہ قصہ زمیں بر سر زمیں، مضمونِ عالم بالا را دوزد ہم آسمانی بایستے۔

مختصے ایں سخن بہ میاں نصیر صاحب رسانیدہ، اوشاں شنیدہ از بندہ آزردہ خاطر شدند۔ ہارے بہ ہزار خرابی در چند مدت تصفیہ نمودم۔"40

مولانا محمد حسین آزاد نے اس بارے میں لکھا ہے کہ:

"مگر میرے نزدیک شاہ صاحب نے کچھ نامناسب نہیں کہا۔ چاند آسمان پر ہوتا ہے چاندنی زمین پر ہوتی ہے اور چاندنی کا لطف میکش اڑاتا ہے۔ بادل کیا اڑائے گا اور میکش نہ ہوگا تو شعر غزلیت کے رتبہ سے گر جائے گا۔" 41

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس زمانے میں شعر گوئی کا فن کتنا مشکل تھا۔ شاعر تو ایک ایک لفظ پر غور و فکر کرتا ہی تھا، سخن شناس بھی معنی کے ہر ہر پہلو پر نگاہ کرتے تھے اور بات میں سے بات نکالتے تھے۔ وہ نکتہ سنج، نکتہ شناس اور نکتہ آفریں تھے اور انھیں اپنے کمال پر فخر کرنے کا حق حاصل تھا۔

شاعروں کے درمیان معرکہ آرائیوں کی روایت خاصی قدیم ہے۔ شاہ عالم کے زمانے کے بعض شاعروں نے شاہزادوں کی حمایت اور تائید سے فائدہ اٹھانا چاہا تو ایک شاعر شیخ ولی اللہ محب نے یہ قطعہ پڑھا ۔

مجلس میں چکے، چاہیے جھگڑا شعرا کا　　اس فن کے کسو صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا　　اکبر تئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

اس سے شاعر کی اخلاقی جرأت اور علمی غیرتمندی کے ساتھ ساتھ، خود بادشاہ کی علم دوستی اور انصاف پسندی بھی ظاہر ہے۔ کلمۂ حق کے اس طور پر اعلان کی مثالیں بہت نہیں ملتیں اس لیے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ بعد کے زمانے میں سلطنت کے وقار کے ساتھ علم و دانش کے معیار پر بھی انحطاط آیا اور وہ کچھ معمول بن گیا جس پر ولی اللہ محب نے احتجاج کیا تھا۔

شعری معرکوں میں اپنی مشاقی اور قدرت کلام کو ثابت کرنے کے لیے شاعروں نے دو غزلے کہنے شروع کر دیے۔ کبھی کبھی سہ غزلے اور شاذ و نادر چہار غزلے بھی کہے گئے تھے۔ شاہ نصیر کے کلیات میں آٹھ دس سہ غزلے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک کے مطلعے اور مقطعے یہاں لکھے جاتے ہیں ۔

ہمارے مہ جبیں کو شوق ہے زلفیں بنانے کا　　فلک تو پنجۂ خورشید سے لے کام شانے کا
نصیر اس بحر میں اب دوسری لکھ کر غزل پڑھیے　　تمھارا کام ہے مضمون نو کے باندھ لانے کا

نہ پوچھ اب ماجرا مجھ سے تو کچھ آنسو بہانے کا　　کہ اے خورشید رو، پایا مزا آنکھیں لڑانے کا
غزل پڑھ تیسری بھی اے نصیر اب بزم یاراں میں　　یہی تو وقت ہے اپنی زباں دانی دکھانے کا
نیا اک رنگ تیرے ہاتھ آیا ہے بہانے کا　　ہوا معلوم باعث ہاتھ میں مہندی لگانے کا

نصیر اک دن جو میں نے خادمانِ عشق سے پوچھا
سبب سروِ چمن پر کیا ہے قمری کو بٹھانے کا
تو وہ بولے کہ طوق اس نے نہیں بے وجہ پہنا ہے
یہ عاشق ہے، اسے ہے حکم سولی پر چڑھانے کا

دوغزلوں، سہ غزلوں سے اپنی قدرت کلام کا اظہار مطلوب ہوتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہی جانے لگیں اور اسی طرز خاص میں شاہ نصیر نے نام پیدا کیا چنانچہ شیفتہ نے لکھا ہے:

''نصیر تخلص، شاہ نصیرالدین، سجادہ نشین یکے از خلفاے شاہ صدر جہاں علیہ الرحمہ والغفران است۔ از مدت شصت سال بر سر عشق ریختہ است..... باشعراے مشتہر ہر دیار برخوردہ و مطارحہ و مشاعرہ کردہ و بہ استادی نام برآوردہ، ہنگام قیام جہاں آباد بہ تاریخ پانزدہم و بست و نہم ہر ماہ محفل مشاعرہ منعقدی سازد و زمیں ہاے سنگلاخ طرح می کند با فقیر تعارف و شناسائی دارد، مرد نیک و صاحب صفات حسنہ است۔''42

شاہ نصیر مشاعروں کو ''زباں دانی دکھانے'' کا موقع کہتے تھے اس لیے معرکہ آرائیوں کے سلسلے بھی یہیں شروع ہوتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے کے ایک معرکے کا حال مولانا محمد حسین آزاد نے اس طرح نقل کیا ہے :

''شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا.... شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نوشعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی :

' آتش و آب و خاک و باد '43

وہ غزل سنائی انھوں (ذوق) نے اس پر غزل پڑھی۔ اس پر کچھ اعتراض ہوئے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا.... مطلع تھا ۔

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد　　آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک و باد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہے تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی۔

معترض نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ: مشاہدہ

اس نے کہا کہ کتابی سند دو۔

انھوں نے کہا کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔

اس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ شعر میں نہیں چلتی.....

شیخ علیہ الرحمہ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا۔

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم　　آتش بہ سنگ بود کہ ماخانہ سوختیم" 44

شاہ نصیر کی غزل کے چار شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

کیوں نہ کہیں بشر کو ہم آتش و آب و خاک و باد　　قدرت حق سے ہیں بہم آتش و آب و خاک و باد

اخگر غنچہ، آبِ جو، گردِ چمن، نسیم صبح　　ہیں یہ گرہ کشائے غم آتش و آب و خاک و باد

برق و سحاب و گرد باد، دشتِ جنوں میں ساتھ ہیں　　ہیں یہ مرے رفیقِ دم آتش و آب و خاک و باد

کیوں نہ حواس خمسہ گم　　اہل سخن کے ہوں نصیر

تجھ ہی سے بس ہوے رقم　　آتش و آب و خاک و باد

ان معرکوں کے سوال و جواب پر خیال کریں تو اندازہ ہوگا کہ اُس زمانے میں شاعری عوام کی چیز نہیں تھی۔ اسے ایک ایسے فن کا درجہ حاصل ہوگیا تھا جس کا تعلق خواص بلکہ صاحبان علم و دانش سے تھا۔ شاہ نصیر کی شاعری کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

" زبان شکوہ الفاظ اور چستی ترکیب میں سودا کی زبان تھی اور گرمی ولذت اس میں خداداد تھی۔ انھیں اپنی نئی تشبیہوں اور استعاروں کا دعوا تھا اور یہ بجا تھا۔ نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے

شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے.....بعض الفاظ مثلاً تک، واچھڑے، تس پر وغیرہ جو سید انشا اور جرأت تک باقی تھے انھوں نے ترک کیے مگر آئے ہے اور جائے ہے وغیرہ افعال انھوں نے بھی استعمال کیے.....طبع موزوں گویا ایک درخت تھا کہ جب اس کی ٹہنی ہلاؤ فوراً پھل جھڑ پڑیں گے۔ وہ نہایت جلد اصلاح دیتے تھے اور برجستہ اصلاح دیتے تھے..... پڑھنے کا انداز بھی سب سے الگ تھا اور نہایت مطبوع طبع تھا۔ آواز میں بڑھاپے تک بھی جوانی کی کڑک دمک تھی۔ جب مشاعرے میں غزل پڑھتے تو ساری محفل پر چھا جاتے تھے۔ اپنا کلام انھیں خود بے اختیار کر دیتا تھا۔ ایک مشاعرے میں جب قطعہ مذکورہ ذیل پر پہنچے تو شعر پڑھتے تھے اور مارے خوشی کے کھڑے ہوئے جاتے تھے۔

یہ مجنوں ہے، نہیں آہو ہے لیلیٰ پہن کر پوستین نکلا ہے گھر سے
جسے تو سینگ سمجھے ہے یہ ہیں خار لگے ہیں پاؤں میں، نکلے ہیں سر سے"45

اب شاہ نصیر کی چند غزلوں کے متفرق اشعار نقل کیے جاتے ہیں ۔

ہے بو قلموں جلوۂ داغ پر طاؤس روشن رہے یارب یہ چراغ پر طاؤس
صحرا میں جو ہے دام لیے موج رگ ابر کیا آج ہوا پر ہے دماغ پر طاؤس
ڈھونڈھے ہے جو مرقد پہ شہیدوں کے نصیر اب
کیا اُڑ گیا گلشن سے سراغ پر طاؤس

سدا ہے اِس آہ و چشم تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو تک اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نصیر لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سن کے جس کو
بندھے ہے کب یوں کسی بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نصیر صد آفریں ہے تجھ کو کہ اہل معنی پکارتے ہیں
عجب ہے مضمون تازہ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

شب کو کیونکر تجھ کو پھبتا سر پر طرہ ہار گلے میں
جوں پروین وہالۂ مہ تھا سر پر طرہ ہار گلے میں

دیکھ، جانے دے، پہن مت آسمانی چوڑیاں ہالۂ مہ پر ستم ڈھائینگی خانی چوڑیاں
تیرے ہاتھوں سے کرے پرواز کیونکر مرغ دل حلقۂ دام بلا کی ہیں نشانی چوڑیاں
شاخ گل پر عشق پیچاں کی کبھی لپٹے نہ بیل تو جو پہنے سروقد ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں
دیکھ تو آنکھوں کی اندھی کچھ بھی ہے تجھ کو شعور یہ تو میری نوجوانی اور پرانی چوڑیاں

دسترس اس کی کلائی تک ہو کیونکر اے نصیر
میل سے آتی نہیں مجھ کو لگانی چوڑیاں

ٹانکوں سے زخم پہلو لگتا ہے کنکھجورا مت چھیڑ میرے دل کو، بیٹھا ہے کنکھجورا

ان سبھی غزلوں کی ردیف ایسی ہے جو کسی مربوط اور منضبط نظم کا عنوان بن سکتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ شاعر کسی متعین ردیف (جسے عنوان یا موضوع بھی کہا جاسکتا ہے) سے متعلق الگ الگ اور بجائے خود مکمل شعر کہنے کی فکر کرتا تھا۔ کبھی کبھی مضمون اتنا پھیلا ہوا ہوتا تھا کہ وہ غزل کے ایک شعر میں نہیں سماتا تھا اس لیے بات کو مکمل کرنے کے لیے ایک سے زائد شعر کہنے پڑتے تھے۔ اسی موقع پر شاعر کو کہنا پڑتا تھا کہ ؎

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

شاہ نصیر نے اسی وسعت کے مطالبے سے مجبور ہو کر اپنی غزلوں میں قطعے شامل کرنے شروع کر دیے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ایک موقع پر لکھا ہے:

''شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے۔''46

یہ صحیح نہیں ہے۔ کلیات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نصیر اپنی غزلوں میں کبھی دو، اور کبھی تین قطعے کہتے تھے۔ بعض بعض غزلوں میں انھوں نے چار چار قطعے بھی شامل کیے ہیں اور بعض بعض قطعے دو شعروں سے زائد پر بھی مشتمل ہوتے تھے مثال کے طور پر ایک غزل کا مطلع یہ ہے ؎

گر تصور کمر یار کا باندھا ہوتا بیضۂ چشم سے پیدا مرے عنقا ہوتا

ان میں چار قطعے ہیں۔ ایک قطعہ چار شعروں کا اس طرح ہے ؎

کیا کہوں میں، مری آنکھوں کی اگر کیفیت ہوتی معلوم تو ان میں ترا رہنا ہوتا

ہر طرف موجزن آتا ہے نظر اک دریا ابرِ مژگاں بھی مری جان برستا ہوتا
سوجھتا اور نہ کچھ تجھ کو بجز بادہ کشی روبرو تیرے دھرا ساغر دینا ہوتا
صبح سے شام تلک پتلیوں کا رہتا ناچ
عالمِ نشہ میں تو محوِ تماشا ہوتا

غزل کے لیے اُس قسم کی ردیفوں کا اختیار کرنا، پھر مضامین شعری کو ایک سے زائد شعروں پر مشتمل قطعوں میں نظم کرنا غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر اردو میں نظم نگاری کی طرف اقدام تھا۔ یہی اقدام بہ تدریج ترقی کرتا گیا اور وہ دن بھی آیا جب شاہ نصیر کے شاگرد ذوق کے ایک شاگرد (محمد حسین آزاد) نے بعض مخصوص حالات میں اردو میں نظم نگاری کی باضابطہ روایت قائم کی۔ محرومی یہ ہے کہ اس پہلو کی طرف تا حال اہلِ تحقیق نے توجہ نہیں کی ہے۔

شاہ نصیر کی غزلوں کی ردیفوں پر نظر کریں تو یہ حقیقت بھی بہت قطعیت کے ساتھ سامنے آئے گی کہ ان کے یہاں محبوب عموماً کوئی گوشت پوست کا انسان ہے اور کسی زندہ شخص کے جو اور جیسے معاملات ہوتے ہیں، ان کے کلام میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں مثالاً محض چند غزلوں کے مطلعے نقل کیے جاتے ہیں ؎

مرے ایفائے وعدہ پر جو شب دلدار اٹھ بیٹھا سنو شامت نصیبوں کی کہ چوکیدار اٹھ بیٹھا
غرق نہ کر دکھلا کر دل کو، کان کا بالا زلف کا حلقہ
بحرِ حُسن کے ہیں یہ صنوردد، کان کا بالا زلف کا حلقہ
شب جو رخِ پُر خال سے وہ برقع کو اتارے سوتے ہیں
چشم قمر لگتی ہی نہیں کیا بلکہ نہ تارے سوتے ہیں
لپٹی جو بلا ہے اس پری رخسار کی چوٹی دل شامت زدہ مت چھیڑنا تو یار کی چوٹی

آخری دو مطلعے تو بہت واضح ہیں لیکن غور کریں تو چاروں ہی مطلعے محبوب کے جنسِ اناث سے متعلق ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کلام سے چشم پوشی کر کے بعض لوگ جو اردو شاعری کو امرد پرستی کے لیے الزام دیتے ہیں، ان کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس آئینے میں وہ اپنی صورت دیکھتے ہیں۔

شاہ نصیر کی ایک غزل کا مطلع اور مقطع ذیل میں نقل کیا جاتا ہے ۔

شب کا بکشاں کا نہیں زرتار کا پٹھا ہے گردن گردنِ سنگار کا پٹھا
لکھی ہے نصیر ایسی غزل تو نے کہ جس کے ہر شعر میں ہے معنی تہ دار کا پٹھا

مقطع میں اس غزل کے ہر شعر کی جس خوبی کا فخریہ ذکر کیا ہے، شاہ نصیر کے کلام میں اس کی نشاندہی سب سے پہلے سعادت یار خاں رنگین نے کی تھی چنانچہ ان کا بیان پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اس خوبی کی طرف بھی جدید دور کے ناقدین نے ہنوز توجہ نہیں کی ہے۔

(3)

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں شاعروں کی جو نئی نسل سامنے آئی تھی، اس میں سب سے بڑی تعداد شاہ نصیر کے شاگردوں کی تھی اور ان میں سب سے زیادہ موثر شخصیت ولی عہد بہادر مرزا ابوظفر ظفر کی تھی۔ نئے پرانے سبھی شاعران کے دربار میں جمع ہوتے تھے اور اس زمانے کے کئی استادوں سے انھوں نے کسبِ فیض بھی کیا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ذوق کے حالات میں ضمناً ان کا ذکر بھی کر دیا ہے۔

10-ظفر

28 شعبان 1189ھ/1775 کو پیدا ہوئے تھے اور اپنے دادا شاہ عالم ثانی کے زمانے کو بخوبی دیکھا تھا۔ انھوں نے اساتذۂ قدیم کی صحبتیں اٹھائی تھیں اور شاعر کی حیثیت سے خود بھی معروف ہو چکے تھے۔ میر محمد خاں سرور نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"ظفر تخلص، مرشد زادۂ جہانیاں ولی عہد میرزا ابوظفر بہادر، تعریف و توصیف فصاحت و بلاغت کہ در اشعار طبع زاد آں گوہر والائے دریائے سلطنت مندرج باشد، کار قلم حقایق نگار ایں است کہ ثبت نماید بلکہ ازاں بالاتر ست کہ کسے در خیال آرد۔ اکثر قصائد فیض ناخن زن دلہاست....."47

قدرت اللہ قاسم نے بھی ان کی صلاحیتوں کی تعریف کی ہے اور ان کے تلمذ کا بھی ذکر کیا ہے:

"ظفر تخلص، شاہزادہ والا قدر مرزا ابوالمظفر بہادر خلف الصدق مرشدزادہ ولی عہد والا

جاہ مرزا اکبر شاہ بہادر است، آدم شناس، صاحب قیاس، ہوشیار، ستودہ کردار، اعلا منش، والا روش واقع شدہ، شوقِ ایں فن شریف بسیار در سردارند و اکثرے از اوقات ہمایوں بہ سخن سازی و نکتہ پردازی ہمت می گمارند۔ اگر چہ دُرہائے ریختہ طبع صافی خویش کم و بیش گاہ گاہ بہ بعضے جوہریان جوہر شناس می نمایند، لقا از برخوردار کامگاہ میر عزت اللہ عشق مدعمرہ کہ ارشا سر رشتہ استادی ایں دودمانِ عالی شان دارد، اکثر استشارہ می فرمایند۔'' 48

ابتدائی مشق کے اس زمانے میں ظفر نے میر عزت اللہ عشق کے علاوہ جن ''جوہریانِ جوہر شناسِ سخن'' سے استفادہ کیا تھا، ان سب کے نام معلوم نہیں، اس لیے کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی ہے۔ بہر نوع اُس زمانے کے استادوں کے جو طرز تھے، یہ ان سے کم و بیش متاثر ہوتے رہے تھے چنانچہ ان کا اندازِ کلام یہ تھا ۔

پی لاکھ باصہبا، کی لاکھ بار توبہ — اب کر چکا میں توبہ، تو بہ ہزار تو بہ
دل دے کے ان کو، ایسی اذیت ہوئی ہمیں — اب دل کبھی نہ دیں گے نصیحت ہوئی ہمیں
تو اس دم آ کہ ہے وقت سحر اے گلبدن ٹھنڈا — زمیں ٹھنڈی، ہوا ٹھنڈی، مکاں ٹھنڈا چمن ٹھنڈا
نہ کیوں ہو بوسۂ لب سے ترے میرا بدن ٹھنڈا — کہ پانی چشمۂ حیواں کا ہے اے جانِ من ٹھنڈا

ظفر کس شعلہ خو نے تیرے نامے کے کیے پُرزے
چلا آتا ہے دم بھر تا ہُوا جو نامہ بر ٹھنڈا

ان کی شکلیں خاک دخوں میں آہ رلیاں دیکھیاں — رنگ محلوں میں جنھوں نے رنگ رلیاں دیکھیاں
لشکرِ طفلاں کو لیکر ساتھ کس شوکت سے آہ — تیرے ہاتھوں سے جنوں کیا کیا نہ گلیاں دیکھیاں
دیکھ ٹک غور سے آئینہ دل کو میرے — اس میں آتا ہے نظر عالم تصویر نہ توڑ
قاتل سے ہمیں اپنے شہادت طلبی ہے — واں آبِ دمِ تیغ ہے، یا تشنہ لبی ہے
یہ کہہ دے اے صبا ان سے، یہاں آؤ، ہوا کھاؤ — چمن میں صبح دم ٹک میر فرماؤ، ہوا کھاؤ
دل پہ کیا زلف بلا خیز سے آفت آئی — یاد قامت بھی مرے سر پہ قیامت لائی
قاصدِ اشک چلا لیکے جو دل کا پیغام — کیا ظفر اس نے ملاقات کی پھر ٹھہرائی

دبا ہاتھ جو میری کروٹ کے نیچے　　اتر بیٹھے دو ہیں چھپر کھٹ کے نیچے
نعلِ شکل مہ نو جب ترے تو سن کو لگے　　چار چاند اور فلک پر مہِ روشن کو لگے

آخری مطلع کو محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق میں شامل کر لیا ہے۔

شعروں کے اس انتخاب سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ ظفر کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو چکی تھی اور وہ روزمرہ اور محاورے کا بہت اچھا صرف کرتے تھے۔ بعض غزلوں کے لیے انھوں نے ردیفیں بھی ایسی ہی اختیار کی تھیں مثلاً ہوا کھاؤ۔ لطفِ زبان اور حسنِ بیان کا فائدہ یہ تھا کہ ان کے بعض شعر بطور ضرب المثل کے زبانوں پر جاری ہو سکتے تھے چنانچہ پہلا مطلع بہت خوب ہے۔

اُس زمانے میں قوت مشقی کے اظہار کے لیے ظفر دو غزلے بھی کہنے لگے تھے۔ ''ٹھنڈا'' کی ردیف میں جو شعر نقل کیے گئے ہیں، وہ دو غزلے کے ہیں۔ قدرتِ کلام کے باوجود توجہ طلب بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی روش سے ہٹ کر بعض غیر مردّف غزلیں بھی کہی ہیں۔ آفت آئی اور قیامت لائی والا مطلع اس کی مثال ہے:

ظفر نے زندگی کے معمولات سے متعلق شعر کہے ہیں اور ان شعروں میں نئے مضامین کی تلاش کی ہے۔ مضامین میں دقت اور پیچیدگی بھی نہیں ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ بعض بعض شعروں میں قدیمی الفاظ صرف کیے ہیں۔ بعد کے زمانے میں خود انھوں نے بھی ایسے اسما اور افعال کو ترک کر دیا تھا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ظفر کے دو استادوں کا ذکر اس طرح کیا ہے:

'' شاہ نصیر مرحوم کہ ولی عہد (ظفر) کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے۔''49

میر کاظم حسین بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ میر محمد خاں سرور نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

'' بیقرار تخلص، میر کاظم حسین، سید صحیح النسب، جوانیست مودب، شاگرد میاں نصیر، کلامش رنگین و نقش دلچسپ است۔''50

ان کی ایک طرحی غزل کے چند شعر یہ ہیں ۔

زلف کھول اس نے جو عارض پہ دکھائی مجھ کو ایک جا شام و سحر پھر نظر آئی مجھ کو
ظرف بس دیکھ لیا ساقی گلفام ترا ساغر گل میں نہ مے تو نے پلائی مجھ کو

بیقرار ایسی ہی اک اور غزل پڑھتا ہوں
سن کے تحسیں نہ کرے کیونکہ سنائی مجھ کو

شب ہجراں میں ذرا نیند نہ آئی مجھ کو اس کی کیوں یاد دلا تو نے دلائی مجھ
اس کے دندان مسی زیب جو مستی میں کھلے برق سی ایک چمکتی نظر آئی مجھ کو

نصیر اور بیقرار دونوں سے تلمذ کی مدت کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔ محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ

"بادشاہ (ظفر) کے چار دیوان ہیں۔ پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں۔ کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں۔"[۱۷]

اب یہ معلوم کر لینا کہ ظفر کی کون کون سی غزلیں شاہ نصیر کی اور کون کون سی بیقرار کی اصلاح کردہ ہیں، بہت مشکل ہے۔ بے شک شاہ نصیر صاحب طرز استاد تھے اور ان کی اصلاحوں کو ظفر کے طرز کلام کی ترتیب و تشکیل میں ضرور دخل ہوگا۔ بیقرار سے تلمذ کے زمانے میں شاعری کی وہی صورت جاری رہی ہوگی۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کلیات ظفر کی جلدوں میں کلام کی تقسیم زمانی ترتیب سے کی گئی ہوگی، پھر بھی پہلی جلد کے کلام کو اگر قدیم خیال کر لیا جائے تو اس میں شاہ نصیر اور بیقرار کا اصلاح کردہ کچھ کلام ہو سکتا ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

ڈر گیا ہے جی تمھاری بیوفائی دیکھ کر اب کسی سے پھر کریں گے آشنائی دیکھ کر
تیری آنکھوں سے ہے گر نرگس بیمار کو فیض ہے مرے بھی دل پُر داغ سے گلزار کو فیض

کچھ ان کے دیکھتے ہی اپنی حالت ایسی ہوتی ہے
کہ سب کہتے ہیں، توبہ، ہائے چاہت ایسی ہوتی ہے

جو لکھا تھا مری پیشانی میں سو وہ پیش اے دل ناشاد آیا
ناصحا کیجیے اب پند و نصیحت موقوف بس میں دل اور کے ہے، میر انہیں بس، اجی بس

ان مست نگاہوں کی دیکھی نہیں کیفیت　　صوفی بھی ظفر ورنہ میخوار بنے رہتے

شاعر کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ بعض شعروں میں تو بالکل بول چال کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔

بیقرار کے بعد ظفر نے شیخ محمد ابراہیم ذوق کو اپنا استاد بنالیا۔ اس واقعہ کا آزاد نے اپنے مخصوص انداز سے بیان کیا ہے۔ لکھا ہے:

"ایک دن شیخ مرحوم جو ولی عہد کے ہاں گئے تو.... انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم! استاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین ادھر چلے گئے۔ تم نے بھی چھوڑ دیا؟ غرض اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے، اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی آ کر ہماری غزل بنا جایا کرو..... غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولی عہدی سے چار روپے مہینہ بھی ہو گیا..... شیخ مرحوم ولی عہد کے استاد ہو گئے۔" 52

ذوق بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے اس لیے اصلاح کے کام میں انھیں کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوئی ہوگی۔ شیخ ذوق کی اصلاحیں ولی عہد بہادر کو پسند آئیں اور استادی شاگردی کا یہ سلسلہ ایسا مستحکم ہوا کہ جب تک ذوق زندہ رہے، اس میں فرق نہ آیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ذوق کی اصلاحات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

"ایک دن حسب معمول بادشاہ کے پاس گئے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ کی ایک غزل ہے۔ اس کے ہر شعر میں ایک ایک مصرع پیوند کر کے مثلث کرنا چاہتے ہیں مگر ایجاد یہ ہے کہ مصرع جو لگے سو جب رواج قدیم کے اوپر نہ لگے بلکہ ہر شعر کے نیچے ایک ایک مصرع لگے کہ جس سے گویا ہر بند میں ایک ایک مطلع پیدا ہوتا جائے۔ غرض بادشاہ نے غزل انھیں دی کہ استاد اس پر مصرع لگا دو۔ انھوں نے قلم اٹھا کر ایک شعر پر نظر کی اور فوراً مصرع لگا دیا۔ اسی طرح دوسرے میں، تیسرے میں، مسلسل غزل تمام کر کے جتنی دیر میں نظر ڈالی بے تامل ساتھ ہی مصرع لکھتے گئے اور اسی وقت پڑھ کر سنائی۔" 53

معاملات آخر تک استوار رہے چنانچہ ایک واقعہ ذوق کی زبان اس طرح منقول ہے :

''ایک دن (بادشاہ بہادر شاہ) دربار میں آ کر بیٹھے جو میں (ذوق) پہنچا۔ افسردہ ہو کر کہنے لگے۔ اب تم یہ قصیدے ہمارے لیے کہتے ہو، ہم مر جائیں گے تو جو تخت پر بیٹھے گا اس کے لیے کہو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردد نہ فرمائیں۔ خیمہ پیچھے گرتا ہے۔ میخیں اور طنابیں پہلے ہی اکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اٹھ جائیں گے۔ حضور خیال فرمائیں۔ فردوس منزل کے امیر عرش آرامگاہ کے دربار میں کہاں تھے۔ عرش آرامگاہ کے امرا آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں۔ بس یہی خیال فرمالیجیے۔ جو جس کے ہوتے ہیں، وہ اسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے۔''[94]

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے مرزا ابوظفر کی ولی عہدی کے زمانے کے ان کے کلام کا انتخاب نقل کیا ہے۔ چند شعر یہ ہیں۔

ہمارے آگے ہی ذکر اگلے دوستداروں کا — پُرانے مُردوں کی وہ ہڈیاں اکھاڑتے ہیں
اب بھی وہ آنکھ تری آئینہ رو ہے کہ نہیں — اگلے طوروں پہ خدا جانیے تو ہے کہ نہیں
تیس دن وعدے پہ غرّے کے پھراتا ہے مجھے — جب ہوا چاند تو غرّہ ہی بتاتا ہے مجھے
پڑھ لیتے پس صفحہ سے مضمون ترے خط کا — کاغذ میں سیاہی دمِ تحریر نہ پھوٹی
جفا کی آپ کی باعث وفا ہماری ہے — خطا تمھاری نہیں ہے، خطا ہماری ہے

زبان کی سلاست اور بیان کی نفاست سے قطع نظر مضامینِ تازہ کی بندش کا شوق ظاہر ہے۔ بعض شعروں میں تو واقعات اور واردات کا عکس نمایاں ہے۔

11- ذوق

شیخ محمد ابراہیم نام تھا۔ غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، مزاج میں نیکی اور طبیعت میں سلامتی لے کر آئے تھے۔ شعر گوئی کا شوق خداداد تھا چنانچہ بہت جلد شاعر کی حیثیت سے متعارف اور معروف ہو گئے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ دلّی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ تھے۔ انھیں کے پاس بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے۔ شوق تخلص کرتے

تھے۔ وہاں سنتے سنتے بہت شعر یاد ہو گئے تھے۔ ایک دن خود بخود میری زبان سے
دو شعر نکلے۔ ایک حمد میں دوسرا نعت میں.... غرض کہ اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے اور
حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔" 55

حافظ شوق سے ذوق کے اصلاح لینے کا ذکر میر محمد خاں سرور کے تذکرے میں ملتا ہے۔ 56
مولانا محمد حسین کا کہنا ہے کہ کچھ مدت کے بعد ذوق نے میر کاظم حسین بیقرار کے ساتھ جا کر شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کر لی، چنانچہ قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے :

"ذوق تخلص نوشتے ست از شاگردان محمد نصیر الدین نصیر کہ گاہ گاہ در مجلس شعرا حاضری
شود و غزل طرحی ہم سرانجام می دہد۔ ایں دو بیت منسوب بدوست ؎

مت در سے اٹھا بہر خدا اپنے تو اے بت بیٹھا مجھے اب رہنے دے دربان سمجھ کر 57
تک دیکھ اب تو چشم حقیقت سے اس کو ذوق ہر طرف جلوہ گر ہے اسی کا ظہور حسن" 58

ابتدائے عمر کے ان شعروں میں بھی خدا پرستی اور تصوف کی طرف ان کی طبیعت کا میلان ظاہر ہے۔ وہ سکون اور عافیت کا خواہاں ہے اور اس کی یہ عافیت پسندی زندگی کے ہر شعبے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ابتدائی مشق کے ذوق کے دو شعر یہ بھی ہیں ؎

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا پر ذکر ہمارا نہیں آتا، نہیں آتا
جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

مولانا محمد حسین آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر شاہ نصیر سے تلمذ کے ابتدائی زمانے کے ہیں۔ اسی غزل کا مقطع یہ ہے ؎

قسمت ہی سے ناچار ہوں اے ذوق وگرنہ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا 59

مقطع کے تیور بتا رہے ہیں کہ شاعر کے یہاں خود اعتمادی پیدا ہو چلی تھی اور اب وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ نصیر کے صاحبزادہ وجیہہ الدین منیر کی وجہ سے بدمزگی ہو گئی تھی اور شاہ صاحب نے ذوق کو اصلاح دینا بند کر دیا۔ جو بھی ہو شاگردی کا سلسلہ زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ شاہ صاحب دکن چلے گئے۔

آزاد کے بقول ذوق کی پہلی غزل جو اصلاح سے مزین نہ ہوئی یہ تھی ؎

رکھتا بہر قدم ہے وہ یہ ہوسِ نقش پا ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوش نقش پا
افتادگاں کو بے سروسامان نہ جانیو دامانِ خاک ہوتا ہے روپوش نقش پا
اس رہگذر میں کس کو ہوئی فرصتِ مقام بیٹھے ہیں نقشِ پا بہ سرِ دوشِ نقشِ پا
پابوس درکنار کہ اپنی تو خاک بھی
پہنچی نہ ذوق اس کے بہ آغوشِ نقشِ پا

شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو استاد اور شاگرد کے مابین معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ شاہ نصیر کے ذکر میں ایک معرکہ کا حال نقل کیا جاچکا ہے۔ شاہ نصیر نے ''آب میں'' کی ردیف میں ایک دوغزلہ کہا تھا۔ اس کے مطلعے اور مقطعے درج ذیل ہیں ؎

ڈوب جاوے کیوں نہ یہ پھر سوختہ تن آب میں غیر سے چھینٹے پڑے جب شوخ پُرفن آب میں
مت سمجھ گرداب اسے اے شوخ پُرفن آب میں سایہ افگن ہے یہ تیرا دورِ دامن آب میں
کردیا پایاب دریائے سخن تو نے نصیر ہے رواں فکرِ رسا کا تیرے توسن آب میں
اور بھی پڑھ کر غزل اب نکتہ دانوں کو دکھا
دانہ ہائے گوہرِ مضموں کا خرمن آب میں
ابر سے ہیں تارِ بارش ناوک افگن آب میں موجِ دریا کیوں نہ پہنے تن پہ جوشن آب میں

قطعہ

اشک افشانی سے شمعِ انجمن کی اے نصیر بھر گیا سارا لگن کا شب جو دامن آب میں
ہوگیا پروانۂ دلسوز یہ کہہ کر نثار نوربائی یہ کھڑی ہے یا فرنگن آب میں

مولانا محمد حسین آزاد ناقل ہیں کہ:

''کسی دوست نے فرمائش کی کہ زمین مرقوم الذیل آج کل طرح ہوئی ہے۔ آپ بھی غزل کہیے۔ آغازِ شباب تھا اور طبیعت میں ذوق و شوق۔ غزل کہی۔ اس کا جابجا چرچا ہوا۔ اکبر شاہ جنت آرام گاہ اُن دنوں بادشاہ تھے۔ اُنھوں نے فرمائش فرمائی کہ میاں ابراہیم سے کہو، ہمیں خود آکر غزل سنائیں۔ یہ ولی عہد یعنی مرزا ابوظفر کے ملازم

خدمت تھے لیکن حضور بھی اِن کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ ایک قصیدہ اُن کی مدح میں کہہ کر شامل کر دیا۔"60

اس غزل کے کچھ شعر یہ ہیں۔

مے ملا کر ساقیانِ سامری فن آب میں کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں
چشمۂ آئینہ میں کب تر ہُوا پائے نگاہ اس طرح جاتے ہیں دیکھا پاک دامن آب میں
صحبتِ اہلِ صفا سے ہوں مکدّر تیرہ دل زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں
پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کوئی مَردوں کا منہ شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ مُردن آب میں

ذوق تو اِس بحر میں ایسے گلِ مضموں بہا
جابجا لگ جائے اک پھولوں کا خرمن آب میں

پھول مت علمِ کتابی پر کہ آخر کب تلک ناؤ کاغذ کی ہے اے طفلِ کودن آب میں

نوعمر باخبر شاعر نے اِس دو غزلے میں بادشاہ کی مدح کو اِس طرح شامل کیا ہے۔

مدح کر اُس شاہِ دریادل کی اے دل جس کا فیض لعل و گوہر ہے بہاتا وقتِ گفتن آب میں
شاہِ اکبر خسروِ غازی کہ آبِ تیغ سے رکھے حاسد کو ہمیشہ تا بہ گردن آب میں

پڑھ کے بسم اللہ مجرا بھا تو مُرشدا دلا
جوں شناور پھر ہُوا میں دست و پا زن آب میں

اس مشکل زمین میں اس طور پر غزل اور پھر قصیدہ کہہ کر شاعر نے اپنی قدرتِ کلام کا اچھا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اکثر شعروں میں ایسے مضامین نظم کیے ہیں جن کی افادیت میں کلام نہیں۔ ذوق کے ان شعروں کی روانی اور سلاست بھی داد طلب ہے۔ اِنھیں خوبیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے بہت سے اشعار زباں زد ہو کر ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔

ذوق کے حالات میں ایک اور قابلِ ذکر واقعہ اس طرح منقول ہے:

"خواجین رام پور میں سے نواب عبداللہ خاں ایک امیر دلّی میں رہتے تھے۔ پھر میرٹھ میں صدر الصدور ہو گئے تھے۔ شعر و سخن کے شیدا تھے اور خود بھی اچھا کہتے تھے۔ استاد کی اُن سے شناسائی تھی۔ شہیدی مرحوم بہ لباسِ فقیری دلّی میں آئے۔ مناسبتِ طبع نے

نواب سے بھی ملایا۔ اثنائے گفتگو میں کہا کہ معمرانِ سخن کے نزدیک آج فنِ شعر میں تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنؤ میں۔ شیخ حفیظ دکن میں، شیخ ابراہیم ذوق دلی میں۔ نواب صاحب نے کہا شیخ ابراہیم ذوق کو تیسرا درجہ دینے کا کیا باعث؟ شہیدی نے شیخ ناسخ کی بہت تعریف کی اور شاخ کی غزل سنا کر کہا کہ اس غزل پر آج کون قلم اٹھا سکتا ہے۔ نواب باخلاق اُس وقت تو چپ ہو رہے۔ پھر استاد کو بلایا، حال بیان کیا اور غزل کی فرمائش کی۔ استاد نے غزل کہہ کر مع قصیدہ جلسۂ خاص میں سُنائی اور خلوت میں اتنا بھی کہا کہ ان قوافی اور مضامین کو دیکھیے۔ جو ان سے بڑھ کر کہے گا تو پھر میں دیکھوں گا۔"61

ناسخ کی مذکورہ غزل کے کچھ شعر یہ ہیں۔

ہے نازکی سے قامتِ جاناں سمن کی شاخ　　میں سوزِ عشق سے ہوں چنار کہن کی شاخ
ظالم کو بعدِ مرگ بھی ہے ظالموں سے ربط　　خنجر کا دستہ کیوں نہ بنے کرگدن کی شاخ
ہم وحشیوں کے بخت جو برگشتہ ہیں سو ہیں　　سیدھی کسی طرح نہ ہو جیسے ہرن کی شاخ
معنی ثمر، حروف ورق، صنعتیں ہیں گُل
ناسخ ہے کلکِ فکر نہالِ سخن کی شاخ

معلوم ہوتا ہے کہ اِس معرکے کا علم ناسخ کو ہُوا تو انھوں نے پھر بہ تبدیلِ بحر و قافیہ ایک اور غزل کہی۔ اس کا مطلع اور مقطع یہ ہے۔

کہاں وہ دستِ حنائی کہاں چنار کی شاخ　　کہ نخلِ طور میں ایسی نہیں بہار کی شاخ
خیالِ زلف میں ہم باغ جو گئے ناسخ
تمام برگ تھے کھنچے ہر ایک مار کی شاخ

شاہ نصیر کے کلیات میں بھی مذکورہ زمین میں قافیہ کی تبدیلی کے ساتھ ایک غزل موجود ہے۔

تھی زلفِ یار سنبلِ خلدِ بریں کی شاخ　　بالے کے موتیوں سے بنی یاسمن کی شاخ

ذوق کی غزل کا یہ مطلع مولوی باقر پدر آزاد نے گلشنِ بے خار میں نقل کیا ہے۔

ہے زلف تیری سنبلِ صحنِ چمن کی شاخ　　قطروں سے پُر عرق کے بنی یاسمن کی شاخ

اُن کی اس غزل کے کچھ شعر یہ ہیں۔

لبے بہرہ انتفاع سے رہتے ہیں پُر جفا ممکن نہیں کہ لائے ثمر کر گدن کی شاخ
حیراں ہوں دیکھ خال کو ابروے یار پر گل نیلوفر کالای ہے کیونکر ہرن کی شاخ
لچکے ہے یوں کمر تری وقتِ خرامِ ناز جنباں ہو جوں نسیمِ چمن سے سمن کی شاخ

اور قصیدے کے چند شعر یہ ہیں۔

لکھ ذوق اُس کی مدح کہ جس کی ثنا سے ہے سرسبز تیرے گلشنِ باغِ سخن کی شاخ
وہ کون؟ شاہ اکبرِ ثانی کہ جس کو روز مجرا کرے ہے جھک کے نہالِ چمن کی شاخ

اور۔

مطلع وہ پُر بہار لکھوں اُس کی مدح میں مصرع کو جس کے سُن کے کٹے نسترن کی شاخ
تیرے بہارِ فیض سے نخلِ کہن کی شاخ سرسبز یوں ہے جیسے کہ سروِ چمن کی شاخ
تیرے سحابِ لطف سے سیراب ہوا گر ہمسر ہو شاخِ نخلِ ارم سے ہرن کی شاخ

ہر شعر مدلل بھی ہے اور حشو و زوائد سے پاک بھی ہے۔ قصیدے کے شعروں کے درمیان ایک خاص قسم کا ربط بھی محسوس ہوتا ہے۔ مدح میں کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جو مدّاح یا ممدوح کے مرتبے کے مناسب نہ ہو۔ مضامین عموماً دوسرے شاعروں کے مقابلے میں بہتر اور بڑھ کر ہیں۔

وہ زمانہ تھا جب شعر کی قدر دانی کے لیے دکن کا نام نکل آیا تھا۔ شیخ حفیظ جن کا اوپر ذکر آیا ہے، وہاں جا کر وہیں کے ہو رہے تھے۔ شاہ نصیر بھی وہاں جاتے آتے رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ شیخ ناسخ اور شیخ ذوق کو بھی بلایا گیا تھا۔ ذوق کے حال میں آزاد نے لکھا ہے:

> "دیوان چندو لعل مدار المہام دربار حیدر آباد نے کئی ہزار روپے بھیج کر بلا بھیجا اور مصرع اپنی طرح مشاعرہ کا بھی بھیجا۔ حضرت مرحوم نے زمین مذکور میں دو غزلہ کہہ کر بھیج دیا اور روپیہ نہ لیا۔ میں نے ایک دن نہ جانے کا سبب پوچھا۔ فرمایا پھر اپنی ہی جگہ بھاری ہے میاں وہاں جاتے، خدا جانے کیا ہوتا اور کیا کیا نہ ہوتا۔ اپنی دلّی اور حضور کا دربار کیا تھوڑی نعمت ہے۔ خدا کا شکر ادا کیا اور یہیں بیٹھے رہے۔" 62

شاہ نصیر شاید اُس زمانے میں دکن میں ہی تھے۔ انھوں نے بھی دوغزلہ کہا تھا۔ مطلعے اور مقطعے یہ ہیں۔

حسنِ رخ سے بے خطر ہو زلفِ پیچاں چھوڑ کر　　بیٹھ رہ دولت پہ اژدر کو نگہباں چھوڑ کر
اِس زمیں میں پڑھ غزل اک اور پُر مضموں نصیر　　تا نہ جائیں سامعیں بزمِ سخنداں چھوڑ کر
دل کدھر جائے لبِ جاں بخشِ جاناں چھوڑ کر　　زندگی مشکل ہے پانی آبِ حیواں چھوڑ کر
کیوں نہ مانندِ نگیں روشن ہو نام اُس کا نصیر　　گھر میں بیٹھے اپنے جو دنیا کو انساں چھوڑ کر

شیخ ناسخ کے پاس بھی غالباً یہی مصرع طرح گیا تھا۔ ان کی غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے۔

جیتے جی جاؤں میں کیونکر کوئے جاناں چھوڑ کر　　بلبلِ نالاں کہاں جائے گلستاں چھوڑ کر
مر گیا کیا ناسخ میکش جو سارے مے فروش　　مسجدوں میں بیٹھے اپنی اپنی دکاں چھوڑ کر

اب شیخ ابراہیم ذوق کے دوغزلے کے کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

کل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر　　چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر
گر خدا دیوے قناعت ماہِ یک ہفتہ کی طرح　　دوڑے ساری کو کبھی آدھی نہ انساں چھوڑ کر

طرز میں اپنی غزل لکھ ذوق لیکن اب نہ جا
عالمِ مضموں میں طرزِ تفتہ جاناں چھوڑ کر

جب چلا وہ مجھ کو بسمل خوں میں غلطاں چھوڑ کر　　کیا ہی پچھتاتا تھا میں قاتل کا داماں چھوڑ کر
اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک　　لعل کیوں اِس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر
دل تو لگتے ہی لگے گا حوریانِ عدن سے　　باغِ ہستی سے چلا ہوں ہائے پریاں چھوڑ کر
گھر سے بھی واقف نہیں اس کے کہ جس کے واسطے　　بیٹھے ہیں گھر بار سب ہم خانہ ویراں چھوڑ کر

اِن دنوں ملکِ دکن مین ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

غزل کے بیشتر شعر موقع اور محل کے مناسب اور حسبِ حال ہیں۔ اکثر میں قناعت کے مضامین نظم کیے ہیں۔ خود ذوق نے اِن غزلوں کو "اپنی طرز" کے ساتھ مخصوص بتایا ہے اور انصاف کی بات ہے کہ جو بات اِس دوغزلہ میں ہے وہ دوسروں کی غزلوں میں کہاں ہے۔

آزاد ذوق کے شاگرد تھے۔ مدتوں اُن کی خدمت میں اٹھے بیٹھے تھے۔ اُن کے معاملات کو جانتے اور اُن کی طرز کو پہچانتے تھے۔ ان کی غزل گوئی کے بارے میں اُنھوں نے اس طرح رائے دی ہے:

''غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر اُن کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبیِ محاورہ اور عام فہمی ہے مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا، شاہ نصیر کا ڈھنگ وہی تھا۔ اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسہ کے گرمانے میں اور واہ وا کے نکال لینے میں ایک عجیب جادو کا اثر ہے چنانچہ وہی مشکل طرحیں، چست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی، الفاظ کی شکوہیں ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ معروف دیرینہ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ ان کی پسندِ طبع کے بموجب اُنھیں بھی تصوف اور عرفان اور دردِ دلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولی عہد جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ جرأت، انشا اور مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنؤ سے آتے رہتے تھے۔ اُن کی غزلیں انھیں کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی غزل آخر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے، ایک دو تصوف کے، دو تین معاملے کے، اور بیچ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اُسی میں بندھے تو لطف دے نہیں تو پھیکا رہے۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔''63

شیخ ذوق خود بھی مذہب پسند طبیعت رکھتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے کلام میں بیشتر مضامین اخلاقی اور اصلاحی نظم ہوتے تھے۔ بیسویں صدی کے ایک روشن خیال ناقد نے اعتراض کے طور پر لکھا ہے کہ ذوق کے دیوان میں نام کے لیے بھی کوئی شعر مبتذل نہ نکلے گا۔

12۔ معروف

اپنے وقت کے موثر اور موقر شاعروں میں تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے ان کے تعارف میں جو لکھا ہے اس کا اختصار درج ذیل ہے:

''معروف تخلص، الٰہی بخش خاں خلف الصدق عارف جان برادرزادۂ اشرف الدولہ قاسم جان بہادر سہراب جنگ است کہ ازامرائے نامدار ایام دولت امیر الامراز والفقار الدولہ نجف خان بہادر بودوین الٰہی بخش خاں جوانیست خوش خلق..... یار باش، خوش معاش، فکرش درست وکلامش چست، طبع مستقیم دارد وعقل سلیم کہ دریں ایام نیک فرجادلش از دنیا سردگردیدہ۔ اکثر اوقات شریف عمر گرامی بیاد رَبّی تعالیٰ شانہ ی گماردوی گذارد۔ ارادۂ ارادت بخدمت میر ضیاء الدین..... دارد ونظر برایں سررشتۂ دینی برقاسم ہمچداں خیلے مہرباں است۔ در بدوشوق سخن سنجی از محمد نصیر الدین نصیر استشارہ نمودہ وحالا بہ تائید ذہن رسائے خود دیوانے مملو بیشتر انواع سخن تالیف فرمودہ۔''§4

میر محمد خاں سرور نے بھی معروف کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''شخص بسیار خوش اختلاط وخوش فکر، درفن سپاہ گری بسیار ماہر، بامولف ازقدیم تعارف دارد۔''§5

مولانا محمد حسین آزاد نے ان کے بارے میں مفید معلومات قلم بند کی ہیں۔ ان کی تحریر کا خلاصہ اس طرح ہے:

''دلّی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف ایک عالی خاندان امیر تھے۔ علوم ضروری سے باخبر تھے اور شاعری کے کبنہ مشاق مگر اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فانی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ چونکہ لطائف کلام کے عاشق تھے، جہاں متاع نیک دیکھتے تھے نہ چھوڑتے تھے۔ زمانہ کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے ان کا کلام گزرانا تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اور سید علی خاں غمگین وغیرہ وغیرہ استادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے اہل فقر کی برکت صحبت سے ترک دنیا کر کے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ جو دیوان معروف اب رائج ہے وہ تمام وکمال انھیں کا اصلاح کیا ہوا ہے۔''§6

معلوم ہوتا ہے کہ معروف کے اخلاف نے آزاد کی اِس تحریر پر شدید احتجاج کیا تھا۔ اُس کے جواب میں آزاد نے لکھا ہے:

> ''دلّی میں آبِ حیات کو دیکھ کر بعض اشخاص نے مجھ سے کہا کہ ایسا کہنہ مشق صاحب کرامت بزرگ ایک نوجوان شخص کا کیونکر شاگرد ہوا ہوگا؟ اِس مضمون کو تم نکال ڈالو۔ میں کیا کہوں کہ استاد کی صحبت میں ہفتہ میں کئی دفعہ اِن صحبتوں اور اصلاحوں کے ذکر ہو جاتے تھے۔ دو غزلوں کے اصل مسودے اب تک بھی میرے پاس موجود ہیں۔ دکھاؤں کسے؟''[87]

جن لوگوں نے تذکروں کی ورق گردانی کی ہے وہ جانتے ہیں کہ قدر شناسوں نے اکثر اپنے مقابلے میں کم عمر کے لوگوں سے بھی کسبِ فیض کیا ہے بلکہ بعض وقت خود استاد نے اپنے شاگرد کی شاگردی بھی اختیار کی ہے۔ صاحب کرامات ہونا اور بات ہے اور شاعری میں کسی سے تلمذ اختیار کرنا دوسری بات ہے۔ بہادر شاہ ظفر کہنہ مشق بھی تھے اور عمر میں بھی غالب سے بڑے تھے لیکن ان کے بارے میں بھی کسی نے نہ کہا کہ ایسا شخص ان کا شاگرد کس طرح ہوا ہوگا۔ ظاہراً اِس اعتراض کی وجہ دو معلوم ہوتی ہیں:

اول یہ کہ معروف مرزا غالب کے سسر تھے، اور ان کا شاگرد ذوق ہونا غالب کے شیدائیوں کو پسند نہ تھا۔

دوم یہ کہ آزاد کے بیانوں کی تردید کرنا گویا فیشن میں داخل رہا ہے۔

اصل مسودات کے موجود ہونے نہ ہونے کی بات کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس پر اصرار کرنا اتنا ہی لغو ہے جتنا کسی بہ خیال خویش محقق کا یہ کہنا کہ اُس شخص کا نام بتاؤ جس کے ہاتھ پر میاں دلگیر نے اسلام قبول کیا تھا۔

بعض لوگوں کا یہ قول بھی کہ معروف کا ذوق سے تلمذ اس وجہ سے خلافِ قیاس ہے کہ اس کا ذکر مصحفی اور قاسم کے تذکروں میں نہیں آیا ہے، صحیح نہیں ہے۔ یہ تلمذ بعد کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ اِس لیے ان قدیم تذکروں میں اس کا ذکر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سعادت یار خاں رنگین نے اپنے مجموعہ امتحانِ رنگین (=امتحانِ سعادت یار خاں 1246=ھ/1830-31) میں لکھا ہے۔

''نوزدہم قطعہ بندبہ دستور معمول درمقدمۂ برادرعزیز ازجان الٰہی بخش خاں معروف''68

اس میں کل پچیس شعر ہیں۔ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

کہا میں نے الٰہی بخش خاں وہاں شفیق واشفق اک بھائی مرا ہے
عشق اُس پر میں ہوں وہ مجھ پر ہے مفتوں یہ میرا اور اُس کا ماجرا ہے
کہ میں آہن تو مقناطیس ہے وہ جو میں ہوں کاہ تو وہ کہربا ہے
اسے جی چاہتا ہے جاکے دیکھوں
برس دو اک سے وہ مجھ سے جدا ہے

اسی قطعہ سے پتا چلتا ہے کہ معروف اصلاً الور کے رہنے والے تھے۔رنگین نے اس قطعہ میں بتایا ہے کہ الٰہی بخش خاں کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہے اور ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔اپنی ایک ہجویہ رباعی میں رنگین نے معروف کو اپنا شاگرد کہا ہے۔

رنگین غصہ ترا کم از برق نہیں وہ کون ہے اِس بحر میں جو غرق نہیں
معروف ہے شاگرد ترا اُس کو نہ چھیڑ شاگرد میں اور بیٹے میں کچھ فرق نہیں

اتنا ہی نہیں بلکہ ایک رباعی ان کی یہ بھی ہے کہ۔

معروف کی مشق کو کیا ہم نے جوغور ہر ایک غزل کا اس کی ہے طرز اور
رنگین اِس کا سبب یہ معلوم ہوا لوگوں سے کہالیتا ہے اُس کا ہے یہ طور

ان رباعیات کی موجودگی میں ذوق سے تلمذ والی روایت سے انکار کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

معروف کے حالات میں ایک واقعہ آزاد نے اِس طرح نقل کیا ہے:

''(بھورے خاں آشفتہ نے) نواب حسام الدین حیدر خاں نامی کی ہجو کہی۔نامی مرحوم سے انھیں (معروف کو) ایسی محبت تھی کہ وہ خود بھی کہتے تھے اور لوگ بھی کہتے تھے کہ ان دونوں بزرگوں میں محبت نہیں عشق ہے۔اگلے زمانے کے لوگوں کی دوستیاں ایسی ہی ہوتی تھی۔ان کی تعریف میں غزلیں کہہ کر داخلِ دیوان کی تھیں۔ایک مطلع یاد ہے۔

جو تم آؤ مرے مہماں حسام الدین حیدر خاں کروں دل نذر، جاں قرباں حسام الدین حیدر خاں

جب ان کی ہجو کہی تو انھیں سخت رنج ہوا۔ اس پر بھی اتنا کہا ''ہمارے سامنے نہ آیا کرو۔'' 69

وہ بھی سمجھ گیا۔ عذر میں کہا کہ لوگ ناحق بدنام کرتے ہیں۔ میں نے تو نہیں کہی۔ کہا کہ بس اب آگے نہ بولو۔ اتنی مدت ہم نے زمین سخن کی خاک اڑائی۔ کیا تمھاری زبان بھی نہیں پہچانتے؟ میں تو اُس سے بدتر ہوں جو کچھ کہ تم نے کہا مگر میرے لیے تم میرے دوستوں کو خراب کرنے لگے۔ بھئی مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ پھر جیتے جی بھورے خاں کی صورت نہ دیکھی۔ انھیں نای کی وجہ سے رنگین سے بھی بگاڑ ہو گیا تھا۔ چنانچہ رنگین نے کہا ہے کہ ؎

معروف اگر میرے مقابل اَڑتا تو زیورِ نظم میں بھی کچھ کچھ گھڑتا
رشک مرے ہو سکے وہ رنگین کیا دخل پردے میں وہ نای کے ہے مجھ سے لڑتا

عبدالرحمٰن خاں احسان سے بھی معروف کے برادرانہ روابط تھے۔ انھوں نے ایک قطعہ میں کہا ہے ؎

تلوّن، زود رنجی، بد مزاجی یہ خو تیری مجھے احسان نہ بھائی
نہ ہوتا بحرِ الفت کا شناور جو تیرا تو ڈوبے آشنائی
جہاں میں تو ہوا ہے تو بھی معروف جہاں جاوے گا باایں بے دنائی
کہے گی خلق یہ دیکھو وہ آیا الٰہی بخش صاحب کا بھائی
الٰہی بخشیو مجھ کو کہ غیبت زباں پر میری نادانی سے آئی
الٰہی بخش سے ہے کس کو نسبت نثارِ فخر چترِ بادشاہی

اس قطعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معروف کی طبیعت میں ''تلوّن زود رنجی اور بدمزاجی'' تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اکثر لوگوں سے جلدی بگاڑ ہو جاتا تھا۔ میاں رنگین سے کھٹ پٹ ہو گئی۔ پھر اپنے سگے بھائی نواب احمد بخش خاں سے بھی خرابی ہوئی چنانچہ رنگین نے اپنی رباعیوں میں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

ایک رباعی یہ ہے ؎

معروف میں باقی تو نہیں دم مطلق کہتا ہے کسی سے میں نہیں کم مطلق
غم احمد بخش خاں کی ثروت کا ہے بس رنگین اِس بن اُسے نہیں غم مطلق

یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں سے بگاڑ نے خود معروف کو بد دل کر دیا تھا۔ اور بالآخر انھوں نے شعر گوئی ترک کر دینے کا ارادہ کیا۔ ایسے میں حافظ احسان نے پھر سہارا دیا چنانچہ ان کے دیوان میں ایک قطعہ یہ ہے:

قطعہ در ایما میکہ الٰہی بخش خاں معروف از اعتراضاتِ مفسداں عزم ترکِ شعر گفتن کرد۔

صبا تو کیجیو آہنگِ خدمتِ معروف — بیا اُس سے کہو کہ اے عندلیبِ خوش آہنگ
تو رنجِ شورشِ زاغاں سے ہے گلستاں میں — نہ کیجیو ترکِ ترنّم کا ایک شب آہنگ
وہ شہسوار ہے تو عرصۂ فصاحت کا — مقر ہیں اہلِ صفاہان وروم وہندو فرنگ
عنانِ اشہبِ معنی ہے تیرے کف میں سدا — صدائے سگ سے نہ ہونا تو زنہار تنگ
ہر آں کہ خاطرِ تو بے سبب برنجاند — زقعرِ تحتِ زمیں تا بہ اوجِ ہفت اورنگ

زترک تازِ درِخانۂ تناسلِ او
شکستہ باد بہ گوپال قاضیِ یکرنگ

آزاد نے معروف کو ''فنافی الشعر'' کہا ہے۔ اُن کے اِس قول کی تائید شیفتہ کی اِس تحریر سے بھی ہوتی ہے کہ:

''بافنِ شعر الفتے بیش از بیش داشت۔ در یک ہزار و دو صد و چہل و دو از ہجرت خیر البشر (1242ھ=- 1826) ایں جہانِ گذراں را گذاشت۔ صاحب دو دیوان است۔ اکثر خیالات رنگین و مضامین دل نشیں دارد۔''70

معروف کا پہلا دیوان 1221ھ (1806) میں یا اس سے کچھ پہلے مرتب ہوا تھا اور اُس کا ذکر قاسم نے کیا ہے۔ دوسرا دیوان غالباً وہ ہے جس کا ذکر شیفتہ نے کیا ہے لیکن وہ انھیں دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ آزاد نے معروف کے کلام سے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ایک سو ایک مطلع ہیں اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اِسی رعایت سے اِس کا نام تسبیح زمرد رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پروئی تھی اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے

کہہ کر لگائی تھی۔ جن دنوں اس کے دانے پروتے تھے، نواب صاحب کی سب پر فرمائش تھی کہ کوئی مثل کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ بھورے خاں آشفتہ ایک پرانے شاعر کے ایک شعر میں "ہری چگ" کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا۔ ان سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا۔

آج یہاں، کل وہاں گذرے یوں ہی جگ ہمیں　　کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری چگ ہمیں

انھیں سو روپے ایک رومال میں باندھ کر دے دیے کہ تمھاری کاوش کیوں خالی جائے۔"71

ظاہراً اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اشعار خود معروف نے موزوں کیے تھے گویا موتی تو انھیں کے تھے۔ ذوق نے اصلاح دے کر انھیں مناسب طور پر مرتب کر دیا ہوگا۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں معروف کے دیوان کے دو نسخے ہیں۔ دونوں کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے۔

بجز الحمدللہ اہلِ دیں کا　　کہاں مُنہ وصفِ ربّ العالمیں کا

ایک نسخے میں تسبیح زمرد بھی شامل ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے۔

طبیعت سبزہ رنگوں پر نہ گر معروف اب آتی　　تو پھر اپنے یہ تسبیح زمرد کب ہاتھ آتی

اس کے بعد ذوق کا کہا ہوا قطعہ تاریخ تحریر ہے۔ وہ قطعہ دیوان ذوق میں بھی اس طرح شامل کیا گیا ہے۔

"اشعار در تاریخ دیوان نواب الٰہی بخش خاں معروف"

سبزہ رنگاں کہ بباغ خستہ　　تازہ چوں شاخِ گل و نالہ دورد
از کمر تا دہنِ شاں موہوم　　چوں خطِ جوہری و جوہر فرد
چشم دارند بقتلِ عشاق　　چوں حریفے کہ کند قصدِ نبرد
بہ جمالِ رخ آنہا معروف　　مدّتے شد کہ دلش خوش می کرد
رفت صیت سخنش از دہلی　　تا صفاہان و عراق و ماورد
و اندراں حال سخنہا ی گفت　　ہمہ چوں نالۂ موزوں پُر درد
صد و یک مطلع رنگیں آخر　　گفت بانالۂ گرم و دمِ سرد

شد چو تسبیح زمرد نامش رونق وآب گہر رفت بہ گرد
مُرد فیروزہ وخوں شد دلِ لعل کہربا چوں یرقانی شدہ زرد
پیش آں گنج گہر نیست چوخاک گنج خسرو کہ بود باد آورد
ذوق چوں خواست دوتاریخش را اندریں دفترِ معنی بدو فرد
اول از دانۂ خوشرنگ شمار کرد و آں عقدۂ مطلب واکرد

1236ھ

باز باخامۂ رنگیں بنوشت
طرفہ تسبیح زمرد آورد

1236ھ(1821)

یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ معروف شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور اس شاگردی پر نازاں بھی تھے۔ وہ طویل ردیفوں اور مشکل قافیوں میں غزلیں خوب کہہ لیتے تھے۔ بلکہ مشاعروں کے لیے دوغزلے بھی لکھتے تھے۔ ذیل میں کچھ مقطعے اور مطلعے تحریر کیے جاتے ہیں۔

کرگئی جانِ حزیں تن سے سفر اچھا ہوا تھی امانت جس کی، پہنچی اُس کے گھر اچھا ہوا
اور پڑھتا ہوں غزل، یاروں نے اے معروف گر امتحاں پر میرے باندھی ہے کمر اچھا ہوا
مرگیا تیرا مریضِ غم اگر اچھا ہوا یہ کبھی اچھا نہ ہوتا عمر بھر اچھا ہوا

اُس کے کوچے میں جو ہم کل جاکے روئے خوب سا
ہنس کے بولا اب کے باری ینہ اِدھر اچھا ہوا

جو راہِ عشق میں ہم پھونک پھونک اب پاؤں دھرتے ہیں
تو یہ باعث ہے اے ہمدم کہ رسوائی سے ڈرتے ہیں

غزل اک اور لکھیے اے الٰہی بخش خاں صاحب
قلم کو ہاتھ سے اپنے ابھی کیوں آپ دھرتے ہیں

زبس وہ چاہتے ہیں ہم کو اور ہم اُن پہ مرتے ہیں
یہاں رہتے ہیں ہم نالاں وہاں وہ آہیں بھرتے ہیں

ہزار اغیار سمجھایا کریں اب نیچ اونچ اُن کو
اُنھوں کے دل سے اے معروف پر ہم کب اترتے ہیں

معروف اپنے قدیمی استاد شاہ نصیر کے طرز میں بھی کبھی کبھی غزلیں کہتے تھے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ مشاعرے میں کامیابی حاصل ہو جائے چنانچہ ذیل کے اشعار لائق توجہ ہیں۔

نصیر الدین کے ڈھب کی لکھ غزل معروف پُر مضموں جدا ہے یعنی اندازِ سخن ہر اک سخنداں کا
تبسم یار کا باعث ہے اپنی چشمِ گریاں کا تماشا عشق کی دولت سے ہے یہاں برق و باراں کا

نہ پہنچے دل تلک اُس کے، جلایا دامنِ گردوں
اثر دیکھا تو یہ دیکھا اِس اپنی آہِ سوزاں کا

اپنے استاد کی طرح معروف بھی زمینیں خوب نکالتے تھے مثلاً۔

خوب اِس کو صاف کر معروف یاروں کے لیے یہ زمیں تو نے نکالی ہے اگر پہلے پہل
جاں نہیں تو دل ہے، کچھ تو نذر کر پہلے پہل دیکھ تو معروف کون آیا ہے گھر پہلے پہل

دیکھ کر رکھو قدم معروف راہِ عشق میں
خامہ ساں اِس راہ میں کٹتا ہے سر پہلے پہل

معروف کے بارے میں سعادت یار خاں رنگین کی یہ رباعی بھی توجہ طلب ہے۔

معروف اپنے لیے ہے رنگیں سے لڑا تا خلق کہے کہ یہ بھی شاعر ہے بڑا
جب پڑنے لگیں اِدھر سے صابن کے مول سونے کی طرح سے تب گیا خوب گھڑا

اُس زمانے میں شیخ امام بخش ناسخ کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ انھوں نے گویا اساتذۂ دہلی کی طرز پر خطِ تنسخ کھینچ دیا تھا۔ معروف دہلی والے تھے۔ اُنھوں نے ناسخ کا جواب پیش کرنے کی کوشش کی۔ معروف کے ایک دو غزلے کے چند شعر یہ ہیں۔

چشم سے ٹپکے ہے خوں کیوں نہ اچنبھا ہووے لعل جب جائے گہر سیپ سے پیدا ہووے
جب کہ اعجاز نما عکسِ رُخ اُس کا ہووے کفِ آئینہ نہ کیوں پھر یدِ بیضا ہووے

یہ تو ناسخ کی غزل کا تھا جواب اے معروف
اب وہ کہہ شعر کہ دل خوش شعرا کا ہووے

یعنی ناسخ کی طرز سے شعرا کا دل خوش نہیں ہو سکا۔ اس کے برخلاف جس سے دل خوش ہو معروف کی وہ غزل یہ ہے۔

کوئی سودا زدۂ زلف نہ مجھ سا ہووے　　کہ معالج جو ہو میرا اُسے سودا ہووے
کل سے تھی اُس کو غشی، ہے جو اداس آج کا دن
کہیں معروف نہ دُنیا سے سدھارا ہووے

ناسخ ہی سے متعلق معروف کے ایک اور دو غزلے کے کچھ شعر یہ ہیں۔

تجھے منظور اے بیدرد ہم سے مُنہ چھپانا ہے　　جو سونے کے بہانے سے دوپٹہ منہ پہ تانا ہے
وہ مضموں کہہ جو ہو جائے غزل منسوخ ناسخ کی　　جو زورِ طبع اے معروف تجھ کو آزمانا ہے
تجھے اے منعم اک دن چار کے کاندھے پہ جانا ہے　　مناسب پالکی کے بدلے گہوارہ بنانا ہے
سراغ اُس کی کمر کا ڈھونڈھ مت، معروف جانے دے
کہ وہ عنقا ہے، اُس کا لامکاں میں آشیانا ہے

اِس مقام پر یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ بعض لوگ جو اردو والوں کی معاشرت سے ناواقف ہیں اردو شاعری کو امرد پرستی کے لیے مطعون کرتے ہیں۔ اُن کی تنگ نظری بلکہ بے بصیرتی کو معروف کے یہ اشعار بخوبی نمایاں کرتے ہیں۔

وہ پردے میں بھی اک آفت ہے معروف　　غضب ہوتا اگر پردہ نہ کرتا
سوئے جو مُنہ پہ لیکے وہ آنچل تمام رات　　مہتاب پر گھرے رہے بادل تمام رات
دوپہر ہے ٹھیک دن ڈھلنے دو، مت جاؤ ابھی　　گر چلے ہو ڈال لو سر پر دوپٹہ دھوپ میں

اپنی شاعری کی بعض خوبیوں کا بیان معروف نے اس مقطع میں خوب کیا ہے۔

معروف دیکھے ہیں ترے اشعار آبدار　　معنی بلند، لفظ قیامت، زبان صاف

اور اُن کے چند ''اشعارِ آبدار'' نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں۔

تھا شب وعدہ یہ احوال ہر اک کھٹکے پر　　چونک پڑتا تھا کہ اب کے تو مقرر آیا
کہا جو میں نے کہ اُس ناتواں کا کیا حال　　کہا کہ [illegible] سودے، وہ ناتوان نہیں
آپ جس وقت رقیبوں کی قسم کھاتے ہیں　　ہم رقیبوں کے نصیبوں کی قسم کھاتے ہیں

دردِ سر ہی ہو، کسے صندل لگانے کا دماغ اِس کا گھسنا، لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم وہاں سے دلے
مُڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے

13-غالب

مرزا اسداللہ خاں غالب کے سلسلۂ حالات میں ڈاکٹر حنیف نقوی کا کہنا ہے کہ:

"غالب کے بیانات میں جو تضادات ملتے ہیں، وہ صرف اتفاقی نہیں، ارادی بھی ہیں اور ان سے سرسری گذر جانا ہمیں بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا کر سکتا ہے۔"Z2

مرزا کے مختلف بیانات کی روشنی میں ان کی ولادت کی تاریخ 8۔ رجب 1212ھ (دسمبر 1797) تسلیم کی گئی تھی لیکن ڈاکٹر حنیف نقوی نے محققانہ بحث کے بعد لکھا ہے کہ:

"غالب کی اصل تاریخ ولادت یکشنبہ 8۔ رجب 1208ھ (9 فروری 1794) ہے اور انھوں نے اپنی عمر بالقصد چار سال کم کر کے بتائی ہے۔"Z3

خوب چند ذکا وہ پہلا تذکرہ نویس معلوم ہوتا ہے جس نے اپنی معلومات کی روشنی میں مرزا غالب کا تعارف کرایا ہے، اس طرح:

"مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبداللہ خاں عرف مرزا دولھا، نبیرۂ مرزا غلام حسین خاں کمیدان، ساکن بلدۂ اکبر آباد، شاگرد مولوی محمد معظم و شاعری فارسی و ہندی است۔"

اس مختصر سی عبارت سے کئی لائق توجہ باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ اُس ابتدائی زمانے میں بھی اسداللہ کا تخلص غالب تھا البتہ کلام شاہد ہے کہ نام کے جزو اصلی یعنی لفظ اسد کو بھی تخلص کے طور پر صَرف کر لیتے تھے بلکہ اپنے سسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی طرح کبھی کبھی اپنے پورے نام کو (بہ اضافۂ لفظ خاں) تخلص کی جگہ نظم کر دیتے تھے۔ یہ بیٹا اور باپ دونوں ہی اپنی اپنی سسرالوں کے تعلق سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ بیٹا مرزا نوشہ ہو گیا۔ باپ مرزا دولھا تھا۔ تذکرہ نویس کو شاید باپ کے باپ کا نام معلوم نہیں تھا، یا ممکن ہے باپ کے سسر کے مقابلے میں اس کی حیثیت قابلِ ذکر نہ رہی ہو۔ ننھیالے سسرال کے تعلق سے نواب معروف کے داماد مرزا نوشہ کے ساتھ

شفقت، محبت اور عزت سے پیش آتے تھے اور تفصیلات سے واقف نہ ہونے کے باوجود اِس مرزا نوشہ کے خاندان کو بھی معزز خیال کرتے تھے۔ دہلی کے بعض عمایدسے مرزا نوشہ کے روابط قائم ہو گئے تھے۔ اعظم الدولہ محمد خاں سرور نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے:

''اسد تخلص، اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد، جوانِ قابل و یار باش و دردمند۔ ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ۔ ذوقِ ریختہ گوئی درخاطر متمکن..... غمہائے عشقِ مجاز، تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز۔ درفنِ سخن سنجی قبح محاورات مرزا عبدالقادر بیدل در ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موبہ طرزِ خوداست و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش از زمینِ سنگلاخ بہ مضامینِ نازک موزوں گشتہ۔ زاویۂ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد۔''74

لائقِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ سرور کے ساتھ ''رابطہ یکجہتی کے مستحکم'' ہونے کا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ تذکرہ ذکا میں جتنے نام آئے تھے یہاں تک کہ باپ کا نام اور خود اپنا وہ تخلص یعنی غالب بھی تذکرۂ سرور میں درج نہیں ہو سکا۔ تقریباً یہی کچھ شیفتہ کے تذکرے میں بھی ہوا ہے اور ان کے ساتھ مرزا نوشہ کے مراسم کا حال تو مشہور ہے۔

اس مقام پر حکیم قطب الدین باطن کی تحریر پر بھی نظر کی جانی مناسب ہے:

''غالب و اسد تخلص، اسد اللہ خاں نام، ملقب بہ مرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے ہیں۔ کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔ از نبایرِ غلام حسین خاں کمیدان۔ قبل اس سے جدِ دہلی میں ان کی سکونت کا مکان، استادانِ باشعور کے مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادیِ شعرا..... اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں۔ ہاں خود استاد ہیں۔ بندے کے والد مرحوم سے کمال ملاقات تھی اور از حد اتحاد کی بات تھی..... اب یہ دلی والے ہیں اور بڑے ارادے والے ہیں۔''75

غالب نے کسی استاد سے تلمذ کو تسلیم نہیں کیا ہے ایک ہر مزد ثم عبدالصمد کا ذکر اِس طرح کیا ہے کہ آج تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ یہ کوئی شخص واقعی تھا بھی یا نہیں۔ ایسے میں وہ میاں معظم سے

تلمذاور باطن کے والد کے ساتھ مراسم کا اعتراف کیا کرتے۔

سید علی حسن خاں نے میاں معظم کے بارے میں اتنا لکھا ہے:

"معظم، محمد معظم اکبرآبادی، مردے بود متوکل و در نظم فارسی اور اقدرت کامل، شصت وچند سال بر کرسی زندگی نشست و در اواسط مایۂ ثالث عشر بہ رحمتِ ایزدی پیوست۔"76

ذکا اور اُن کے بعد باطن کی شہادت کو سرسری نظر انداز کر دینا بیجا ہے۔ تسلیم کرنا چاہیے کہ مرزا اسداللہ خاں نے ابتدائی زمانے میں فارسی کی مشق مولوی محمد معظم سے کی تھی۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف الور میں رہے تھے۔ وہیں مرزا نوشہ کے والد مرزا دولھا سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ مرزا دولھا یعنی عبداللہ بیگ وہیں کسی لڑائی میں مارے گئے تھے۔ ادھر خود معروف کا حال بقول میاں رنگین یہ ہوا کہ ؎

معروف کے پاس ہے نہ سیم اور نہ زر اوقات بسر کرتا ہے وہ اپنی بشر
رنگین ہے اِن دنوں یہ صورت اُس کی کانا ٹٹو ہے اور بڈھو ہے نفر

انھوں نے عبداللہ بیگ کے یتیم بیٹے اسداللہ بیگ کے ساتھ اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی کر دی۔ شادی کے کچھ مدّت کے بعد داماد نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ اسداللہ بیگ کی کفالت ان کے چچا نصراللہ بیگ نے کی تھی۔ وہ مر گئے تو نواب احمد بخش خاں کی سفارش سے اُن کے اخلاف کے لیے جو وظیفہ مقرر ہوا تھا اس میں اسداللہ بیگ متخلص بہ غالب بھی شریک رہے۔ احمد بخش خاں کی طرف سے ان کے بھائی الٰہی بخش خاں معروف کا دل صاف نہ تھا۔ بقول سعادت یار خاں رنگین ؎

معروف ہوا ہے خشک جوں سوکھی مشک اور بہتے مدام اس کی ہیں آنکھ سے اشک
رنگین خفقاں نہیں ہے مطلق اُس کو یہ احمد بخش خاں کی دولت کا ہے رشک

مرزا نوشہ احمد بخش خاں کی تقسیم سے مطمئن نہیں ہو سکے تھے اِس لیے وہ اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ تک گئے۔ راستہ میں فرخ آباد، کانپور، لکھنؤ، پانده، بنارس، مرشد آباد، وغیرہ مقاموں پر قیام کیا اور اپنے سفر کے عمل کے مطابق ان مقاموں کی بعض نام برآوردہ شخصیتوں سے معرکہ آرا ہوئے ع:

تا خلق کہے کہ یہ بھی شاعر ہے بڑا

کوئی تین برس بعد دلّی میں واپس میں آئے۔ پنشن کا مقدمہ خارج ہوگیا۔ نواب شمس الدین خاں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ فیروز پور جھرکہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد غالب کو انگریزی خزانہ سے پنشن ملنے لگی۔

پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں غالب کو ذاتی اور خاندانی وجاہت بھی ثابت کرنی پڑی۔ انھوں نے فارسی میں باضابطہ طور سے شاعری شروع کر دی اور اپنے خاندان کا حال جس طور پر بیان کیا، مختصراً یہ ہے:

> ''خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہِ توران سے ملتا ہے..... سینکڑوں برس بعد پھر اقبال اِدھر جھکا اور تلوار سے تاج نصیب ہوا چنانچہ سلجوقی خاندان کی بنیاد انھیں میں قائم ہوگئی۔ کئی پشتوں کے بعد اس نے پھر رخ پلٹا۔ مرزا صاحب کے دادا دہلی میں آئے۔''77

اکبر شاہ ثانی کے آخر زمانہ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنا تذکرہ لکھا۔ غالب کے بارے میں انھوں نے جو لکھا ہے یہ ہے:

> ''غالب تخلص اسم شریفش اسداللہ خاں المشتہر بہ مرزا نوشہ از خاندانِ نجم است واز رؤسائے قدیم سابقاً مستقر الخلافہ اکبرآباد..... اکنوں دارالخلافہ شاہجہاں آباد..... سالہاست کہ پایہ دائرہ شاعری نہادہ، در اوایلِ حال بہ تقاضائے طبعِ دشوار پسند بہ طرزِ مرزا عبدالقادر بیدل سخن می گفت ودقت آفرینہا می کرد۔ آخر الامر ازاں طریقہ اعراض کردہ اندازے دگر مطبوعِ ابداع نمودہ ودیوانش را بعد ترتیب وتکمیل دیگر گریست، فراواں ابیات ازاں حذف وساقط کردہ، قدرِ قلیلے انتخاب زدہ، مدتہاست کہ بہ قلمِ ریختہ سرے نہ دارد۔ در زبانِ فارسی نیز دستگاہ بے بلند ومایۂ وافر بہم رسانیدہ..... غزلش چو غزلِ نظیری بے نظیر وقصیدہ اش چوں قصیدۂ عرفی دلپذیر۔ مضامین شعرے را کما ہو حقہ می فہمد..... وجمیع نکات ولطائف پے می برد واین فضیلتے است کہ مخصوص بعض اہلِ سخن است۔ دیوانش بہ نظر رسید۔''78

اپنے دیوان کے بارے میں غالب نے خود لکھا ہے کہ:

''پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اُس دیوان کو رد کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔''79

بہرنوع جو دیوان مکمل ہو کر رائج ہوا، کہنے والے نے اُس کے بارے میں کہا۔

ڈیڑھ جُز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر دیوان غالب کا ایک مخطوطہ ''دریافت'' ہوا جس کے ترقیمہ کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے:

''تمت تمام شد بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دو پہر روز باقی ماندہ فقیر بیدل اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ، متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوانِ حسرت عنوانِ خود فراغت یافتہ، بہ فکرِ کاوشِ مضامین دیگر رجوع بہ جناب روح میرزا علیہ الرحمۃ آوردہ۔''80

دعویٰ کیا گیا کہ یہ نسخہ 14 رجب 1231ھ کو مرزا نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس کے حواشی پر بعض غزلوں کا اضافہ کیا تھا اور متن میں لکھے ہوئے کلام پر اصلاحیں بھی دی تھیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس کے عکس چھپ کر اچھی قیمت پر فروخت ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ ترقیمہ کی عبارت غالب کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی، اِس سال میں دیوان کا مرتب ہو جانا بھی غالب کے مذکورہ بیان کی روشنی میں خلافِ قیاس ہے۔ راقم سطور نے جب اِس معاملہ میں اہلِ تحقیق کو غور و فکر کی دعوت دی تو مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے اُس جُرم کی پاداش میں ہر طرح کی کوشش کی کہ اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ اس نسخہ میں کثافت کو ''س'' سے لکھا گیا ہے۔ کئی برس کے بعد پروفیسر گیان چند جین صاحب نے جن کی تحریر دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، ''کتاب نما'' بابت اکتوبر 1998 میں انکشاف کیا کہ ان کے دادا بھی برسوں افغانستان میں رہنے کے باوجود ''کسافت'' کو ''س'' سے لکھتے تھے۔ اپنے اس عالمانہ مقالے میں موصوف نے مجھے جولاہہ اور پیر نابالغ وغیرہ خطابات سے نواز کر اپنی غالب شناسی کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ غرض اس

نسخہ دیوان غالب کی بدولت بہتوں کے نام اور بعضوں کی دکان خوب چمکی اور ایک دو کی ذات بھی پہچانی گئی۔

غالب اردو کے مقبول ترین شاعر ہوئے ہیں۔ ان کے طرز میں ہر زمانے میں لوگ شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ جلیل قدوائی نے اس کی ایک اور ہی صورت بیان کی ہے:

> ''کسی نے سوال کیا: کہیے آسی صاحب، غالب کا غیر مطبوعہ کلام کچھ ہوا؟.....آسی صاحب نے اس طور پر جواب دیا: جی کیوں نہیں؟ پچھلے دنوں تھوڑا بہت ہوا ہے۔ وہ پیش کرتا ہوں۔ یہ کہا اور ایک آدھ غزل یا اشعار ایسے سنائے جن پر بلاشبہ غالب کے فن کی چھوٹ پڑتی معلوم ہوتی تھی۔ ڈاکٹر عظمت الٰہی کی ایک خاندانی بیاض کے حوالے سے آسی صاحب کی دریافت کے طور پر نیاز صاحب نے نگار میں غالب کا غیر مطبوعہ کلام شائع کیا۔ بعد میں کچھ اور چیزیں شامل کر کے آسی صاحب نے اسے کلام غالب کا ایک مستقل حصہ بنا دیا..... جناب عرشی رامپوری نے بھی اپنے مرتبہ دیوانِ غالب میں یادگار نالہ کی ذیل میں آسی کے حوالے سے اس تمام کلام کو شامل کر لیا ہے۔ اس کے معتبر ہونے میں ضرور شبہ ظاہر کیا مگر کن اسباب کی بنا پر، یہ انھوں نے نہیں لکھا۔''81

جعل تو بیشک یہ بھی تھا لیکن اِس سے مقصود تفریحِ طبع کے علاوہ غالب پرستوں کا امتحان لینا بھی تھا اور کچھ شک نہیں کہ جعل بنانے والے اپنے اس مقصد میں بھی پوری طرح کامیاب رہے تھے۔

غالب کے دیوان کا ایک قدیم نسخہ کئی برس پہلے بھوپال میں ملا تھا۔ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

> ''اس کے شروع میں ایک صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے۔ 'دیوانِ ہذا من تصنیف مرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خان بہادر دام اقبالہ، قلمی خوشخط، اور اس کے سامنے ان کی مہر ہے اور خاتمہ پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے۔ دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر

1237 من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت، اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے۔ شروع میں خوبصورت طلائی کام ہو رہا ہے اور تمام صفحات پر سنہری جدول ہے۔"82

یہ نسخہ "دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ" کے نام سے مفتی محمد انوار الحق کی تمہید اور عبدالرحمٰن بجنوری کے حالات کے علاوہ بجنوری کے لکھے ہوئے مقدمہ کے ساتھ جو بعد میں "محاسنِ کلامِ غالب" کے نام سے بار بار کتابی صورت میں چھپتا رہا ہے۔ شائع ہوا تھا۔ تا حال دیوان غالب کی یہی قدیم ترین گویا مستند روایت ہے۔ مخطوطہ جیسا کہ مشہور ہے۔ کہیں غائب ہو گیا لیکن کئی لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بھوپال ہی میں کسی متعلق شخص کے پاس موجود ہے۔ صحیح صورتِ حال کا علم اللہ کو ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کے "ذخیرۂ شیرانی" میں غالب کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ اس کے بارے میں سید قدرت اللہ نقوی نے لکھا ہے:

"نسخہ شیرانی حافظ محمود شیرانی نے کہیں سے حاصل کیا تھا۔ اس میں صرف ایک سو نو ورق ہیں۔ ورق ۱۔ الف پر صرف دیوانِ غالب اردو بخطِ شکستہ لکھا ہے..... ورق سولہ اور چھبیس کے بعد نقصان ہے اور 106، 109 کے بعد بھی۔"83

قاضی عبدالودود نے اس کے زمانۂ کتابت کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ:

"ش (نسخہ شیرانی) کا زمانۂ کتابت اس کتاب میں درج نہیں لیکن قیاس چاہتا ہے کہ اس میں کوئی چیز ماۃ سیزدھم کے عشرۂ چہارم کے نصف اول سے پہلے کی لکھی ہوئی اور 1245ھ (=1829-30) کے بعد کی نہ ہو۔"84

لیکن اس قیاس سے مخطوطے کی زمانۂ کتابت وغیرہ کا تعین نہیں ہوتا..... نسخہ کے نقص کے باوجود اس کی قدامت اور اہمیت تسلیم کر لی گئی ہے، اور اس سے سب سے پہلے امتیاز علی عرشی نے اپنے دیوان غالب (نسخہ عرشی) میں استفادہ کیا تھا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شاعری کے بارے میں شیفتہ کی رائے کو سب تسلیم کرتے ہیں چنانچہ ابتدائی زمانے کی ان کی ایک دو غزلوں کے اشعار یہ ہیں ۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
خشت پشت دست مجز و قالب آغوشِ وداع　　پُر ہُوا ہے سیل سے پیمانہ کس تعمیر کا
جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابیِ کمند آیا　　سویدا تا بلب زنجیریِ دودِ سپند آیا
شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
اُگی اک پنبۂ روزن سے تھی چشمِ سفید آخر　　حیا کو انتظارِ جلوہ ریزی کے کہیں پایا
نزاکت ہے فسوں دعویٔ طاقت شکستن ہا　　شرار سنگ انداز چراغ از جسم خستن ہا

بسانِ جوہر آئینہ از ویرانیِ دلہا
غبارِ کوچہ ہائے موج ہے خاشاکِ ساحلہا

مولانا محمد حسین آزاد نے مرزا غالب کی اِس شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اُس سے ہزاروں درجہ عالمِ معنی میں کلام بلند ہے، بلکہ اکثر شعر ایسے اعلا درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارساذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔''

مرزا خود بھی اس حقیقت سے واقف تھے چنانچہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

آخر یہ ہوا کہ انھوں نے بقولِ ''خود اُس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کیے'' اور بڑی کوشش سے ''اندازِ دگر'' ایجاد کیا چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں جو غالباً طرحی ہے کہتے ہیں۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

دعوے جو بھی ہوں نتیجہ خود ان کے بقول یہی تھا کہ۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد　　کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اور وہ یہی کہتے رہے کہ۔

دلّی کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت　　بیچارہ چند روز کا یہاں مہمان ہے

اور ؎

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتا اسد　　میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

اس زمانے کے ان کے چند شعر یہ ہیں ؎

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے　　جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے　　بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بلائے جاں ہے غالب اُس کی ہر بات　　عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں　　غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر　　بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے　　جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

14۔ ممنون

مولانا محمد حسین آزاد نے ممنون کو عہدِ اکبر شاہی کے کہنہ مشق استادوں میں شمار کیا ہے۔ شیخ مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں اُن کے دو شاگرد یعنی میر بشارت علی بشیر 85 اور میر سعادت علی تسکین 86 کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ممنون 1209ھ (=1794-95) سے پہلے ہی استادی کے درجے تک پہنچ چکے تھے۔ خود ممنون کے تعارف میں مصحفی نے لکھا ہے:

میر نظام الدین ممنون تخلص، خلف الرشید میر قمر الدین منت، جوانِ سعادت مند و ذی شعور است۔ در حینِ حیاتِ پدر بزرگوار بعد تحصیلِ کتب رسمی بہ مقتضائے موزونیِ طبع خود را مصروفِ گفتنِ شعر ہندی و فارسی می داشت تا آنکہ در عرصۂ قلیل قوتِ شاعری چنانکہ شاعر را باید پیدا کرد و کلامِ خود بہ رتبۂ کلامِ پدر رسانید۔ اکثرے از موزونانِ شہر استفادۂ شعر ازوی کند۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔" 87

قدرت اللہ قاسم نے ان کو شاہ عالم ثانی کے درباری شاعروں میں شمار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میر نظام الدین سلمہ خلف الصدق میر قمر الدین منت وے جوانیست شیریں سخن واقف اکثر اصول این فن، سلیس گفتار، فصیح زباں، نیکو کردار، عذوبت بیان، در سلکِ شعرائے پائے سریر خاقانی انتظام و بہ قدر شناسی دودیدہ وری حضرت ظل سبحانی بہ خطاب مستطاب فخر الشعرای عزو احترام داشت و موافق طبع مشکل پسند بادشاہی بدیہہ ہم از دسر انجام میں یافت۔ حسب الحکم ارفع اعلیٰ قصہ برشتہ نظم کشیدہ..... فیضِ سخن از پدر والا قدر خود بودہ۔ از چندے استعفائے خدمتِ حضور فیض گنجور نمودہ۔'' 88

شاہ عالم بادشاہ کی ملازمت سے مستعفی ہو کر ممنون نے سرکارِ انگریزی میں رسائی حاصل کی اور پھر کچھ مدت تک اجمیر میں رہے چنانچہ شیفتہ کے تذکرے میں ہے۔

''ممنون تخلص..... نظام الدین نام مہین پور قمر الدین منت است۔ اصلش از قصبہ سونی پت بمن توابع دار الخلافہ شاہجہاں آباد و مولد و منشالیش ہمیں شہر فخستہ بنیاد، کسب فنون از خدمتِ والدِ بزرگوار خود کردہ، مدتے بہ لکھنو بسر بُردہ، از پیش گاہِ خلافت فخر الشعرا لقب یافتہ، اکنوں از چند گاہ بہ کوہستانِ اجمیری گذراند۔ طرزِ گفتارش خیلے دلچسپ و دلنشیں است۔ قوتِ نظم اکثر اصناف سخن دارد، دیوانش بہ نظر رسید۔'' 89

میر ممنون اور اُن کے والد منت دونوں جہاں گشت قسم کے لوگ تھے، ان کے کلام کا بھی وہی حال تھا کہ اس میں ہر رنگ اپنا انداز دکھاتا تھا چنانچہ مشکل زمینوں میں ان کے چند شعر یہ ہیں۔

قدوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنون — وہی فتنہ ہے لیکن یہاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

ہے سایہ فگن زلفِ سیہ فام زمیں پر — یا صبح قیامت کی ہے یہ شام زمیں پر

کیا دل کوئی اُس قاتلِ بے باک سے باندھے — جو ذبح کرے اور نہ فتراک سے باندھے

کچھ درد کی لذت ہے فراموش کوئی اب
الماس کا سودہ جگرِ چاک سے باندھے

اہل دہلی کے طرز میں ان کے کچھ شعر یہ ہیں۔

ممنوں ہو حشر تک شہِ اکبر کا پرتو — روشن رہے یہ دودۂ تیمور کا چراغ

اک اور غزل بھی کوئی پُر دردسی پڑھ لے　　ممنون تجھے سنتے ہیں فخر الشعرا ہم
برا مانئے مت مرے دیکھنے سے　　تمھیں حق نے ایسا بنایا تو دیکھا
قربان ناز نعش مری دیکھ کر کہا　　گردن پہ کس کی خون ہے اس بے گناہ کا

لکھنؤ والوں کے انداز کے کلام کی مثال۔

ہاتھ پر کس کے کر آیا ہے رسائی کاغذ　　ہے جواب خطِ ممنون حنائی کاغذ
خط نہ لکھنے کی ہو کیا اس سے شکایت ممنون　　جب اٹھاتے ہی لچکتی ہے کلائی کاغذ
فقط میں ہوں کہ تو کر اٹھ کے دربند　　گلے لگ پھر قبا کے کھول کر بند
کہاں کے لیجیے بوسے شب شوق　　وہاں لبریز صد شوخی ہے ہر بند

ممنون کی شاعری کا عام جوہر زبان کی فصاحت اور بیان کی سلاست ہے۔ زندگی کے معمولات سے وہ مضامین حاصل کرتے تھے اور ان کے سامنے کی باتوں کو روزمرہ اور بول چال کے مطابق اس طرح نظم کرتے تھے کہ اکثر اشعار ضرب المثل بن کر زبانوں پر جاری ہو جاتے تھے چنانچہ چند شعر نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔

بس حنا زور آزمائی ہو چکی　　دلبروں سے ہاتھ پائی ہو چکی
رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت　　صلح کیجیے بس لڑائی ہو چکی
غضب ہے بیکسانہ راہ درپیش　　رفیق وہمرہ وہم پا نہ پایا
میں نثار اُس شوخ کے، اپنی بلائیں آپ لیں　　آئینہ میں زلف چھوٹی، اپنے منھ پر دیکھ کر
کہیں جانا ہے تو جا چک کہ اگر جان بھی جائے　　نہ ٹلاؤں نہ ٹلاؤں نہ ٹلاؤں تجھ کو
میں نامہ و پیغام سے گذرا کہیں یارب　　کچھ قاصدِ بیچارہ کی اپنے خبر آئے
مکتب میں بھی سبق تھا الف لام میم کا　　طفلی ہی سے ہوا ہوں میں خوگر الم کے ساتھ

ممنون نے اکثر مقطعوں میں اپنی شاعری کی بعض خوبیوں کا بیان کیا ہے۔ مثلاً

ہم ہیں مشتاق غزل اور بھی پڑھ لے ممنون　　ہے الگ سب سے تری طرز بیاں کہتے ہیں
گلریزیِ الفاظ نہ کچھ سہل ہے ممنون　　خوں نوشیِ پنہاں سے یہ رنگیں سخنی ہے

اور بھی ممنوں غزل پڑھ لیجیے دیکھیں تو ہم خوبیِ ترکیب والفاظ ومعانی آپ کی
نہ غزل گو کوئی ہے ممنوں سا ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

15۔مومن

حکیم محمد مومن خاں مومن صاحب کمالات شخص تھے اور غالباً یہ بھی شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت میں کسی قدر کمی کے وجوہ میں سے ایک ہے۔مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات کی پہلی اشاعت میں اُن کا حال نہیں لکھا تھا۔دوسری اشاعت میں انھوں نے اِس کا سبب اِس طرح بیان کیا ہے:

''پہلی دفعہ اِس نسخہ میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا۔وجہ یہ تھی کہ دو رپنجم جس سے ان کا تعلق ہے بلکہ دور سوم وچہارم کو بھی اہلِ نظر دیکھیں کہ جو اہلِ کمال اس میں بیٹھے ہیں کس لباس وسامان کے ساتھ ہیں۔کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان وشان اور وضع ولباس کے ساتھ ہو۔خان موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں لیکن میں نے اکثر اہلِ وطن کو خطوط لکھے اور لکھوائے۔وہاں سے جواب صاف آیا۔ایک صاحب کا مراسلہ پہنچا ہے جس میں کئی اسرار نجومی ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور ان کے شاگردوں کی تفصیل بھی لکھی ہے۔آزاد ان کے درج کرنے میں قاصر ہے.....لوگ کہیں گے کہ تذکرہ شعرا لکھنے بیٹھا اور نجومیوں کا تذکرہ لکھنے لگا۔''90

ایک اتفاقی بات یہ بھی ہے کہ نواب شیفتہ نے گلشنِ بے خار کے نام سے جو تذکرہ لکھا تھا بعض لوگوں کو اس سے شکایت ہوئی اور انھوں نے اس کا جواب لکھا۔مومن نواب صاحب کے استاد تھے اس لیے خواہی نخواہی وہ بھی زد میں آ گئے۔مثال کے طور پر باطن نے لکھا ہے۔:

''مومن.....شاگردانِ سخن کے استاد.....اپنا استاد، باپ، پیر اگرچہ ناقص ہو کامل کہا جاتا ہے۔اس مرتبہ تک کہ وہ تعریف حد سے زیادہ گذر کر صورتِ ہجو ملیح ہو جائے.....صاحب گلشنِ بے خار اپنے غم وجوش وخروش میں آ کر شرابِ خودی سے بیہوش ہو گئے۔.....''91

بہرنوع حکیم مومن خاں کے بارے میں اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرے میں تحریر کیا تھا کہ:

''مومن تخلص، حافظ محمد مومن، نوجوانے است، ہمت بر تحصیل کتب عربی مصروف

دارد۔ اصلش از خطۂ کشمیر، مولدش دارالخلافہ شاہجہاں آباد، اجدادش بہ عزت و بزرگی
بسر بُردند، وبہ شعر گوئی بسیار مطبوع، شخص بسیار خلیق است۔"92

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا حافظہ قوی تھا اور کتب علمی کی تحصیل کی تھی۔ ان کی عزت اور خودداری گویا موروثی تھی۔ نوجوانی کے زمانے کے ان کے چند اشعار یہ ہیں۔

گر بھول کے یاں آن وہ خود کام نکلتا　　دَم کا ہے کو یوں اے بتِ خود کام نکلتا
شب ذکرِ سیہ مختیِ عشاق جو آتا　　کیا صبح کو خورشید نہ تا شام نکلتا
تاکید تھی واں چھوڑتے تھے پوچھ کے شب نام　　تھا قہر جو کوئی مرا ہمنام نکلتا
جلتی ہیں سدا سوزشِ گریہ سے یہ آنکھیں　　آتش کا یہاں آب سے ہے کام نکلتا

معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب دیوان کے وقت اُنھوں نے اپنے کلام پر نظر ثانی کی تھی۔ چنانچہ دیوان میں اس غزل کے اشعار اس طرح ہیں۔

گر غیر کے گھر سے نہ دل آرام نکلتا　　دم کا ہیکو یوں اے دل ناکام نکلتا
کرتے جو مجھے یاد شب وصلِ عدو تم　　کیا صبح کہ خورشید نہ تا شام نکلتا
ہر ایک سے اس بزم میں شب پوچھنے سے نام　　تھا لطف جو کوئی مرا ہمنام نکلتا
کیوں کام طلب ہے مرے آزار سے گردوں　　ناکام سے دیکھا ہے کہیں کہیں کام نکلتا

اسی زمانے کا ان کا ایک مطلع یہ بھی ہے۔

اضطراب دل سے میں جو رات گرم نالہ تھا　　ہالۂ ماہ منور شعلۂ زوالہ تھا

مرزا غالب بھی ابتدائی زمانے میں اسی طور پر فارسی آمیز شعر کہتے تھے۔ مومن کے کلام میں البتہ یہ صورت عام نہیں ہے۔ چنانچہ اس مطلع کو بھی انھوں نے اپنے دیوان میں شامل نہیں کیا ہے۔

چند سال کی مشق کے بعد مومن نے استادی کا درجہ حاصل کر لیا چنانچہ شیفتہ کے تذکرے میں اکبر خاں اکبر، میر حسین تسکین، غلام احمد شورش، وغیرہ ان کے کئی شاگردوں کا حال مندرج ہے۔ خود مومن کے بارے میں لکھا ہے۔

"مومن تخلص لبے بہا لعل کانِ سخندانی۔ فریدِ عصر، یکتائے دوراں، جامع فنون شتی، حکیم محمد مومن خاں، از خاندان نای است... ہر چند نظر بہ کمالات متنوعہ شاعری دون مرتبہ

اوست لما چوں سخن دریں فن است اعراض نا مستحسن، زبان جادو طرازش سحر را بہ مرتبۂ اعجاز رسانیدہ... اکثر کلامش بخواہش داعی آثم صورت ظہور گرفتہ و ہم تدوین افکارش را فقیر باعث گشتہ، دیباچۂ آں کہ ریختہ خامۂ ملست دراں بہ تفصیل این ماجرا باز کردہ ام واکنوں کہ التفاتے بہ نظم ریختہ کمتر دارد... بہ زعم فقیر بہ قوت شاعری ایشاں کم کسے برخاستہ... بیاد بہ دیوانش نظر کن وہ بہ تصدیق وتکذیب من زبان انصاف بکشا، از روز ولادت الی حال بہ سب موالفت جہاں آباد وہیل جہاں آباد بہ سمتے حرکت نہ کردہ، بہ وصال یاران رنگین وبہ وصل شاہدان شیریں عمرے خوش می گذارد، دیوانش مملو از اصناف سخن است ومثنویات متعدد دارد کہ ہر یکے رشک گلشن است وغیرت چمن۔"[93]

حکیم مومن دلّی میں رہ رہے تھے۔ یہیں پلے بڑھے تھے۔ یہاں کے محاورے زبان پر جاری تھے۔ صاحب علم تھے۔ فارسی پر قدرت رکھتے تھے اور اپنے کلام کو فارسی کی ترکیبوں، تلمیحوں وغیرہ کے ساتھ بڑی خوبی کے ساتھ مزیّن کرتے تھے۔ ان کے بیشتر اشعار سلاست اور روانی کی وجہ سے زبانوں پر جاری اور حافظوں میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ چند شعر یہ ہیں۔

اُس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
نہ جاؤں گا کبھی جنت میں، میں نہ جاؤں گا — اگر نہ ہووے گا نقشہ تمھارے گھر کا سا
محو مجھ سا دمِ نظارۂ جاناں ہوگا — آئینہ آئینہ دیکھے گا تو حیراں ہوگا
اسلئے وہ شکوہ کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بے طاقتی کے طعنے میں عذر جفا کے ساتھ
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس — ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے
میرے تغییر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مومن کے حال میں آزاد نے لکھا ہے کہ:

"شعر وسخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور بھی چمکایا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا تھا مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور پھر کسی اور کو استاد نہیں بنایا۔"[94]

اُس ماحول میں اپنی قوتِ مشقی اور قدرتِ کلام کے اظہار کے لیے اکثر دو غزلے لکھے جاتے

تھے چنانچہ مومن کے دیوان میں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مطلع اور مقطع یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

لے اڑی لاشہ ہوا، لاغر زبس تن ہوگیا ذرۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہوگیا
اپنے ڈھب کی کیا پڑی اک اور مومن نے غزل دو ہی دن میں یہ تو کیسا ماہرِ فن ہوگیا

بظاہر یہ نومشقی کے زمانے کا دو غزلہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ہی دن کی مشق کے بعد مومن نے شعوری طور پر غزل گوئی کا اپنا الگ ''ڈھب'' نکال لیا تھا، البتہ وقت کے طور طریقوں کی بقدرِ ضرورت پابندی کرتے تھے۔ اِس غزل میں بھی انھوں نے استاد شاہ نصیر کی روش کے مطابق یہ قطعہ شامل کیا تھا۔

دور کی چاہت کا تو نے جب کیا مجھ پر خیال تب مجھے بھی تجھ سے وہم ربطِ دشمن ہوگیا
صاف تھا تو جب تلک مجھ سے، تو میں بھی صاف تھا بدگمانی سے تری اب میں بھی بدظن ہوگیا

غالباً اسی زمانے کا یہ دو غزلہ بھی ہے۔

اک اور پڑھ وہ مومنِ شعلہ زباں غزل جل جائیں جس کے رشک سے حاسد بسانِ شمع
محفل فروز تھی تپِ تابِ نہانِ شمع پروانہ جل گیا کہ نہیں رازدانِ شمع

لائیں نہ تابِ حرفِ بُتاں کافرانِ عشق
پروانہ کو تجسم ہے مومن زبانِ شمع

اس ردیف میں اور قافیہ میں اضافت کی پابندی کے ساتھ غزل کہنا آسان نہیں تھا۔ مومن نے دو غزلہ کہا اور اپنے ڈھب کے اچھے اچھے شعر نکالے، اور اپنے ''ماہرِ فن'' ہونے کا اچھا ثبوت پیش کر دیا۔

مومن کے کلام کی خصوصیات کے سلسلے میں ان کے حلیہ اور پھر عقیدے سے واقفیت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ آزاد نے لکھا ہے:

''رنگین طبع، رنگین مزاج، خوش وضع، خوش لباس، کشیدہ قامت، سبزہ رنگ، سر پر لمبے لمبے گھونگھر والے بال اور ہر وقت انگلیوں سے ان میں کنگھی کرتے رہتے تھے۔ ململ کا انگرکھا، جھلے دار پائنچے اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔ میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ ایسی

دردناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ نوجوانی ہی
میں مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہو گئے تھے۔"95

غور کیجیے تو ان کی شاعری کی صورت بھی یہی ہے۔ کلام اپنی زبان کی خوش وضعی، بیان کی رنگینی، خیالوں کی کشیدہ قامتی کا مرقع ہوتا تھا۔ مضامین عموماً تہ دار ہوتے تھے اور غور و فکر کے بعد ہی اصل مفہوم سامنے آتا تھا۔ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع یا محور عشق ہے اور درد و سوز عاشقی کے لوازمات ہیں چنانچہ پڑھتے وقت آواز بھی ایسی ہی ہو جاتی تھی۔ اپنے کلام کی اسی کیفیت کی وجہ سے انھوں نے اپنی غزل کو مرثیہ کا بدل کہا ہے۔

تو غزل سنج ہے یا مرثیہ خواں اے مومن رو دیا جس نے کہ دیکھا ترا لکھا کاغذ

بریلوی صاحب کی مریدی نے ان کی زندگی کے معمولات کو بھی متاثر کیا تھا اور اس تاثر کا اظہار کئی طور پر ہوا ہے۔ ایک دو غزلہ میں معمولات میں تبدیلی کے رونما ہونے کی طرف اشارے موجود ہیں۔

حکیم صاحب کے چند شعر یہ ہیں۔

ناصح کفِ افسوس نہ مَل، چل تجھے کیا کام پامال کریں گے وہ مجھے یا نہ کریں گے
مومن وہ غزل کہتے ہیں اب جس سے یہ مضموں کھل جائے کہ ترکِ دیر و بت خانہ کریں گے
توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے وہ کرتے ہیں اب تک نہ کیا تھا نہ کریں گے
گر آرزوِ وصل نے بیمار کیا تو پرہیز کریں گے پہ مداوا نہ کریں گے

اسی میں ایک قطعہ بھی شامل کیا ہے اور وہ یہ ہے۔

جوں قبلہ نما گرچہ تڑپتے ہی کٹے عمر پر مُنہ سوِ دیر و صنم آرا نہ کریں گے
اے حضرتِ مومن یہ مسلّم جو ہے ارشاد بھولے سے بھی اب ذکرِ بتوں کا نہ کریں گے
لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

طبیعت میں شروع سے رکھ رکھاؤ تھا۔ وقت کے ساتھ اس نے خودداری بلکہ انانیت کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غزل میں واسوخت کا جیسا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ ایک دو غزلے میں کہتے ہیں۔

کہہ اور غزل بہ طرزِ واسوخت مومن یہ اُسے سنائیں گے ہم

اوراس طرز میں جوغزل کہی اس کے کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

دشمن کے کہے سے روٹھتا ہے وہ ہی کہے تو منائیں گے ہم
اب اور سے لولگائیں گے ہم جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
گردیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم
بت خانہ چیں ہوگر ترا گھر
مومن ہیں تو پھرنہ آئیں گے ہم

اس طرح مومن کی غزل محض غزل نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ اس میں بعض دوسری اصناف شعری کا لطف بھی شامل ہوگیا تھا اور یہ وہ خوبی تھی جس نے اسے منفرد اور ممتاز بنادیا تھا۔ معاصرین اپنے اپنے ہنر کے مطابق جواب پیش کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، لیکن سارے زوروشور کے باوجود وہ بات کہاں آسکتی تھی۔

مومن سے اچھی ہو غزل، تھا اس لیے یہ زوروشور
کیا کیا مضامیں لائے ہم کس کس ہنر سے باندھ کر

مشق واکتساب کی اہمیت بھی مسلّم ہے لیکن شاعری ایک خداداد ملکہ ہے اور مومن اسی پر انحصار کرتے تھے۔ ایک مقطع میں کہتے ہیں۔

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہوگا

مومن کے کلام کا تجزیہ کرنے کے بعد نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ:

''مومن کے یہاں تشبیہات تقریباً مفقود ہیں۔ استعارات ہیں لیکن زیادہ نہیں۔ کنایہ کی افراط ہے اور پوری تکمیل کے ساتھ..... مومن نے اپنے سارے کلیات میں سوائے حکایاتِ حُسن وعشق کے اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھا اور اس سلسلہ میں جتنے پہلو گفتگو کے نکل سکتے ہیں یا جس قدر تلخ وشیریں تجربات حاصل ہوسکتے ہیں وہ سب کے سب کسی نہ کسی صورت میں ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں اور ان کا یہ رنگِ تغزل اس قدر گہرا تھا کہ قصائد تک اسی کیفیت سے لبریز ہیں۔''96

(ب) قصیدہ

''قصیدہ'' کا مادّہ اگر ''قصد'' ہو تو اس سے ایسی نظم مراد لی جائے گی جو ارادہ اور غور و فکر کے ساتھ لکھی گئی ہو اور جس میں کسی شخص، شے یا کیفیت کا بیان کیا گیا ہو۔ ایسی نظم مربوط اور مسلسل ہوگی اور اس میں لُغت، زبان اور بیان کے تمام ضابطوں کا بطورِ احسن اہتمام کیا جائے گا۔ کسی موضوع کے بیان کے دو پہلو ہوتے ہیں:

(۱) تعریف و توصیف یا مدح اور (۲) تحقیر و مذمّت یعنی ہجو۔ اسی طرح بیان کے اندر بھی دو شعبے ہو سکتے ہیں۔ (1) براہ راست یا خطابیہ اور (2) بالواسطہ یا بیانیہ۔ پہلی صورت میں قصیدے کے اجزا تین ہوں گے: (1) مدح (2) خاتمہ اور (3) دعا اور دوسری قسم کے آغاز میں دو جز مزید ہوں گے یعنی: (1) تمہید یا تشبیہ یا غزل اور (2) گریز یا ربط جو پہلے جز کو مدح سے ملا کر تسلسل قائم کرتا ہے۔ قصیدے کے لیے ہیئت کوئی مقرر نہیں ہے البتہ عموماً مدحیہ قصیدے غزل کی اور ہجویات مثنوی کی صورت میں لکھتے ہیں۔

اردو میں قصیدے کی صنف کو مرزا رفیع سودا نے رفعت کے درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ ان کے بعد دہلی میں اکبر شاہ ثانی کے دور میں بعض شاعروں نے اس صنف میں بخوبی طبع آزمائی کی تھی لیکن سودا کے طرزِ خاص کو شاہ نصیر اور ان کے تلامذہ نے ہی وسعت اور ترقی دے کر چمکایا۔

یہاں عہدِ اکبر شاہی کے چند نمائندہ قصیدہ گویوں کا اختصار کے ساتھ تعارف کرایا جاتا ہے۔

1۔ ممنون

میر نظام الدین ممنون عام طور سے غزل گو کی حیثیت سے معروف ہیں لیکن قصیدے میں ان کا امتیاز یہ تھا کہ سودا کے بعض قصیدے ان کے نام سے اور ان کے ایک دو قصیدے سودا کے نام سے منسوب ہو گئے ہیں۔ یہ صورت حال اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ ممنون کے قصیدے بطور مجموعی سودا کے قصیدوں سے مطابقت رکھتے تھے بلکہ اُن کے ہم پلّہ بھی معلوم ہوتے تھے۔ سودا کے دو ایسے قصیدوں کے مطلع جو ممنون کے نام سے مشتہر ہو گئے ہیں یہ ہیں:

الف۔ قصیدہ در مدحِ حضرت علیؓ

لختِ دل بکھرے ہیں یوں آہ سے ہنگامِ قلق جنبشِ باد سے جوں گُل کے پریشاں ہوں ورق

ب۔ قصیدہ در منقبت امام حسنؓ

ہُوا ہے دشت برگِ چمن طرب مانوس نگہ غزال کی جوں شاخِ سبز ہے محسوس

یہ دونوں ممنون کے کلیات میں داخل ہو گئے ہیں لیکن یہ سودا کے دیوان کے نسخہ انجمن ترقی اردو ہند میں بھی موجود ہے اور ان کی کتابت 6/رجب 1203ھ (=1789) میں ہوئی تھی۔ اُس وقت ممنون کی عمر کم تھی اور کوئی قرینہ اس بات کا نہیں ہے کہ انھوں نے یہ قصیدے کہے ہوں۔

انجمن ترقی اردو ہند کے ایک مجہول الحال نسخہ کلیاتِ سودا میں ذیل کا قصیدہ درج ہے:

قصیدہ در مدحِ حضرت امام تقیؑ۔

ہووے جو قطرہ ریز (یہ) چشمِ تر آب میں پیدا ہو پھر بجائے گہر اخگر آب میں

یہ قصیدہ کلیاتِ ممنون میں درج ہے اور سودا کے کلام کے کسی مستند نسخہ میں شامل نہیں ہے اس لیے بظاہر اس کو ممنون ہی کے قصائد میں شمار کیا جانا چاہیے۔ یہ مختصر سا قصیدہ ہے اور اس میں صرف اکتیس شعر ہیں۔

تشبیب میں مطلعِ دوم اس طرح لکھا ہے۔

ہے دل میں یہ کہ لکھیے اب ایسی ہی اک غزل سُن کر ہو جس کو گوہرِ صافی تر آب میں

یک صبح گر نہائے وہ موپیکر آب میں گرداب کا صفا سے بھرے ساغر آب میں

اِس قصیدے میں گریز کے شعر یہ ہیں۔

ماتم زدے ازل سے کسورنگ خوش نہیں　　کب ہو سفید جامۂ نیلوفر آب میں
کب موجِ حادثات میں ہو شعر آبدار　　تصویر کب بنا سکے صورت گر آب میں
پس یہ تو فیض حضرت امامِ تقی کا ہے　　باندھے ہے نقش کلکِ ثنا گستر آب میں

میر نظام الدین ممنون اپنے وقت کے مسلّم الثبوت استادوں میں سے تھے۔ وہ تمام مروّجہ شعری اصناف پر قدرت رکھتے تھے۔ اُن کے کلیات میں غزلوں کے علاوہ قصیدے، مثنویاں، مرثیے، مخمس اور قطعاتِ تاریخ وغیرہ مندرج ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں کلیاتِ ممنون کا جو نسخہ ہے اُس میں 1253ھ (38-1837) تک کے قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔ اِس نسخے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ خود ممنون کا لکھا ہوا ہے۔

ممنون نے اپنے قصیدوں پر بہت محنت کی ہے۔ اُنھوں نے عموماً مرزا محمد رفیع سودا کی اتباع کی ہے اور ان ہی کی زمینوں میں بیشتر قصیدے کامیابی کے ساتھ کہے ہیں۔ مثال کے طور پر سودا کے مشہور لامیہ قصیدے کی زمین میں انھوں نے جو قصیدہ کہا ہے، اس کے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

ذاتِ یکتا تری جوں ذاتِ حق عزّ وجل　　نہ مثیل و نہ مُماثل رکھے، نے مِثل و مَثَل
شکل ثانی کی ترے محو یہاں تک کہ نہ پاے　　وہم و آئینہ و آب اُس کو بہ چشمِ اَحول
عہد میں تیرے یہاں تک ہے عدالت کا عموم　　کیجیے جمع جو رَوضہ کو تو ہووے نہ خلل
نخلِ مو میں کو جو دیں چشمۂ آتش سے آب　　ہو کے بالیدہ و شاداب وہ لاتا رہے پھل

آتشِ مہر تری شعلہ فگن ہے اس کی
کہ جسے منع کرے شرع نبی مرسلؐ

اپنی علمیت اور زبان دانی کے اظہار کے علاوہ اس قصیدے میں شاعر نے معنی آفرینی کے جوہر بھی خوب خوب دکھائے ہیں۔

کسی قدر طویل بحر میں ممنون نے ایک اچھا قصیدہ لکھا ہے اس کے اکثر شعروں میں افعالِ امدادی بھی نہ لانے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے کچھ شعر یہ ہیں۔

مطربِ مہوش، ساقیِ سرخوش، نغمۂ دلکش، بادۂ بیغش
زینتِ مجلس، ہمدم و مونس روحِ روان و تقویتِ جاں

وقفِ تبسم صرفِ تکلم، نذرِ تجمل، محوِ ترنم
ہر گلِ رعنا، بلبلِ گویا سروِ خراماں، قمریِ خوشخواں

وہ شہِ عالم، شاہِ مکرم، مالکِ تخت و صاحبِ خاتم
خسروِ اعظم، والیِ اکرم، حاکمِ گردوں، دادرِ دوراں

عنصرِ اطہر، پیکرِ انور، خلقِ معطر، موئے معنبر
جوہرِ ازہر، روحِ منور، نفحۂ عنبر، عنبرِ افشاں

وقتِ سخاوت، ساعتِ جرأت، روزِ عدالت، گاہِ حمایت
غیرتِ حاتم، ثانیِ رستم، یادرِ عالم، زورِ ضعیفاں

جود و سخا میں، لطف و عطا میں، نور و صفا میں، عہد و وفا میں
لجۂ احساں، ابرِ دُرافشاں، تیرِ رخشاں، ثابتِ پیماں

نورِ الٰہی، افسرِ شاہی، والا جاہی، ماہ اور ماہی
مُنہ پہ ہویدا، سر پر زیبا، جبہ سے پیدا، تابعِ فرماں

اُس کی رفعت، اُس کی دولت، پہنچے دائم رہیو قائم
کہوے ہے ممنون باحقِ نیکوں، تاسرِ گردوں، تاحدِ امکاں

برابر برابر کے ٹکڑے اور وہ بھی ہر قافیہ ہر شعر میں جمع کرنا، زبان پر شاعر کی حاکمانہ قدرت کو دکھاتا ہے۔ مختلف قسم کی تلمیحات کو الگ الگ صنعتوں کے ساتھ صَرف کرنے سے خوش فکری اور طبیعت کی تیزی کا ثبوت ملتا ہے۔

میر نظام الدین ممنون کے ممدوح کئی تھے اور وہ مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس صورتِ حال نے نہ صرف بیان، بلکہ مطالب کے اعتبار سے بھی ان کے قصیدوں میں تنوع کی صورت پیدا کر دی تھی۔

2۔احسان

شاہ عالم بادشاہ کے عہد کے چند شاعروں کا حال گذشتہ اوراق میں لکھا جاچکا ہے۔ان میں حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ان کے ایک قطعہ کے چار شعر یہ ہیں۔

آفتابِ فلکِ سلطنتِ عزّ و علا شاہ عالم کہ وہ تھا مخزنِ احساں میرا
میں جو دربارِ معلّٰی میں نہ ہوتا، کہتے کیا سبب ہے کہ نہیں آج وہ احساں میرا
اے فلک تو تو رہے اور نہ ہوے افسوس وہ سخن سنج، سخن فہم، سخنداں میرا
مثلِ شب گرہوں سیہ پوش مجھے لائق ہے
کہ جدا مجھ سے ہے وہ مہرِ درخشاں میرا

حافظ احسان کے مختصر سے دیوان میں شاہ عالم کی مدح میں قصیدہ موجود ہے لیکن اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں کوئی قصیدہ نہیں ہے۔اس پر تعجب ہے۔اسی طرح بعض اور شاعروں مثلاً ثناءاللہ خاں فراق کا بھی معاملہ ہے کہ ان کے قصیدے بھی دستیاب نہیں ہو سکے۔

3۔نصیر

شاہ نصیر بڑے قادرالکلام اور پُرگو شاعر تھے۔انھوں نے اکبر شاہ، ان کے شاہزادوں اور بعض امیروں کی مدح میں بھی قصیدے لکھے تھے، دہن کی شاخ، سخن کی شاخ میں ذوق کی غزل اور قصیدہ کا ذکر کیا جاچکا ہے۔شاہ نصیر نے بھی اِسی بحر، ردیف اور قافیہ میں قصیدہ لکھا تھا۔تشبیب کے کچھ شعر یہ ہیں۔

دکھلادوں اپنی گرگلِ باغِ سخن کی شاخ ہووے قلم گلاب، کٹے نسترن کی شاخ
شیرینیِ کلام سے واقف ہو گر مری حلوائی پھر بنائے نہ قندِ کہن کی شاخ
کیا خاک ملتجی ہو فرومایہ سے کوئی کب فیشکر کو پہنچے ہے بیدِ کہن کی شاخ
بس کب تلک بہ رنگِ دگر طبع سے نصیر پیدا کرے گا نسترن، یاسمن کی شاخ

اور اب مدح کا انداز ذیل کے شعروں میں دیکھا جانا چاہیے۔

طوبا کی جیسے طول میں باہے لگن کی شاخ ہو نخلِ عمرِ اکبرِ شاہِ زمن کی شاخ
ہے نائبِ رسولؐ ترے سر پر ہے ظلِ لگن دستِ عنایتِ کرم ذوالمنن کی شاخ

شاہا ترا یہ تخت جواہر کا ہے چمن　　یاقوت کے گلوں کی عجب ہے پھبن کی شاخ
طاؤس وہ ہیں رشکِ چمن جن کے وصف میں　　ہے یاں زبان طوطیِ شکّر شکن کی شاخ
نیلم کی گردنیں ہیں، زمرّد کے بال و پر
منقار سلکِ دُر سے ہے دُرِّ عدن کی شاخ

اور دعا اس طور پر نظم کی ہے۔

دستِ دعا اٹھا کے یہ دے ہے دعا نصیر　　شب کہکشاں ہے جیسے سپہرِ کہن کی شاخ
سرسبز باغِ دہر میں شاہا رہے مدام　　تیرے نہالِ قامتِ سایہ فگن کی شاخ

کہتے ہیں کہ قصیدوں میں خیالی مضامین نظم ہوتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر قصیدہ موقع اور محل کی مناسبت سے لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس قصیدے میں شاعر نے بادشاہ کے تخت، خیمے اور اُس کی سواری کی جو مدح کی ہے وہ حقیقت کے خلاف نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نادر شاہی ہنگامے کے بعد دوسرا تختِ طاؤس بنوالیا گیا تھا اور وہ بھی بیش بہا جواہرات سے مزیّن تھا۔ اس نئے تخت طاؤس کا ذکر اکثر قصیدوں میں آیا ہے۔

شاہ نصیر کے کلیات میں اکبر شاہ کی مدح میں ایک مختصر سا قصیدہ ''آفتاب'' کی ردیف میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن کے پہلے جشنِ جلوس کے موقع پر نذر کیا گیا تھا۔ اس قصیدے کے لیے تشبیب یا غزل کے اشعار بے موقع تھے اس لیے اس کی ابتدا ذیل کے مطلع سے کی گئی ہے۔

ہے چرخِ سلطنت کا شہِ اکبر آفتاب　　کس کی نگاہِ مہر سے ہوا خترِ آفتاب

آفتاب اکبر شاہ کے والد شاہ عالم کا تخلص تھا۔ اس لحاظ سے یہ ردیف زیادہ برمحل ہے۔ مدح کے چند شعر یہ ہیں۔

سکّے کا تیرے اُس کے جو دل پر نشان ہے　　سمجھے ہے اشرفی کی طرح بن کر آفتاب
ظلِّ الٰہ قبلۂ عالم، جہاں پناہ　　تجھ کو سمجھ کے نائبِ پیغمبر آفتاب
خطبہ خطیب بن کے ترے نامِ پاک کا　　پڑھتا ہے آسماں پہ سرِ منبر آفتاب

شاہ نصیر کے قصیدے جدّتوں سے خالی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر اُنھوں نے اکبر شاہ بادشاہ کے وزیرِ اعظم کے بیٹے کی پیدائش کے موقع پر جو قصیدہ کہا تھا اس میں تاریخ بھی کہی تھی،

چنانچہ اس کا آخری شعر یہ ہے۔

پھر اس کے بعد رقم کر یہ از سرِ اقبال　　نمودِ صبح ہوا آفتابِ عالمتاب

1　　+1240ھ　　= 1241ھ

اِسی طرح ''قصیدہ در تہنیت شادیِ مرزا سلیم بہ حضور بادشاہ'' کا نام اُنھوں نے ''گلدستۂ بہار'' مقرر کیا تھا۔ اِس قصیدے کے آخری شعر میں کہتے ہیں۔

مشہور کیوں نہ ہو یہ قصیدہ جہان میں　　یعنی کہ اس کا نام ہے گلدستۂ بہار

شاہ نصیر کو سنگلاخ زمینوں اور طویل ردیفوں میں شعر کہنے کے لیے بڑی شہرت تھی۔ انھوں نے بعض قصیدے بھی اسی طور پر کہے ہیں چنانچہ ان کے ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

گو ہیں سپر، تیغ اور سناں، شمس و ہلال و کہکشاں　　پر ہیں ترے قبضے میں ہاں شمس و ہلال و کہکشاں

یہ خاصا طویل قصیدہ ہے۔ اس کے چند متفرق اشعار یہ ہیں۔

یہ تختِ طاؤسی ترا ہم پایۂ افلاک ہے　　چترِ شہی، تیغ و نشاں، شمس و ہلال و کہکشاں

جشنِ معلیٰ کی ترے تعریف میں کیونکر کروں　　بَن کر وہاں لب اور زباں شمس و ہلال و کہکشاں

شاہِ مُعین الدّیں کے ہوں اوصافِ بخشش کیا رقم　　دیکھو تو یارو ہیں کہاں شمس و ہلال و کہکشاں

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

کرتا دعا پر ختم ہوں، مضمون و معنی دشنا　　اے اکبر گیتی ستاں شمس و ہلال و کہکشاں

مسند پہ دولت کی خوشی تب تک مبارک ہو تجھے　　جب تک فلک میں ہیں عیاں شمس و ہلال و کہکشاں

مانندِ گُرز و نیزہ و خنجر بہ تائیدِ خدا　　بن جائیں بہرِ دشمنان شمس و ہلال و کہکشاں

شاہ نصیر نے ہر قسم کے قصیدے کہے تھے۔ ان کے کلیات میں ترجیع بند کی صورت میں بھی چند قصیدے ہیں۔ چنانچہ ایک ''مسدس در تہنیتِ عید و جشن بہ جنابِ بادشاہ'' بھی ہے۔ اس کا پہلا اور آخری بند یہاں نمونہ کے طور پر نقل کیا جاتا ہے۔

میر ساماں ہو خوشی سے یہ کہے ہے اقبال　　جلوہ فرما ہے سرِ تختِ شہِ فرّخ فال

چمنِ دہر میں اس ابرِ کرم سے ہو نہال　　زرِ گل نذر کر اس کی یہی کہتے ہیں نہال

شہِ اکبر کو ہمایوں یہ عجب جشن ہوا
عید میں عید ہوئی جشن میں اب جشن ہوا

اے نصیر آج وہ ہے روزِ مسرّت ایجاد　　خیمۂ ابرِ بہاری ہے چمن میں اِستاد
برگِ ہر گل سے ہے سرگرم تبسّم ہوشاد　　ہوگئی بادِ خزاں سُن کے یہ مطلع برباد

شہِ اکبر کو ہمایوں یہ عجب جشن ہوا
عید میں عید ہوئی جشن میں اب جشن ہوا

شاہ نصیر کا ایک اور قصیدہ ''درتہنیتِ جشن بہ جنابِ حضور والا'' بہ صورتِ مخمس ہے نمونہ کے طور پر اس کا بھی پہلا اور آخری بند درج ذیل ہے۔

شہا سمجھ کے تجھے ظلِّ کردگار بسنت　　گئی نہ اب کے برس سوے کوہسار بسنت
ہوئی ہے اس درِ دولت ہی پر نثار بسنت　　ادب سے آترے مجرے کو ایک بار بسنت
کہے ہے عید مبارک ہو اور دوچار بسنت

دل نصیر سے رکھتی ہے یہ دعا پیوند　　عدو کو تیرے زمانہ کرے اسیر کمند
بسنت وعید مبارک ہو تو رہے خورسند　　ترا طلوعِ حشم ہووے آفتاب بلند
کہ ہو کے عید سے آئی ہے ہمکنار بسنت

ان چند مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ نصیر نے مختلف ہیئتوں میں کامیابی کے ساتھ اپنے بادشاہ کی دعا گوئی کی تھی۔ ان کے کلیات میں مرزا بابر، مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کے علاوہ بعض امیروں اور نوابوں کی مدح میں بھی قصیدے موجود ہیں۔ ''قصیدہ در مدح نواب احمد بخش خاں'' کے چند شعر محض نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

تیرے ابرِ فیض کی دولت سے اے والا تبار　　باغِ گیتی میں نہیں پھولی سماتی ہے بہار
دیکھ کر القصہ باغِ گیتی کا یہ رنگ　　دیدہ دوانستہ پوچھا باغباں سے ایک بار
ہنس کے اُس نے تب برنگِ گل دیا مجھ کو جواب　　کوئی تجھ سا بھی نہ ہوگا بے خبر دنیا میں یار
اُس کے اسمِ پاک سے آگاہ کرتا ہوں تجھے　　جس سے روشن ہو نگینِ دل ترا آئینہ وار

سُن کے تیری شان میں میں نے سو وہ مطلع کہا
مطلعِ خورشید ہووے دیکھ جس کو شرمسار
ابرِ دریا بار بخشش چشمۂ عزّ و وقار شیر میدانِ شجاعت، شہسوارِ نامدار
یعنی رخشِ برق دش کی بھی صفت میں کررقم
مطلعِ ثالث بہ اندازِ دگر اے ہوشیار
کیا لکھوں توصیف گلگوں کی ترے اے شہسوار ہے عناں قوسِ قزح، گلگوں ہے جوہرِ بہار
ختم کرتا ہے سخن کو اب دعا پر یہ نصیر
تا نہ ہو طولِ سخن سے خاطرِ نازک پہ بار
غنچہ ساں باغِ جہاں میں زرفشانی تو کرے اور خزانے میں ترے ہرگز خزاں پاوے نہ بار
فصلِ حق سے گلشنِ اقبال بھی پھولا رہے چشمِ حاسد میں نسیمِ صبح کھینچے میل چار

یہ اور اس قسم کے دوسرے قصیدوں میں مدح کے طور میں جو فرق ہے اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ شاعر نے ممدوحوں کے مراتب کا جس طرح پاس کیا ہے، وہ بھی ایسی بات نہیں ہے جس سے سرسری گذر جایا جائے۔

4۔ ذوق

یہ مذکور آچکا ہے کہ شیخ محمد ابراہیم ذوق شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ باوجود یکہ تلمذ کا سلسلہ جلد منقطع ہوگیا تھا، مشاعروں کی معرکہ آرائیوں کی وجہ سے ذوق کو ان کے طرزِ خاص میں غزلیں اور قصیدہ وغیرہ اکثر کہنے پڑتے تھے۔ شروع زمانے کے ان کے قصیدوں میں بھی معمول کے مطابق بادشاہ اور شاہزادوں کی شخصیت، صفات اور ان کے ساز و سامان کی مدح ہوئی تھی اور اسی میں وہ اپنی زبان دانی اور قدرتِ کلام کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کی جولانیاں دکھاتے رہتے تھے۔ مرزا محمد رفیع سودا اور اُن کے بعد کے بعض شاعروں نے قصیدوں کی تشبیب میں خوشی، عیش اور نشاط کی کیفیتوں کی عکاسی کر کے یا ان کے مابین مکالموں وغیرہ کو نظم کر کے جدتیں پیدا کی تھیں۔ شیخ ذوق نے بھی اُسی روش پر خوشی کے ظاہر ہونے اور پھر ایک ایک کیفیت اور تاثر کا بیان کیا تھا۔ ایک قصیدے کے چند شعر

یہ ہیں۔

سحر جو گھر میں بشکلِ آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ حور طلعت بہ شکلِ بلقیس و ماہِ کنعاں

پری کی صورت، چمن کی رنگت، گر اس کا شیوہ تو اُس کا جلوہ
زباں شیریں، بیان رنگیں، کلامِ رنداں، خرامِ مستاں

بروئے رنگین نگارِ بُستان، شگوفہ خنداں مگر نہ خنداں
بہ موئے پیچاں ہے عشق پیچاں جو میں پریشاں تو دل پریشاں

وہ ران روشن، وہ ساق سیمیں، وہ پائے نازک حنا میں رنگیں
وہ قد قیامت، وہ فتنہ قامت، دلوں پہ شامت جو ہو خراماں

مولانا محمد حسین آزاد نے نیرنگِ خیال میں مختلف کیفیتوں وغیرہ کو مجسم کر کے پیش کیا ہے اور اس تجسیم کو انگریزی ادب کے فیوض میں شمار کیا ہے لیکن قصیدوں کی طرف نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ اردو شاعری میں اس کی روایت خاصی قدیم تھی بلکہ دکن کی طرف خیال کریں تو وہاں نثر میں بھی سب رس جیسی مبسوط تصنیف موجود ہے۔

اس تشبیب کے بعد شیخ ذوق نے گریز کے لیے ایسا بے ساختہ انداز اختیار کیا ہے کہ بات کے بدل جانے کا خیال بھی نہیں ہوتا ہے۔

جو نام پوچھا کہا: خوشی ہوں جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں
سبب جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ: ذوق تو بھی عجب ہے ناداں

وہ شاہ جو ہے محمد اکبر جہاں میں رشکِ جم و سکندر
جلوسِ جشن اُس کا ہے فلک پر اُسی کے پرتو ہیں سب یہ ساماں

اس قصیدے میں مدح کے مطالب میں بھی خاصا تنوع دیکھا جا سکتا ہے۔ ممدوح بادشاہ کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس جشنِ جلوس کے ساز و سامان اور سواری وغیرہ کی تحسین کے لیے الگ الگ اور دلچسپ انداز اختیار کیے گئے ہیں چنانچہ ذیل کے شعروں میں بھی ہے۔

شہنشہا تیرے سر پہ دوراں ہے چتر بن بن کے ہوتا قرباں
کہ ہفت اختر بہ ہفت کشور ہیں آج یکسر مطیعِ فرماں

یہ تیرا خنجر ہے یا کہ شہپر کہ جس کے لگتے ہی دم میں اُڑ کر
قفس سے ہوتا ہے تن کے پرّاں ترے مخالف کا طائرِ جاں

کہ کھا کے گاؤز میں نہ ہیبت کہیں بہ زیرِ زمیں ہولرزاں
ہے عیدِ قرباں میں تیری میموں، رکھا بزرگوں نے شتر گردوں

وہ تیرا ہے فیلِ کوہ پیکر کہ جس پہ کہتے ہیں سب نظر کر
فلک پہ دُمدار ہیں دو اختر دیا نمایاں ہیں اس کے دنداں

ایک ایک لفظ زبان پر شاعر کی حاکمانہ قدرت پر دلالت کر رہا ہے پھر برابر برابر کے برمحل پُرشکوہ اور ہم قافیہ ٹکڑوں کو جمع کر کے اُن میں ربط قائم کرنا اور پھر اُن سے مفیدِ مطلب اور مناسب مقام مضامین پیدا کر دینا شاعر کے زورِ بیان، حسنِ تخیل اور خوبیِ بندش کا مظہر ہے۔

قصیدے کے آخری اجزا یعنی دعا اور خاتمہ ہی وہ ہیں جو قصیدے کے ختم کے بعد سننے والوں کے ذہن پر اپنا تاثر چھوڑ جاتے ہیں یعنی قصیدے کی کامیابی ایک طور سے اِنھیں پر منحصر ہوتی ہے۔ اس قصیدے کے آخر کے دو شعر یہ ہیں۔

ترا جو وصفِ نجستہ شاہا لکھے قلم کو کہاں ہے یارا
ثنا دعا پر ہے ختم کرتا جو ذوق تیرا ہے تہنیت خواں

کہ روز تجھ کو خوشی ہو افزوں، حسود ہوں سرنگوں و محزوں
یہ جشن ہو فرخ و ہمایوں سدا بصد فرّ و شوکت و شاں

قصیدے دربار میں پڑھے جاتے تھے اور دربار ہر زمانے میں مختلف علوم و فنون کے باکمالوں کے مرجع ہوتے تھے۔ شیخ ذوق نے جو مختلف علوم و فنون میں دخل رکھتے تھے اِس نکتے کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ اُن کے قصیدے محض شاعری اور لفظی بازیگری کا نمونہ نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں سبھی باکمالوں کی دلچسپی اور ان کے علمی مذاق کی تشفی کا وافر سامان موجود ہوتا تھا۔ وہ طرح طرح کے علمی مسائل اور مباحث کی طرف ہر شعر میں اشارے کرتے چلے جاتے تھے اور اس طرح انھوں نے قصیدہ

کو صحیح معنوں میں ایک علمی صنفِ سخن بنا دینے کی طرف مثبت اور نہایت مستحسن اقدام کیا تھا۔

قصیدہ گوئی کے معاملے میں مولانا محمد حسین آزاد نے ابتدائی زمانے میں ذوق کے معمول کا بیان اس طرح کیا ہے۔

"جب تک اکبر شاہ زندہ تھے تب تک ان (ذوق) کا دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولی عہد بہادر (مرزا ابوظفر) کو سناتے۔ دوسرے دن ولی عہد ممدوح اس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے اور دربار شاہی میں سنواتے۔ افسوس یہ ہے کہ عالمِ جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔"1

دیوانِ ذوق میں ایک قصیدہ کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے:

"یہ قصیدہ تمام طالب علمی کا ہے۔ مطالب اس کے عہدِ مذکور پر شاہدِ حال ہیں۔ افسوس کہ نظرِ ثانی سے نور نہ پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔"2

اس قصیدے کی تشبیب کے ایک ایک شعر میں الگ الگ علوم و دانش کے مسائل نظم کیے گئے ہیں۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ جس وقت یہ قصیدہ پڑھا جا رہا ہوگا ہر علم کا ماہر اپنے علم سے متعلق مسئلہ پر غور و فکر کر کے اُس سے لطف لے رہا ہوگا اور پورے دربار کا عجیب حال ہوگا۔ اِس قسم کے عالمانہ قصائد اِس سے پہلے کم لکھے گئے تھے اور بعد میں تو ایسے قصیدوں کے لکھے جانے کا امکان ہی نہیں رہ گیا تھا کیونکہ اول تو بیشتر علوم کا رواج ہی اٹھ گیا تھا اور ثانیاً اردو کے شاعروں کے یہاں اس کثرت سے علوم کے حاصل کرنے کا نہ چلن باقی رہ گیا تھا اور نہ شوق۔ ذیل میں تشبیب کے چند متفرق شعر نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

تازباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام — ہے لپے افلاک لازم نفیِ خرق والتیام
آب باراں سے گذر کر منتشر تا ہو شعاع — انعکاسِ رنگ سے قوسِ قزح پائے نظام
تازحل کے ساتھ شکلِ عقلہ وانکیس کو — زائچے میں دیتے ہیں صاحب رمل نسبت مدام
تاخراسان وعراق وزابل ونیریز سے — نغمہ ریزِ فارس آباداں کرے اپنا مقام
مدھم وپنچم کھرج، گندھار، وھیوت اور نکھاد — نغمۂ ہندی کا ہووے سات سُر سے انتظام

اس قسم کے علمی مضامین نظم کرنے کے بعد شاعر نے نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر

میں مدح کی طرف گریز کیا ہے۔

یارب اس کا رتبۂ عالی ہمیشہ ہو فزوں　　دولت اس کی ہو کنیز، اقبال ہو ادنیٰ غلام
کون وہ یعنی محمد شاہ اکبر دیں پناہ　　نیک صورت، نیک سیرت، نیک طالع، نیک نام

اس آخری شعر سے یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ اس زمانے تک بھی محمد شاہ بادشاہ کی شخصیت ہر طرح پسندیدہ اور محمود تھی اسی لیے شاعر نے اپنے ممدوح کو بھی اسی نام سے یاد کیا ہے ورنہ وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتا تھا۔

ع: کون وہ یعنی کہ اکبر شاہ ثانی دیں پناہ

مدح میں بھی شیخ ذوق نے طرح طرح کی تلمیحیں نظم کر کے اپنی وسعتِ معلومات کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں محض دو چار شعر درج کیے جاتے ہیں۔

مایدہ اور من وسلوا کی کسے ہے احتیاج　　مطبخِ عالی سے تیرے سب کو پہنچے ہے طعام
معجزِ انصاف سے تیرے سرِ دشت وجبل　　ہر غزالہ ناقۂ صالح ہے گویا بے زمام
جوں عصائے حضرتِ موسا سرِ دریائے نیل　　نیزہ تیرا لشکرِ اعدا میں کر جاتا ہے کام
گر عدو سدِّ سکندر کو کرے چار آئینہ　　آگے تیری تیغ کے وصلی ہے پر کاغذ ہے خام

اس قسم کے قصیدوں کا کما حقہ سمجھ لینا بھی آج ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ ایسے میں شاعر کی وقتِ فکر اور مشقتِ علمی کی داد بھلا کون دے گا۔ وہ زمانہ تھا جب صاحبِ علم قدر دان موجود تھے اور وہ قصیدے اُس زمانے میں لکھ لیے گئے اور پڑھ لیے گئے۔ آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ:

''ملک الشعرائی کا سکّہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اُس پر نظمِ اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہمصفیر رہے نہ ہم داستان رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لیے نکسال تھا وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔'' 3

اور شیخ ذوق کے احوال میں یہ بھی منقول ہے کہ:

''انھوں نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا کہ اس کے مختلف شعروں میں

انواع واقسام کے صنایع وبدایع صَرف کیے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا ان کی تعداد 17 تھی۔ اس پر بادشاہ نے خاقانیِ ہند کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر 19 برس کی تھی۔ خاقانیِ ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کیے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنا دیا اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا۔ ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب ہوا ہے اسے بھی تو دیکھنا چاہیے، چنانچہ قصیدہ مذکور لاکر پڑھا گیا۔ میر کلوحقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے، بن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو۔ ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانیِ ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا برا کیا۔"[3]

دیوانِ ذوق میں آزاد نے اس قصیدے کے صرف تین شعر اس طرح نقل کیے ہیں:

"اشعار قصیدہ ملتقطہ زبان"

جب کہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن　　آب وایلولہ ہوے نشوونمائے گلشن
جوشِ روئیدگیِ سبزہ پہ یاد آئی ہے　　آیتِ اَنْبَتَهُ اللّٰهُ نَبَاتاً حَسَناً
جس طرح شعلہ کا عالم ہو بہ فانوسِ خیال　　خوف سے یوں ترے لرزاں ہے عدو زیرِ کفن

یہ قصیدہ اگر پورا موجود ہوتا تو اس کی صحیح کیفیت کا اندازہ ہوتا۔ یہ غالباً شروع کے شعر ہیں اور ان سے گمان ہوتا ہے کہ قصیدہ واقعی بڑی دھوم دھام کا رہا ہوگا۔ خطاب خاقانیِ ہند کا ذکر خود ذوق نے اپنے ایک قصیدے میں کیا ہے۔

مدحِ حاضر کے لیے حاضرِ دربار ہو ذوق　　تو ہے خاقانیِ ہند اور وہ خاقانِ زماں

اور بیشتر تذکروں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے اس لیے خطاب کے ملنے پر تو شبہ کی گنجائش نہیں ہے البتہ اُس زمانے میں ذوق کی عمر 19 برس کی تھی، اس کے لیے مزید شہادت کی تلاش ضروری ہے۔

اکبر شاہی دور کے قصیدوں میں شیخ ذوق نے عموماً اصلاحی، اخلاقی مضامین بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ ان کے اکثر اشعار زبانوں پر جاری ہو کر ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

چند شعر یہ ہیں۔

بدخصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک　　اونچی ہے آشیانہ زاغ وزغن کی شاخ
ہے فیض سے وقار کہ میری نگاہ میں　　جس شاخ میں ثمر ہے وہ ہے لاکھ من کی شاخ
پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کہیں مَردوں کا مُنہ　　شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں
صحبتِ صافی دلاں سے ہوں مکدّر تیرہ دل　　زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

شیخ محمد ابراہیم ذوق نے غزل کی ہیئت کے علاوہ بعض قصیدے تخمس اور مسدّس کی صورت میں بھی لکھے تھے اور اس طرح بھی اپنی مشاقی اور قادرالکلامی کا ثبوت پیش کیا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ایسے ایک قصیدے کو اِس عنوان سے دیوانِ ذوق میں شامل کیا ہے:

''اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے مگر نظرِ ثانی نہیں پائی''[5]

اِس قصیدۂ تخمس کا صرف پہلا اور آخری بند یہاں نمونے کے طور پر نقل کیا جاتا ہے۔

شاہا جمال و حُسن کا تیرے لکھوں میں وصف کیا　　ظاہر میں تو ظلِ خدا، باطن میں تو نورِ خدا
جلوہ ترے دیدار کا ہے اِس قدر بہجت فزا　　روئے مقدّس کو ترے جس نے کہ دیکھا یہ کہا

صَلِّ عَلیٰ صَلِّ عَلیٰ　صَلِّ عَلیٰ صَلِّ عَلیٰ

تیری ثنا کب ہو سکے اے خسرو والا نگاہ　　اب یہ دعا ہے ذوق کی حق میں ترے شام و پگاہ
جب تک زمیں پر ہے فلک اور ہیں فلک پر مہر و ماہ　　فرّخ ہمیشہ عید ہو تجھ کو شہا با عزّ و جاہ
بدخواہ تیرا ہو سدا رنج و الم میں مبتلا

5۔ مومن

حکیم محمد مومن خاں مومن اردو کے صاحب طرز اور ممتاز قصیدہ گویوں میں سے تھے۔ انھوں نے امرائے وقت میں سے صرف دو کی مدح میں ایک ایک قصیدہ لکھا تھا۔ ایک نواب وزیرالدولہ والیِ ٹونک کی تعریف میں ہے اور دوسرے کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد نے تحریر کیا ہے کہ:

''انھوں (مومن) نے کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا۔ ہاں راجا اجیت سنگھ برادر راجا کرم سنگھ رئیس پٹیالہ جو دہلی میں رہتے تھے، سیر راہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خاں صاحب کا اُدھر سے گذر ہوا۔ لوگوں نے کہا: مومن شاعر یہی ہیں۔ راجا صاحب

نے آدمی بھیج کر بلوایا۔ عزت و تعظیم سے بٹھایا۔ جھنی خان صاحب کو عنایت کی۔
سو روپے اور دیے۔ خان صاحب نے ایک قصیدۂ مدحیہ شکریہ میں کہہ کر راجا صاحب کو
دیا..... سو اس قصیدے کے اور کوئی مدح کسی دنیادار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں
لکھی۔"8

اس اقتباس میں آخری بات صحیح نہیں۔ یہ قصیدہ "صلہ و انعام کی توقع پر" نہیں لکھا گیا تھا بلکہ جو مل چکا تھا اس کے شکریہ کے طور پر نذر کیا گیا تھا۔

اس قصیدے کا مطلع اور اس کی تشبیب کے چند شعر یہ ہیں۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا، ہے وہی تیرہ اختری　　کثرتِ دور سے سیہ شعلۂ شمعِ خاوری
سامعہ سوز و دلخراش، گریہ فزا و زخم ریز　　نغمۂ نوکِ عندلیب قہقہۂ گلِ تری
میرے یہ بخت ہائے بخت ایسے نصیب یا نصیب　　چارۂ یاس امیدِ حشر، مرگِ علاجِ مضطری
جانِ جہاں کو دل دیا دشمنِ جاں ہُوا جہاں　　سر میں ہوا نظر میں یاس، سینہ میں آرزو بھری

اس قصیدے کی شانِ نزول کا بیان شاعر نے ان شعروں میں کیا ہے۔

راجہ اجیت سنگھ نام کام روائے خاص و عام　　جود سے جس کے بانظام، کارِ جہاں کی ابتری
فیل نشیں بنا دیا خاک نشیں کو اُس نے اب　　خاک نہیں فلک کو زیب لاف و گزاف برتری

راجا کی مدح کے ساتھ اس کی تلوار اور تیر وغیرہ کی بھی تعریف کی ہے اور پھر خود اپنی صلاحیتوں اور احوال سے متعلق مسلسل کئی شعر کہے ہیں۔ کچھ متفرق شعر یہ ہیں۔

شاعرِ بے نظیر ہوں، سحر بیاں دبیر ہوں　　دَم ہے مرا نمونۂ معجزۂ پیمبری
سحرِ حلال سے مرے، جادوے سامری خجل　　طورِ کلیم اوجِ فکر، نورِ خدا فسوس گری
لاف زنی بسِ مدیح رسم قدیم کیا کروں　　اس شمِ تازہ سے نہیں مجھ کو امید جاں بری
میری طلاقتِ لساں، میری فصاحتِ کلام　　چارۂ صدرہ آزما از پے گنگی ذکری
میرے معاند و حسود ہر زہ ستائے رفتگاں　　ہاتھی خویش و بیخبر مست بہ لب کف آوری
ہیں یہ سگانِ جیفہ خوار شعر و سخن سے بے نصیب　　کافرِ استخواں پرست طرفہ سگی و کافری

آخر میں خاتمہ کا بھی ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

تجھ کو نصیب بزم میں داد دہی صلہ دہی　　مجھ کو مبارک ایک سو، مدح گری گداگری

دستِ سوال دراز کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ نتیجہ مدح گری کا گداگری ہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مومن نے مدحیہ قصیدے لکھنے کو شعار نہیں بنایا۔ وقت کی بات تھی کہ ان کو یہ قصیدہ لکھنا پڑا۔ لفظوں کے انتخاب، ترکیبوں کی چستی، خیالوں کی ندرت اور بیان کی دلکشی اِس قصیدے کی لائقِ تحسین ہے۔ ہر شعر میں ترنم اور نغمگی کی کیفیت بھی داد طلب ہے۔ بطور مجموعی یہ اردو کے بہترین قصیدوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مومن کے دیوان میں ایک اور مدحیہ قصیدہ ہے جو اپنے ٹونک نہ پہنچ سکنے کی معذرت میں لکھا ہے، لیکن قصیدے کو پڑھنے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ مومن وزیرالدولہ کی مذہبی شخصیت سے نہایت متاثر تھے اور یہی اس قصیدے کے لکھے جانے کا بنیادی سبب معلوم ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہوئی کہ آزاد نے کسی ''دنیادار'' کی مدح میں لکھے گئے مومن کے قصیدے کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ قصیدہ چھوٹی بحر میں ہے۔ بیان کا انداز بھی سلیس رواں اور دلکش ہے۔ اس کے شروع کے کچھ شعر یہ ہیں۔

یادِ ایام عشرتِ فانی　　نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں　　کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشکِ آسماں سے ملی　　ہائے کیسی بلند ایوانی
کر دیا گردشِ سپہر نے حیف　　برجِ خاکی مسیرِ کیوانی

گریز کا انداز اس قصیدے میں بھی بہت خوب ہے۔ اختصار کے ساتھ شاعر نے بات کا رخ بدل دیا ہے۔

اس سے کاوش نہ کر، نہ ہو ظالم　　آپ اپنا تو دشمنِ جانی
تجھے معلوم ہے کہ ہے وہ کون　　کھول دوں میں یہ رازِ پنہانی
مدح خوانِ شہِ وزیرلقب　　ختم جس پر ہوئی سخندانی

ممدوح کی شخصیت کے تعارف میں شاعر نے خاصی حد تک وضاحت سے کام لیا ہے۔ کہا ہے۔

شامِ پیری میں اُس کا وہ عالم زرد رو جس سے صبح ریعانی
کرم اللہ نام وذات اُس کی مظہرِ لطف ہائے یزدانی
ہے مجھے بھی خیالِ طوفِ حرم خضر رہ گر ہو فضلِ رحمانی

ممدوح کے گھوڑے کی تعریف میں یہ بہت اچھا شعر کہا ہے۔

شوخیِ یار کی سی چالاکی نگہِ شوق کی سی جولانی

مدح کے بعد اِس قصیدے میں بھی شاعر نے اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔

یہ مرے ربطِ کلام کو پہنچے نثرِ سعدی، نہ نظمِ سلمانی
میرے گوہر تمام ناسفتہ میرے یاقوت سب بدخشانی
میں وہ سرمایۂ بلاغت ہوں جس کے در کا گدا ہے خاقانی
انوری کے بیان میں ہے کہاں میری تقریر کی سی تابانی
میری نسبت سے خاکِ ہند کو ہے رونقِ سُرمۂ صفا ہانی

یہ جُو وقصیدے کے اجزائے ترکیبی میں گویا مومن کا اضافہ ہے اور یہ اضافہ مستحسن ہے۔ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ مومن کے قصیدوں میں کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جسے سبک یا غیر معیاری کہا جاسکے۔ اِس قصیدے کا آخری شعر بھی خوب ہے۔

ترا اقبال روز افزوں ہو جیسے مومن پہ لطفِ رحمانی

اردو قصیدے کی تاریخ میں یہ بات توجہ کے لائق ہے کہ اِس صنفِ شاعری میں سُنّی عقیدے کی نمائندگی کم سے کم ہوئی ہے۔ اردو کے نامور آور دہ شاعروں میں مومن اس اعتبار سے ممتاز ہیں کہ اُنھوں نے خدا اور رسول صلعم کے بعد چاروں خلفا کی مدح میں بہت اہتمام اور کاوش کے ساتھ قصیدے لکھے تھے۔ ضمناً ایک دو قصیدوں میں انھوں نے بعض اختلافی معاملوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے لیکن محض یہ بات اُن کے قصیدوں کی طرف سے کم توجہی کے لیے معقول جواز فراہم نہیں کرتی ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے بلاشبہ مومن کے قصیدے نہایت قابلِ قدر ہیں۔

مومن کے قصیدے دربار میں پڑھے جانے کے لیے نہیں لکھے گئے تھے اس لیے اپنی نوعیت اور افادیت کے اعتبار سے وہ عام مدحیہ قصیدوں سے مختلف تھے۔ اُن میں ذوق کے قصیدوں کی طرح علوم وفنون کے معاملات ومسائل کے بیان کی نہ ضرورت تھی اور نہ گنجائش ہی تھی البتہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کے طور پر ان کا ذکر اور اظہار کیا جاسکتا تھا اور مومن نے ایسا کیا بھی ہے۔ قصیدوں کے لکھنے سے مومن کو اپنی قدرتِ کلام کا اظہار مطلوب نہیں اس لیے ان کے بیشتر قصیدے غیر مردّف تھے۔ قافیے بھی عموماً آسان اختیار کیے گئے ہیں البتہ قصیدے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مضامین میں ندرت اور اُن کی پیشکش میں دقت آمیز جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان قصائد کے ممدوح مثبت، مثالی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت کے مالک بھی تھے جن کے طور طریقے اور معاملے ایک مخصوص سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ان کی مدح میں اکثر واقعات کا بیان تلمیح کی صورت میں کیا گیا ہے۔ ان کی مدح کے شعبے بھی عام بادشاہوں اور امیروں کی ستایش کے مختلف پہلوؤں سے عموماً الگ ہوتے ہیں۔

مومن کے قصیدوں کی تشبیب بھی منفرد انداز کی ہوتی ہے۔ انھوں نے خود اس کے لیے ''غزل'' کی اصطلاح استعمال کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے اِس لیے اِس جزو پر اُنھوں نے زیادہ توجہ صَرف کی ہے، اور اِن میں نادر اور انوکھے مضامین نظم کیے ہیں جن میں تعلّی اور شکایتِ زمانہ کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ بعض قصیدوں میں نجوم، رمل اور طب کی اصطلاحیں بھی بڑے سلیقے سے صَرف کی ہیں۔ بعض شعروں میں عربی کے فقرے اور جملے بھی تضمین کیے ہیں۔ مومن نے خطابیہ قصیدہ ایک بھی نہیں لکھا ہے۔ ان کے تمام قصیدے بلا استثنا غزل ہی کی ہیئت میں ہیں۔ بیشتر قصیدوں میں انھوں نے اپنے ممدوحوں کو خود اپنے اور اپنے زمانے کے حالات بھی سنائے ہیں اور ان مخصوص حالات میں اپنے معمولات اور معاملات کی داد چاہی ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے قصیدوں میں خاتمہ اور دعا کا جزو عموماً خاصا طویل ہوگیا ہے۔

مومن نے حمد وثنا اور منقبت میں جو قصیدے لکھے ہیں ان کے لیے عنوان بھی خوب قائم کیے ہیں۔ ان کے عنوان، مطلعے اور کچھ کچھ اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

(1) ''گہر ریزیِ خامہ بستائش یگانہ ایست کہ دُرِ یک دانہ بہ آب رسانیِ گوہر شب چراغ بہ تاب آوردہ اد۔''

اَلْحَمْد لِوَاہِبِ الْعَطَایَا اِس شور نے کیا مزا چکھایا
وَالشُّکر لِصَانِعِ الْبَرِیَّہ جس نے ہمیں آدمی بنایا

یہ قصیدہ حمد و شکر سے شروع کر کے دعاؤں پر ختم کیا ہے۔ کوئی شعر لفظی یا معنوی صنعتوں سے خالی نہیں ہے۔ معروف لیکن نادر تلمیحات کا بھی شاعر نے خوب صَرف کیا ہے۔ بعض باتیں جو بظاہر معمولی اور سامنے کی ہیں، اُن میں بھی عجیب معنویت پیدا کر دی ہے چنانچہ دوسرے شعر پر غور کریں۔ خلاقِ حقیقی کا واقعی سب سے بڑا احسان ہمارے حال پر یہ ہے کہ اُس نے ہمیں آدمی بنا دیا ہے۔ مدح کے یہ دو شعر بھی توجہ طلب ہیں۔

ہر جا ہے تیرا جلوہ لیکن دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا۔
یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو پایا ہر شے میں، پر نہ پایا

ان میں نہ کوئی مشکل لفظ لائے ہیں نہ کسی ترکیب وغیرہ کا سہارا لیا ہے لیکن تہ در تہ مفاہیم موجود ہیں۔ قصیدے کے آخر کے چند شعر یہ ہیں۔

مجھ کو بھی بچالے جیسے تونے یوسف کو گناہ سے بچایا
وہ رفعتِ حال دے کہ جس نے منصور کو دار پر چڑھایا
اس کا مرے دل پہ ایک پرتو جس شعلے نے طور کو جلایا
مومن کہے کس سے حال آخر ہے کون ترے سوا خدایا

چھوٹی بحر میں اتنی خوبیوں کے ساتھ اردو میں قصیدے کم لکھے گئے ہوں گے۔ بیشتر اشعار سہلِ ممتنع کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اور زبان و بیان پر شاعر کی غیر معمولی قدرت کے مظہر ہیں۔

(2) ''زمزمہ سنجیِ طبع بہ مضمون یاد خوانیِ نسیمِ گلشنِ نبوت و بادشمالِ چمنِ رسالت۔''

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس کہ جیسے صبح شبِ ہجر نالہائے خروس

اِس مطلع سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ قصیدہ بھی نازک خیالی اور دقّت آفرینی کا شاہکار ہے۔ اپنے زورِ فکر سے شاعر نے عجیب و غریب اور نادر مضامین نکالے ہیں۔ تشبیب کے چند شعر

یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

کہیں جہان میں کائی نظر نہیں آئی　　کہ صَرف رنگرزاں ہوگئی بجائے ایوس
سرایتِ نمِ آبِ وضو سے دور نہیں　　جو سبزہ زار بنے ریشِ زاہدِ سالوس
ہَوا ہے کون سی ایسی مگر مدینے کی　　دمِ مسیح کو ہے جس کی حسرتِ پابوس
شرف مدینہ کو جس سے ہے، ہو نہ ہو وہ ہو　　جسے بتاتے ہیں محبوبؐ حضرتِ قدوس

اُس ذاتِ پاکؐ کی مدح میں شاعر نے مطلعِ ثالث اِس طرح پیش کیا ہے۔

یہ جی میں ہے کہ پڑھوں اور ایک وہ مطلع　　جو ہو ہر اک متنفس کی طبع سے مانوس
ترے ہی فیض سے ہر قطرہ آبیار عجوس　　ترے ہی نور سے ہر روز جلوہ زار شموس
ہمیشہ عفو ترا طالبِ گنہگاراں　　مدام رحم ترا دردمند کا جاسوس

شاعر نے اُس ذاتِ پاک کی خدمت میں عرض کیا ہے کہ اُسے ہر قسم کے علوم وفنون میں دسترس عطا ہوئی ہے لیکن اپنی قسمت کے اندھے پن سے وہ مجبور ہو کر رہ گیا ہے۔

ملے ہیں خاک میں کیا کیا مرے علوم وفنون　　خدا کسی کو نہ دے ایسے طالعِ منکوس

اس نے طب وحکمت اور نجوم ورمل وغیرہ میں اپنی مہارت کا بیان کرنے کے بعد بڑے پُراعتماد انداز سے اپنی سخنوری کا بھی ذکر کیا ہے، اِس طرح۔

جو میرے نثر کے دیکھے لآلیِ منثور　　اٹھائے مسندِ حشمت حجاب سے کاؤس
بفرض گر کرۂ خاک کو کہوں دایر　　شکست اسپ گلی ہووے پیش نائے فردوس
فنونِ نظم میں میں نے نکالی ایسی راہ　　طریقۂ شعرائے سلف ہُوا مَطموس
مرے کلامِ ثریّا نظامؔ کا منکر　　وہ تیرہ روز جو برجیس کو کہے منحوس
جو دیکھیں میری طبیعت کی گوہر افشانی　　شریکِ درد ہو محمود نکتہ پر ورطوس
دیے ہیں میرے حسد نے زبس ہزاروں داغ　　روا ہے باندھے گر عندلیب کو طاؤس
قماش دیکھ کے رنگینیِ سخن کامری　　حریرِ لالہ وگل شرم سے ہُوا مدّ روس

اس طور پر تفصیلی بیان کے بعد شاعر نے دوستوں کے لیے دعا اور دشمنوں کے واسطے بددعا کی ہے۔ خاتمہ اور دعا کا یہ انداز زیادہ موثر معلومات افزا اور قرینِ حقیقت ہے۔

(3) ''بیعتِ معانی بردستِ عبارت سراپا اعجاز بہ فیضِ مدیحِ اولین دستورِ صداقت طراز۔''

چھوٹی بحر کے اِس قصیدے کی تشبیب زیادہ معنی خیز ہے۔اس میں شاعر نے اپنے زمانے کی ابتری کا حال اِس خوبی سے نظم کیا ہے کہ یہ تشبیب بجائے خود ایک شہر آشوب بن گئی ہے۔اس کے چند متفرق شعر یہ ہیں ۔

کوئی اِس دور میں جیے کیونکر ملک الموت ہے ہر ایک بشر
دادخواہوں کے شور سے دیکھو چونک پڑتا ہے فتنۂ محشر
نہ امیروں کو پاسِ بندیِ عدل نہ رعایا مطیع وفرماں بر
اُس کو ہو رستمِ زماں خطاب جو کرے قتل مُرد سالہ پسر

وہ کہ مومن کی ضد سے مومن ہو
یہ گر اس کے لیے بنے کافر

آب و ناں کے لیے گرو رکھیں رستمانِ زمانہ تیغ وسپر
سروراں سپہر مرتبہ ہیں بس کہ جاہل نوازودوں پرور
قدردانی کا نام ہی نہ رہا چند ناداں ہوئے ہیں نام آور
اک امیرِ سخن شناس نہیں لاکھ ہیں شاعرِ ثنا گستر
کہے گر بادشہ کو عرش سریر کہے میری بلاکو ہو چکّر

اس قسم کے مضامین نظم کرنے کے بعد شاعر نے مدح کی طرف گریز کیا ہے اور یہ گریز خاصا طویل ہے لیکن لطف یہ ہے کہ طوالت کے باوجود دلچسپی میں کمی نہیں آئی ہے۔مضامین سے شاعر کی طبیعت کی نیکی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

ہجو گوئی نہیں ہمارا کام ایسی باتوں سے خامشی بہتر
پڑھ کوئی دے غزل کہ اعدا بھی جذا جذا کہیں سن کر

مطلع ثانی

لاؤں اِس مفلسی میں سوزن زر ہونٹ سینے دے گر نصیحت گر
جو مری سُن لے، میں بھی اُس کی سنوں کہ زباں گنگ ہے نہ گوش ہے کر

اسی سلسلۂ مضامین کو نہایت مربوط انداز سے آگے بڑھا کر شاعر نے اپنے ممدوح کے عہد کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کر کے مدح تک پہنچا دیا ہے۔

مانعینِ زکات ہیں اغیار یادِ ایّام نصفتِ سَرور
مسند آرائے محفلِ تقدیس اوّلیں جانشینِ پیغمبرؐ
خاکساری پسند، عرش مقام آدمی صورت وفرشتہ سیر

مدح کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے شاعر نے ایک مطلع اور بھی اس طرح لکھا ہے۔

اور پڑھتا ہوں ایک وہ مطلع جان دے جس پہ ہر سخن گستر
اے مسیح دَم رواں پرور زندگی بخشِ دینِ پیغمبرؐ

شاعر نے اپنے طریق کے مطابق اس قصیدے کو بھی دعائیہ اشعار پر ختم کیا ہے۔ اس میں دعا کا انداز یہ ہے۔

جب تک اِس تیرہ خاکدان میں ہے کوئی گم کردہ رہ کوئی رہبر
تیرے حاسد ہوں غولِ صحرائی تیرے پیرو ہوں پیشوائے خضر
نیک خواہ اور خوبیِ دارین
بدسگال اب سے خوار تا محشر

(4) ''خطبہ خوانیِ زبان بامیدِ ثواب بہ اثباتِ خلافتِ امیر المومنین عمرؓ ابن الخطاب۔''

مومن کے اِس قصیدے کا پہلا مطلع یہ ہے۔

جو اس کی زلف کو دوں اپنی عقدۂ مشکل تو بوالہوس کا تو ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل

اس قصیدہ میں بھی شاعر نے تشبیب کو غزل خوانی ہی کہا ہے۔ مطلعِ ثانی کو پیش کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

اپنی طرح سے میں کرتا ہوں اب غزل خوانی عدو بھی چاہیے اِس زمزمہ کے ہوں قائل
دل اب کے بار ہُوا ایسی بے جگہ مائل کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رہے گا دل

اپنی طرح کی اس غزل خوانی میں شاعر نے اپنے ممدوح کے مخالفوں کے بعض بنیادی نکات اور معاملات کی جن میں عمل اور عقیدہ دونوں شامل ہیں، نشاندہی کی ہے۔ ان شعروں کی بلاغت

خصوصیت سے ستائش کے لائق ہے۔

وہ شوخ، بے سبب آزار و بے گنہ خونریز — کہ جرمِ قاتلِ عثمانؓ کا نہ ہو قایل
وہ نکتہ داں کہ تقیہ کو اصلِ دین کہے — دمِ شکایتِ عاشق نہ ہو جفا سے خجل
وہ دوربیں کہ خدا پر کرے ہدا ثابت — نہیں ہے غیر زبس اعتماد کے قابل
وہ کج ادا، صنمِ خودپسند، کافرکیش — کہ جس کے زعم میں باطل حق اور حق باطل

مضامین کے اسی سلسلے کو آگے بڑھا کر شاعر نے مدح شروع کر دی ہے۔ اس مدح کے کچھ متفرق شعر یہ ہیں۔

بلند پایہ عمرؓ جس کے قصرِ رفعت کا — گدائے خاک نشیں شاہِ آسماں منزل
یہی خلافتِ راشد کی اس کو بس ہے دلیل — یہی امامتِ برحق کی اس کو بس ہے سجل
بڑھایا پایۂ الہام رائے صائب سے — کہ مشورہ پہ ہوئی اُس کے وحی بھی نازل
مثالِ عدل میں نوشیرواں کو تجھ سے غلط — کہ بُت پرست کہاں فارقِ حق و باطل
دوادو خشم تراصوفیوں نے دیکھا ہے — جبھی تجدُّدِ امثال کے ہوے قائل

اپنے مخصوص طرز کے مطابق شاعر نے اپنی ہنرمندیوں کی ناقدری کا شکوہ اپنے ممدوح سے اس طور پر کیا ہے۔

شہا کسی نے نہ دی یہاں مرے ہنر کی داد — کہ نکتہ فہم نہ تھا ایک سروَرِ باذل
وہاں صلے میں نعیمِ جناں کی ہے امید — اگر ہو لطف ترا میرے حال کے شامل
وحیدِ عصر ہوں میں عقلِ اوّلیں ہے گواہ — مریدِ دہر میں ہیں صفحۂ زباں ہے محل
یہی صلہ، یہی ممدوح مجھ کو زیبا تھا — یہی سخن، یہی مدّاح تھا ترے قابل

اس مدح سے شاعر "نعیمِ جناں" کی امید لگائے ہوئے ہے اور اسی لیے وہ ان قصیدوں پر پوری محنت کرتا رہا ہے۔ اپنے اِس قصیدے کو اس نے اس شعر پر ختم کیا ہے۔

موافقوں کو بہشت و ترقیِ درجات — مخالفوں کو جہنّم کا طبقۂ سافل

(5) "نامہ راجیہ چوں مہر و ماہ نورانی ست ہمانا بہ فیضِ مدیحِ ذوالنورین ذرّافشانی است۔"

اس قصیدے کی تشبیب بھی خاصی طویل ہے اور اس میں بھی شاعر نے مضمون آفرینی اور

نازک خیالی کی خوب خوب داد دی ہے۔ کچھ متفرق شعر یہ ہیں۔

ہے یہی حسرتِ دیدار تو مرنا دشوار　　دم شماری کے مری عمر ہے تار و زِ شمار
بدگمانی نے دعا سے ہے رکھا محروم آہ　　رازِ دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار
دردِ سر میری شکایت سے نہیں یہ تم کو　　بزمِ دشمن میں جو مے پی تھی سو اُس کا ہے خمار
اور اک کھینچتے ہیں شعلہ فشاں نالۂ گرم　　کیا کریں یوں ہی نکالیں گے ذرا دل کے بخار

مطلع ثانی

نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار　　چھوڑ دوں آج وفا، گر ہو وفا سے بیزار
فائدہ وصل ہو سناک سے، وہ بات کرو　　جس سے ہر دم مجھے رنجش ہو، نہ تم کو آزار

اس قصیدے میں گریز کے شعر کا مضمون تو شاعر کو اس کے تخلص کے فیض سے ہاتھ آیا ہے۔

اے صنم چاہیے مومن کی فراست سے حذر　　کیا نہیں تو نے سنا قصۂ شاہِ ابرار

مدح کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اُس میں مختلف واقعات کو تلمیح کے طور پر نظم کیا ہے۔ اِس جزو کے کچھ متفرق اشعار درج ذیل ہیں۔

سو یمیں زیبِ دہِ صدر خلافت عثمانؓ　　جس کی مسند کے حسد سے فلکِ اطلس خوار
بیر روحہ کی حکایت میں کہا رضواں نے　　سلسبیل اُس کے ہے دریائے سخاوت کا کنار
شرطِ ایمان ہے بیانِ خلافت اُس کا　　وہ مسلمان ہی کیا جس کو ہے اِس میں انکار
قصۂ بیعتِ رضوان میں اشارہ ہے یہی　　ورنہ کوئی نہیں ہمدستِ رسولِ مختار
ذکرِ بخشش میں پڑے جھڑتے ہیں مُنہ سے موتی　　مدح خواں کے لیے ہے یہاں صلہ بیش از انبار

ہر شعر زباں، بیان اور فکر و خیال کی خوبیوں کا لائقِ تحسین مرقع ہے البتہ یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت دہلی میں زبان کے قواعد اور ضوابط مدوّن نہیں ہوئے تھے چنانچہ دوسرے مراکز کے لوگوں کو کچھ ہی مدت کے بعد بعض باتیں کھٹکنے لگی تھیں۔ مثلاً تیسرے شعر میں ''شرطِ ایمان'' نونِ آخر کے اعلان کے ساتھ نظم ہوا ہے اور یہ صورت جلدی ہی لکھنؤ اور کانپور میں متروک ہو گئی تھی۔

(6) ''تیزیِ زبان کلکِ گوہر نثار بہ زبانِ ساطعِ حقیقت امامت خدا وندِ ذوالفقار۔''

شاہ نصیرالدین نصیر وغیرہ بعض اساتذہ نے ''تیغ'' کی ردیف میں قصیدے لکھ کر اپنی قدرتِ کلام کا ثبوت پیش کیا تھا۔ مومن نے بھی قافیہ بدل کر اسی ردیف میں حضرت علیؓ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

کہتی ہے میری تیغِ زباں سے زبانِ تیغ　　کیونکر سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ

اِس شاندار مطلع کے بعد جو مطلع ثانی کہا ہے وہ بھی لائقِ ستائش ہے اور اس طرح ہے۔

پڑھتا ہوں اور مطلعِ رنگین کہ سن جسے　　سرگرمِ آفریں ہو لبِ خوں چکانِ تیغ

نہلا دیا عدو کو لہو میں بسانِ تیغ　　میری زباں کے آگے چلے کیا زبانِ تیغ

اس مشکل ردیف اور قافیہ میں ایسے مطلعے کہہ لینا شاعر کی خوبیِ فکر اور قدرتِ بیان کا مظہر ہے۔ اس قصیدے میں مدح کی طرف گریز کا انداز بھی تحسین طلب ہے۔

مومن کو آرزوے ثوابِ جہاد ہے　　کفار کاش آکے سُنیں داستانِ تیغ

آتی ہے لب پہ مدحِ خداوندِ ذوالفقار　　لے جاؤ منکروں کے لیے ارمغانِ تیغ

شیرِ خداعلیؓ کہ شجاعت سے جس کی ہے　　سر پنجۂ اسد پہ زَنخ زن بنانِ تیغ

ردیف کی مناسبت سے مومن نے ہر شعر میں نہایت تابناک مضامین نظم کیے ہیں اور اُن کے لیے الفاظ و تراکیب بھی ایسے ہی لائے ہیں۔

عام مدحیہ قصیدوں سے موضوع اور مزاج کے اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود حکیم محمد مومن خاں مومن نے اس صنف کے تمام تقاضوں کو نظر میں رکھ کر پوری محنت اور کوشش کے ساتھ یہ قصیدے لکھے تھے اور اپنی کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب بھی تھے۔ اِسی لیے وہ اردو کے چند بہترین قصیدہ گویوں میں شمار ہوتے ہیں۔

6۔ غالب

گذشتہ اوراق میں یہ ذکر آچکا ہے کہ دیوانِ غالب کے نسخۂ بھوپال کو پہلی مرتبہ مفتی محمد انوارالحق نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے مرتب کرکے شائع کر دیا تھا۔ مخطوطہ کے ترقیمہ سے تکمیلِ کتابت کی تاریخ ''پنجم شہر صفر المظفر 1237 من الہجرت النبویہ (= نومبر 1821) معلوم ہوتی ہے اور تا حال اِسی کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ نسخۂ حمیدیہ میں بہادر شاہ بادشاہ کے عہد

تک کی غزلیں اور قصیدے وغیرہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔

اس نسخۂ بھوپال کے متن کو دوسری مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں ایسا بہت سا کلام محذوف ہے جو بدیہی طور پر زمانۂ مابعد کا تھا مثلاً مفتی انوار الحق کے نسخے میں دس شعر کی ایک یہ غزل بھی مندرج ہے جس کا مطلع ہے۔

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

یہ حمید احمد خاں کے نسخۂ حمیدہ میں شامل نہیں ہے۔ ایسا ہی کچھ اور کلام بھی ہے۔ مفتی انوار الحق کے نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خاں کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

''افسوس ہے کہ قلمی دیوان سے انحراف کی جتنی مختلف قسمیں تصوّر میں آسکتی ہیں وہ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے میں نہ صرف بعد کی سب اصلاحیں بلکہ وہ پوری کی پوری غزلیں بھی شامل ہیں جن کا بھوپال کے مخطوطے میں مرے سے وجود ہی نہیں ہے۔''7

اس مذکورہ نسخۂ بھوپال کے بارے میں آج تک کسی بھی محقق نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ ''بخطِ غالب'' تھا۔ اس صورت میں وہ غالب کے متفرق مسودات سے ترتیب کے ساتھ نقل کیا گیا ہوگا یا اُن کی مرتب کردہ کسی بیاض سے منقول ہوگا۔ بہر صورت اگر اس کے ترقیمہ پر اعتماد کیا جائے تو اس میں مندرج سارا کلام زیادہ سے زیادہ 4 صفر 1237ھ تک کا کہا ہوا ہو سکتا ہے اور اُس کا مطالعہ اُس زمانے تک کے غالب کے احوال اور ان کی عمر کو ذہن میں رکھ کر کیا جانا چاہیے۔

یادگار غالب میں مذکور ہے کہ غالب کے عقیدے کے بارے میں آخر تک اختلاف رہا ہے۔ لکھا ہے کہ:

''سید صفدر سلطان نے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے۔ ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقہ کے موافق اُن کی تجہیز و تکفین کریں مگر نواب ضیاء الدین احمد خاں نے نہیں مانا۔ اور تمام مراسم اہلِ سنّت کے موافق ادا کیے گئے۔''8

نواب صاحب کی شخصیت موثر اور مقتدر تھی۔ اُنھوں نے صفدر سلطان کی بات کو ٹھکرا دیا اور جو مناسب سمجھا کر ڈالا لیکن غالب کی تحریروں کو اور ان کے عمل کو مٹا نہیں سکتے تھے۔ آزاد نے تو سند کے ساتھ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

''اکثر لوگ انھیں نُصیری کہتے تھے اور وہ سن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

''منصور فرقۂ علیٰ اللّٰہیاں منم آوازۂ انا اللہ برافگنم'' 9

غالب کے مذہب کا حال کچھ ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اپنے خطوں میں بھی اُنھوں نے بار بار پوری قطعیت اور صراحت کے ساتھ اپنے عقیدے کا اعلان کیا تھا نواب ضیاء الدین احمد خاں کا اسے نہ ماننے پر اصرار ان کی خاندانی یا ذاتی مصلحتوں سے ہوگا۔

نسخۂ حمیدیہ میں غالب کے تین قصیدے مندرج ہیں اور تینوں اُن کے عقیدے سے متعلق ہیں۔ ان قصیدوں کے عنوان اور بعض اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

(1) قصیدۂ حیدری بہ تمہید بہارِ مغفرت

اس قصیدہ کے شعروں کا انتخاب نظرِ ثانی کے بعد غالب نے اپنے دیوانِ مطبوعہ میں اس عنوان سے شامل کیا تھا:

''منتخب قصیدۂ منقبت علیِ مرتضیٰ علیہ السلام'' 10

اس ''منتخب'' میں نظرِ ثانی میں کئی شعر نئے ہو گئے ہیں چنانچہ تشبیب کے تین شعر یہ ہیں۔

سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روے شرار
کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار
کاٹ پھینکیے ناخن، توبہ اندازِ ہلال قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

یہ تینوں شعر نسخہ حمیدیہ میں اِس طرح لکھے ہوئے ہیں۔

سبز جوں جامِ زمرد نہ ہو گر داغِ پلنگ نشۂ نشوونما کو سمجھ افسونِ بہار
کفِ ہر خاکِ چمن آئینہ قمری صیقل دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار
جوہرِ ناخنِ بریدہ بہ اندازِ ہلال ریشۂ عجز کو کرتا ہے نمو سے سرشار

قصیدے کے آخر کے تین شعر اس ''منتخب'' میں اس طور پر تحریر ہیں۔

جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر یک طرف نازشِ مژگانِ ودگر سوزنِ خار
مردمک سے ہو عزا خانۂ یک شہر نگاہ خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دیدہ تا دل اسد آئینہ یک پرتوِ شوق فیضِ معنی سے رقم تا کفِ راقم سرشار

نسخۂ حمیدیہ میں ان تینوں شعروں کی صورت یہ ہے۔

جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر　　یک طرف نازشِ مژگاں بہ دگر سوئم خار
مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ　　خاک در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دیدہ تادل اسد آئینہ یک سجدۂ شوق　　فیض الفتہ سے رقم تادل معنی سرشار

نظرِ ثانی میں ان شعروں میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں اُن پر توجہ کی ضرورت ہے۔ مدح کا انداز ذیل کے شعروں میں ظاہر ہے۔

تیری اولاد کے غم میں ہے بردئے گردوں　　سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبیؐ　　جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

اور تبرا (بددعا) کی مثال یہ شعر ہے۔

دشمنِ آلِ نبیؐ کو بہ طرب خانۂ دہر　　عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

مرزا غالب کی زبان کے ذکر میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

''اس کتاب (اردوئے معلی) میں قلم، التماس کو مونث، پنشن، بیداد، بارک کو (مرزا غالب نے) مذکر فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: میرا اردو بہ نسبت اوروں کے فصیح ہوگا۔''11

چنانچہ اس قصیدے میں بھی کہتے ہیں.....ع

اس زمیں میں نہ کرے سبز قلم کا رفتار

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کی غالب شناسی رفتار کی تذکیر کو برداشت نہ کر سکی چنانچہ نسخۂ عرشی میں ''کا'' کی جگہ ''کی'' چھپا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ اِس صورتِ حال سے اندازہ کیا جانا چاہیے کہ ماہرینِ غالبیات کیا کچھ کرتے رہے ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

(2) دوسرا قصیدہ نسخۂ حمیدیہ میں ''ایضاً فی المنقبت'' کے عنوان سے ہے اور مطبوعہ دیوان میں اِس قصیدہ کا عنوان اس طور پر قائم کیا گیا ہے۔

''انتخاب قصیدہ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السلام''

اس کا مطلع نسخۂ حمیدیہ میں یہ ہے۔

توڑے ہے عجز تنگ حوصلہ بر روے زمیں سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

''انتخاب'' میں اِس کو حذف کر کے یہ نیا مطلع داخل کر دیا گیا ہے۔

دہر جُز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس قصیدے کی تشبیب کے دو شعر ''انتخاب'' میں اس طور پر آئے ہیں۔

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس وصل زنگار رخِ روشن مراۃ یقیں

کوہکن گر سنہ مزدور طرب گاہِ رقیب بیستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

یہ دونوں شعر نسخۂ حمیدیہ میں اس صورت میں چھپے ہیں۔

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس وصل افسانۂ اطفالِ پریشاں بالیں

کوہکن گر سنہ مزدور طربگاہِ رقیب بیستوں سازِ گرانباریِ خوابِ شیریں

مدح کے یہ دو شعر ''انتخاب'' میں اِس طرح نقل ہوئے ہیں۔

کفر سوزاس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

جاں پناہا دل وجاں فیض رساتا شاہا وصیِ ختمِ رسلؐ تو ہے بہ فتوائے یقیں

یہ دونوں شعر نسخۂ حمیدیہ میں اس شکل میں لکھے گئے تھے۔

کفر سوز اس کا یہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

جاں پناہا دل وجاں فیض رساں بادشہا اے کہ تجھ سے ہے بہارِ چمنستانِ یقیں

اور ایک شعر یہ بھی ہے۔

تجھ میں اور غیر میں نسبت ہے ولیکن بہ تضاد وصیِ ختمِ رسلؐ تو ہے بہ اثباتِ یقیں

پہلی صورت میں تفصیل اور تطویل تھی اور دوسری صورت میں اجمال اور اختصار ہے جس نے بیان میں بلاغت پیدا کر دی ہے۔ دونوں صورتوں میں ''وصیِ ختمِ رسلؐ'' کہہ کر شاعر نے غیر مبہم طور پر اپنے عقیدے کا اظہار کر دیا ہے۔ پھر قصیدہ کو اُس نے اس شعر پر ختم کیا ہے۔

صرف اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ وقفِ احباب گل وسنبلِ فردوسِ بریں

اِسی طور پر نسخۂ حمیدیہ میں اس تیسرے قصیدے کو ''ایضاً فی المنقبت'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس کے صرف دو مطلعے اور ایک شعر (= کل تین شعر) غالب کے مطبوعہ دیوان میں ردیف 'ی' کی

غزلوں کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں۔ ظاہرا یہ قصیدہ نامکمل رہ گیا تھا۔ شروع کے دو شعر یہ ہیں۔

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی　　تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بیزبانی
بہ گمانِ قطعِ زحمت نہ دو چار خامشی ہو　　کہ زبان سرمہ آلود نہیں تیغِ اصفہانی

اس میں مطلعِ ثانی شاعر نے اِس طرح کہا ہے۔

مجھے انتعاشِ غم نے پے عرضِ حال بخشی　　ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی　　کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

اس قصیدے کے بہ صورت موجود صرف دو شعر یہ ہیں۔

کفِ موجۂ حیا ہوں بہ گذارِ عرضِ مطلب　　کہ سرشک قطرہ زن ہے بہ پیامِ دل رسانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب　　کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے آگے کے شعر انھوں نے لکھے تھے یا نہیں۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں غالب نے خدا اور رسول ہی نہیں، کسی رئیس امیر کی مدح میں بھی قصیدہ نہیں لکھا تھا البتہ اپنی غزلوں میں ایک دو شعر مدحیہ کہہ کر کام چلا لیتے تھے۔ نسخۂ حمیدیہ میں جو قصیدے ہیں وہ ان کے قدیمی طرز کے مطابق ہیں۔ ان میں تشبیب کا حصہ زیادہ ہے اور مدح نسبتاً بہت مختصر اور کمزور ہے۔ تینوں قصیدے غیر مردف ہیں اور قوافی بھی آسان ہیں اور ان سے مرزا غالب کی.....ع

ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی

کی بخوبی تکمیل ہو گئی ہے۔

(ج) ہجو و ہزل

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی میں غیر سنجیدہ شاعری کو عموماً فروغ حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ اس زمانے میں بہ گمانِ غالب طویل ہجویات نہیں لکھی گئیں۔ معمولاً دو دو شعر کے قطعوں اور رباعیوں سے ہجو کا کام نکال لیا جاتا تھا۔ بعض وقت صرف ایک شعر کہہ کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔ دس بارہ یا کچھ زیادہ شعروں کے بھی کچھ ہجو یہ قطعے مل جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت نہیں معلوم ہوتی ہے۔

1۔ احسان

پُرانے استادوں میں سے حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان زندہ تھے اور شاید اس زمانے میں سب سے زیادہ ہجویات انھیں نے لکھی تھیں بلکہ ہجو گوئی میں وہ خود کو بہت مشاق سمجھتے تھے۔ ان کے دیوان میں چند ہجویات قطعہ کی صورت میں ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر ایک نقل کی جاتی ہے:

قطعہ ہذا در ہجوِ قلق

فکر میرا ہے آسماں پرواز　　لامکاں یہ وَلا مکاں پرواز
مجھ سے اُڑ کر عدو کہاں جاوے　　جس جگہ جاوے جوتیاں کھاوے
شہرہ اپنا عدو کو ہے منظور　　چل قلم نام اُس کا کر مشہور
آپ جنجال میں پڑا وہ پلید　　.....برائے خود تابید

ہجو میری زباں پہ آنے لگی روح سودا کی تھرتھرانے لگی
قلق ابنِ قلندر نای ایک بوگر ہے ایک گڈامی
اک مچھندر ہے شہر کے اندر ہے قلندر کے گھر میں وہ بندر
نام بُندو ہے باسمِ زن بندی وہ تو خندہ ہے اور یہ خندی
میرخاں کا شتریں بازار جوتیاں گانٹھتا ہے واں وہ چمار
کون خرگاد ریش ہے وہ سگ
خوک بھی رہوے ایسے سگ سے الگ

دیکھنے کی بات ہے کہ احسان ہجو میں بھی ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتے تھے جو گرے ہوئے اور گالی کے طور پر رائج ہوں۔ انھوں نے کتا اور سور کی جگہ خوک اور سگ نظم کیا ہے۔ ایسی صورت میں ان کی ہجویات میں ''ہجو پن'' بھی نہیں آسکا ہے۔

احسان نے دو دو شعروں پر مشتمل کئی قطعے لکھے ہیں۔ انداز ان کا بھی وہی ہے اور فحش کا عنصر ان میں بھی نہ ہونے کے برابر ہے مثلاً

قطعہ

جو اہلِ تسنن پر آوازہ کسے ناحق شاگرد ہے شیطان کا، ابلیس مقرر ہے
مردود ہے ملعون، مطعونِ خلائق ہے مسلم نہیں مشرک ہے، سو من نہیں کافر ہے

رباعی

ہیں ایک حکیم جی بہ شکلِ طاعون ہے رقص، تقیہ، بُخل اُن کا قانون
پڑھتے ہیں نفیسی اور خود ہیں وہ کثیف نسخے ہیں عجیب اور طرفہ معجون

احسان کو جو بات پسند ہوتی تھی اُس کو بے کم وکاست نظم کر دیتے تھے۔ اس میں نمک مرچ لگا کر دلچسپ یا سبق آموز بھی نہیں بناتے تھے اور پھکڑ پن تک پہنچنا تو شاید اُن کے لیے ممکن ہی نہیں تھا اسی لیے اپنے دعووں کے باوجود وہ ہجو گوئی میں کامیاب نہیں تھے۔

کہتے ہیں کہ احسان کے مزاج میں شوخی اور ظرافت تھی اور اسی نے ان کی غزلوں کے بعض شعروں کو ہزل بنایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی ظریفانہ شاعری بھی زیرِ لب تبسم کی حد سے آگے

نہیں بڑھتی اور اُن کی ظرافت کبھی بھی سنجیدگی کا دامن نہیں چھوڑ پاتی ہے۔ ذیل میں نمونہ کے طور پر چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

قاضی ہے گلوں کی حرمت ہے کتابوں میں　　لیکن بڑی ذلت ہے رشوت کا بچا جانا
بے معنی نہیں، معنی اِس رمز کے دلکش ہیں　　مانگ اپنی دکھا جانی، چٹکی کو بجا جانا
محتسب قہر ہے تو شوق سے نکلے انگور　　اور محروم رہیں بادۂ انگور سے ہم

خفا مت ہو مجھ کو ٹھکانے بہت ہیں
مرا سر رہے آستانے بہت ہیں

2۔ اوج

مرزا قادر بخش صابر نے ان کا احوال خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

''اوج تخلص، عبداللہ خاں ساکن سردھنہ۔ اپنے اشعار کو لکھ لیتا اور اپنے لکھے کو پڑھ لیتا۔ بیشتر کاملانِ فنِ سخن بہ طریقِ ظرافت اِس کو استاد کہتے۔ ہمیشہ زمین ہائے سنگلاخ کی تلاش میں رہتا۔ عرصہ ایک سال کا ہوا کہ خلوت خاک کو اپنا گوشۂ عافیت بنایا۔''1

مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ان کو دیکھا تھا اور اِن کے احوال میں آبِ حیات میں چند صفحے صَرف کیے ہیں۔ انھوں نے جو لکھا ہے مختصراً یہ ہے:

''ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لا سکتے تھے اور انھیں عمدہ الفاظ میں ایسی چستی اور درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سا بھی نہ سکتا تھا۔ فکرِ مضامین اور تلاشِ الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ آپ ہی آپ مزے لیتے تھے۔ ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہو گیا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے تو صفِ مجلس سے گز گز بھر آگے نکل جاتے تھے۔ ایک دن رستہ میں ملے۔ دیکھتے ہی کہنے لگے۔ آج گیا تھا۔ انھیں (مرزا غالب کو) بھی سنا آیا۔ میں نے کہا: کیا؟ کڑک کر کہا

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب　　غالب آسان نہیں صاحبِ دیوان ہونا2

عمومی واقعات پر اکثر شعر کہا کرتے تھے۔ مومن خاں مومن کو کنور اجیت سنگھ نے ہتھنی دی۔

آپ نے کہا۔

جنموں میں وہ مومن مکان لیتا ہے نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

دلّی میں شیریں ایک بڑی نامی رنڈی تھی۔ وہ حج کو چلی۔ آپ نے کہا ۔

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلّی حج کو چلی مثل ہے نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی

ان کی ظرافت بھی ارادی اور شعوری نہیں ہوتی تھی بلکہ جن واقعات یا معاملات سے متعلق یہ شعر کہتے تھے ان میں بجائے خود کبھی ہجو اور کبھی ظرافت کا پہلو نکل آتا تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہیں مچھلیاں بھووں کی جبینِ پُرشکن کے اندر اُلٹی ہے بہتی گنگا مچھی بھون کے اندر

میں وہ ہوں مثلِ جوئے سلسبیلِ دریائی یہ مری ہے کشتیِ گل نار جیلِ دریائی

میں اپنے کوچ کی ہوں موج میں بہا جاتا حباب وار ہوں کوسِ رحیلِ دریائی

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا بے پُل صراط اُتریں یہ ہے کمال اپنا

کسب شہادت اپنا ہے یا دکس کو قاتل سانچے میں تیغ کے، سر لیتے ہیں ڈھال اپنا

3۔ خلیفہ

مرزا قادر بخش صابر نے اس شاعر کا تعارف مختصراً اس طرح کرایا ہے:

"خلیفہ تخلص، رجبی حجام، موزوں طبع، ظریف مزاج، ساکن شاہجہاں آباد تھا۔ راگ و رنگ میں شریکِ یارانِ رنگین صحبت اور ضلع اور خلعت میں ہمرنگِ مصاحبانِ صادق المودت۔ ایک پہلوان کی ہجو میں چند شعر موزوں کیے تھے۔ اس میں سے یہ شعر یاد رہ گیا۔

اوندھا پڑے ہے نیچے سدا ہر جوان کے تا لوگ یہ کہیں کہ کبھی چت نہیں ہوا" 3

افسوس ہے کہ نہ تو خلیفہ کے مزید حالات دستیاب ہو سکے اور نہ اس کی مذکورہ ہجو کا کوئی اور شعر ملا۔ اس ایک شعر سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کی یہ ہجو مثنوی کے بجائے غزل کی ہیئت میں تھی۔

4۔ فدا

سید محمد علی نام تھا۔ سپاہی پیشہ تھے لیکن فقیری اختیار کر لینے کے بعد فدا شاہ کر کے مشہور

ہو گئے تھے۔ شیفتہ نے ان کے تعارف میں جو لکھا ہے مختصراً یہ ہے:

''از سکنائے لوہاری من متعلقات سہارنپور۔ بیشتر معاش بہ پیشہ سپاہگری می کرد۔ آخر خوف معاد غالب آمدہ۔ دنیا را بہ اہل دنیا گذاشتہ..... مردے بود خوش اختلاط، بذلہ سنج از فدائیان فن شعر..... عاقبت مائل بہ ہزل گشت۔ رفتنش رااز یں دیار یازدہم سال است۔''4

یعنی یہ اکبر شاہ ثانی کے ابتدائی زمانے میں دہلی میں رہے تھے۔ اِن کے کلام میں ہزل کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔

نمونے کے طور پر دو شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

اس سے میں اور مجھ سے وہ باہم رہا ایک مدت تک یہی عالم رہا
جس نے کھایا ہے تیر مژگاں کا اُس کے نزدیک پھانس ہے بھالا

5۔ کرم

شیخ غلام ضامن نام تھا۔ حکیم مومن خاں مومن کے شاگرد تھے۔ حیدر آباد تک کا سفر کیا تھا۔ نواب شیفتہ نے اِن کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''باوجود کہن سالی مرد شگفتہ وظریف است۔''5

فرہاد و قیس عشق میں سرگرم لاف تھے خاموش ہو گئے جو مرا نام آ گیا
اُس کو شہرت کی تمنا، مجھے رسوائی کی ہر کوئی آرزوے نشو ونما رکھتا ہے
گھبرا کے لگے دیکھنے وہ اپنی بنا گوش جب اشک سری آنکھوں سے دُردانہ سے نکلے
کس باغ میں وہ رونق گل جلوہ کناں ہے نکلے ہے دُھواں سا در فردوس بریں سے

شیفتہ کے بیان کے باوجود اِن کے یہاں بھی ظرافت کی طرف میلان شعوری نہیں معلوم ہوتا ہے۔ صرف کسی کسی شعر کے مضمون میں ظرافت کا برائے نام سا عنصر معلوم ہوتا ہے۔

6۔ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب کو ''حیوان ظریف'' کہا گیا ہے اور ان کے لطائف وظرائف مشہور ہیں لیکن ان کی شاعری کو ''ظریفانہ'' نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ان کے دیوان میں یہ چند شعر اِس اعتبار

سے ضرور لائق توجہ ہیں۔

شیخ جی کعبے کا جانا معلوم آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں جیسے بھی حالات تھے لیکن اس بارے میں شبہ نہیں کہ اس وقت ظریفانہ شاعری، ہزل اور ہجو وغیرہ کے لیے دہلی میں ماحول سازگار نہیں تھا اور اس زمانے میں اس قسم کی شاعری کا کوئی لائق توجہ نمونہ سامنے نہیں آسکا۔ نام برآوردہ شاعروں میں سے کسی نے بھی ہزل اور ہجو کو بطور خاص اختیار نہیں کیا تھا۔ حکیم مومن خاں مومن نے تو بہت صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا

ع ہجو گوئی نہیں ہمارا کام

اور شیخ ذوق کے حال میں آزاد نے لکھا ہے کہ:

"ہزاروں آدمیوں سے انھیں ناراضی یا رنج پہنچا ہوگا مگر تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل دیتا ہے۔ اس کی شان دیکھو کہ اڑسٹھ برس کی عمر پائی مگر خدا نے ان کی ہجو بھی کسی کے منہ سے نہ نکلوائی۔"[6]

خود شیخ ذوق کا قول یہ تھا۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

(د) واسوخت

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی کا ماحول بطور مجموعی ریختی اور واسوخت وغیرہ شعری اصناف کے لیے بھی کچھ سازگار نہیں تھا چنانچہ وہاں کے معروف شاعروں نے عموماً ان کی طرف نہ کرنے کی برابر توجہ کی ہے۔ حکیم مومن خاں مومن نے ضرور ہر قسم کے واسوخت لکھے ہیں۔ بیشتر مسدس ہیں، کچھ مخمس وغیرہ کی صورت میں ہیں۔ ایک دو میں دوسرے شاعروں کے شعر تضمین کیے ہیں۔ بعض ترجیع بند کے طور پر ہیں اور چند ترکیب بند کی شکل میں بھی ہیں۔

مومن کے دیوان میں جو پہلا واسوخت ہے اس کا عنوان اس طرح ہے:

"تضمینِ شعر خواجہ میر درد قدس اللہ سرہ بہ طریق تسدیس"

اِس عنوان سے واسوخت کی نوعیت کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس میں شاعر نے خواجہ میر درد کے ایک مطلعے کو تضمین کرنے کے لیے انتخاب کیا ہے۔ چنانچہ یہ واسوخت ترجیع بند کے طور پر ہے۔ اس میں کل گیارہ بند ہیں۔ کچھ متفرق بند یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

جائے عبرت ہے مرا حالِ پریشاں یارو　　آس توڑے ہے یہ مایوسیِ حرماں یارو
دل لگا کر میں ہوا سخت پریشاں یارو　　ہائے افسوس نہ نکلا کوئی ارماں یارو

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

دل نہ دیتے اگر اس کو تو نہ ہوتے بدنام　　کیا خبر تھی کہ اس آغاز کا یہ ہے انجام
رنج بھی ہوتے ہیں الفت میں تو بعد از آرام　　کہیں دنیا میں نہ ہوگا کوئی ہم سا ناکام

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

کھو دیا مفت میں دل میں نے کہ دکھ ہے پایا　　قلقِ ہجر نے کیا کیا نہ مجھے گھبرایا
پردہ پُرفن نہ ملایوں ہی سدا ترسایا　　نہ وہاں مجھ کو بلایا نہ یہاں آپ آیا

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

یہاں وہ آیا نہ عیادت کو بھی اک بار افسوس　　مرتے مرتے نہ گئی حسرتِ دیدار افسوس
کرسکا ولولۂ شوق نہ اظہار افسوس　　نہ ہوے نزع تلک واسپ گفتار افسوس

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اس ترجیع بند کا آخر بند اس طرح ہے۔

میں بھی حاضر تھا ہوئے جب طرفِ کعبہ رواں　　حضرتِ مومن تقویٰ روش و شیخ زماں
بے ادب ہنستے تھے کیا لوگ ہیں بیہودہ گماں　　پڑھ کے یہ درد کا مطلع جو ہوے اشک فشاں

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اس ترجیع بند میں واسوخت والی بات کم سے کم ہے البتہ زیرِ تضمین شعر کی مناسبت سے اس میں ایک حد تک مرثیہ والی کیفیت آگئی ہے۔ اسی طور پر مومن نے ایک واسوخت اور بھی کہا ہے جس کا عنوان ہے:

"تضمینِ شعر منشی فضل عظیم"

یہ بھی مسدّس ترجیع بند ہے اور اس میں بھی شاعر نے بہت کامیابی کے ساتھ عاشقِ دردمند کی سرگذشت سنائی ہے۔ اس کے دو بند یہ ہیں۔

یہ میرا حال جو اے یارو دیکھتے ہو تباہ　　کہ رنگ زرد ہے مُنہ فق ہے، بکھری بکھری نگاہ
ہیں اشک چشم میں اور لب پہ نالۂ جانکاہ　　یہ سب ہے دل کے سبب دل نے مجھ کو مارا آہ

دل فریفتہ و ردے قاتلے دارم
زوستِ دل بہ عذابم عجب دلے دارم

قلق میں رکھے ہے مجھ کو ہمیشہ میرا دل　　مرے تو سینہ میں اے کاش کہ نہ ہوتا دل
اگر ہُوا بھی تھا تو جیسے اور سب کا دل　　تجھے بھی دینا تھا یارب مجھی کو ایسا دل

دل فریفتہ و ردے قاتلے دارم
زوستِ دل بہ عذابم عجب دلے دارم

اِس نہج پر یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ واسوختن اعتراض کردن و روگردانیدن کے معنی میں آتا ہے چنانچہ واسوخت میں روگردانی، تنفر اور بے پروائی کا مضمون ہونا چاہیے۔ عام طور سے واسوخت مسدّس کی صورت میں ترکیب بند یا ترجیع بند کے طور پر لکھے گئے ہیں اور ان میں معشوق کی شکایت اُس سے بیزاری اور بے پروائی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ضمناً عشق کی مذمّت بھی کی جاتی ہے۔ حکیم محمد مومن خاں مومن نے دوسرے شاعروں کے کلام کی تضمین کے علاوہ خود اپنے طور پر بھی چند واسوخت تصنیف کیے ہیں۔ ایک واسوخت کا عنوان ہے:

''مسدّس بہ مضمونِ واسوختِ ہجر''

یہ بطور ترکیب بند ہے اور اس کا پہلا بند اس طرح ہے۔

اے ستمگر کہاں تلک بیداد　　سرِ پامالِ عاشقِ ناشاد
قول دینا عدو کو حسبِ مراد　　مرگیا تیرے ہاتھ سے فریاد

فکرِ جور و سرِ جفا کب تک
بے وفا غیر سے وفا کب تک

اس کے بعد حکیم مومن خاں زمانے کی بے اعتباری کا بیان کر کے محبوب کو راہ پر آجانے کا

مشورہ دیتے ہیں اور پھر کسی دوسرے محبوب کو سر پر بیٹھا لینے کا ذکر کر کے کہتے ہیں۔

اس کی جانب نظر رہے ہر دم تھام لوں بس دل وجگر ہر دم
کھینچوں میں پُرشرر ہر دم بزم میں اس کو دیکھ کر ہر دم
مسکراؤں ترے رُلانے کو
داغ کھاؤں ترے جلانے کو
سب یہ پاس ولحاظ اٹھائے وہ رشک سے جی ترا بٹھائے وہ
جورو بیداد کی سزا دے وہ کیا تماشا غرض دکھائے وہ
کیسے کیسے بہم نظارے ہوں
تیرے دکھلانے کو اشارے ہوں

اِس قسم کے بیان کے بعد شاعر نے اِس نئے محبوب کو آدابِ عشق سکھا لینے کا دعویٰ کیا ہے چنانچہ ذیل کا بند توجہ طلب ہے۔

ڈھب پہ اپنے اُسے لگالوں گا حسرت وآرزو نکالوں گا
تجھ سے بے باک تر بنالوں گا نازو انداز سب سکھالوں گا
چاہیے آفتِ زمانہ بنے
غیر ناآشنا یگانہ بنے

آخر میں دل کی بات کہہ کر شاعر نے بڑی دلسوزی کے ساتھ اِس داستان کو ختم کیا ہے۔ اس کے آخر کے ایک دو بند یہ ہیں۔

مت برا مان عرض میرا گا کیا گلہ حرفِ اہلِ سودا کا
کر علاج آہ تابِ فرسا کا اب تلک وقت ہے مدارا کا
گر مکافاتِ ہجر دل جو ہو
پھر وہی میں ہوں اور وہی تو ہو
پر کروں کیا کہ اختیار نہیں دل بے تاب کو قرار نہیں
کچھ محبت کا اعتبار نہیں یعنی اچھا مآل کار نہیں

تم کو خو ہو گئی تغافل کی
یہاں نہیں حد رہی تحمل کی
کب تلک یہ جفا سہوں گا میں　　اِس ستم پر نہ کچھ کہوں گا میں
یہ نہیں ہے تو بس نہ ہوں گا میں　　جو کہا ہے سو کر رہوں گا میں
جلے کیوں مومن آتشِ غم میں
جائے ایسی وفا جہنم میں

اپنے مطالب کے اعتبار سے اس کو مثالی واسوخت کہا جاسکتا ہے۔ زبان کی سلاست اور بیان کی روانی بھی دادطلب ہے۔ تیں بند کے اس واسوخت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس صنف کے دائرہ سے باہر ہو اور ہر بند کے مضمون میں ربط کی صورت بھی موجود ہے۔ اس واسوخت کو پڑھتے وقت بار بار ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ بیان خود مومن کی آپ بیتی کا ایک حصہ ہے اور غالباً اسی لیے پُر اثر ہے۔

مومن کے ایک دوسرے واسوخت کا عنوان اور اس کا پہلا اور آخری بند اس طرح ہے:

''ایضاً واسوخت بہ ہماں قالب مسدّس''

دوستو عشق نہفتہ نے ستایا ہے مجھے　　آشوقِ نہانی نے جلایا ہے مجھے
کیا کہوں کیا غمِ پنہاں نے دکھایا ہے مجھے　　ضبطِ وحشت نے یہ دیوانہ بنایا ہے مجھے
چہرۂ زار سے پردہ نہ اٹھاؤں کب تک
گوشۂ پردہ نشیں ہے نہ دکھاؤں کب تک

ہائے جی بیٹھ گیا بس کہ اٹھائے ہیں ستم　　دل کھنچے کیوں نہ بہت کھینچ چکا رنج والم
صدقۂ عشق نے بیطور کیا ناک میں دم　　ایسا بیزار ہُوا ہوں کہ خدا کی ہے قسم
اُس نے بھی کام نہ رکھا تو نہ رکھوں گا کام
پھر یہ سمجھوں گا کہ مومن کو بتوں سے کیا کام

اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ واسوخت پہلے سے مختلف ہے اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مومن نے واسوخت کی حدوں پر نظر رکھ کر اس کے مضامین میں وسعت پیدا کرنے کی مثبت اور

لائق ستائش کوشش کی تھی۔

عام طور سے واسوخت مسدس کی صورت میں ہی لکھے گئے ہیں۔ مومن نے ایک واسوخت مثمن کے طور پر بھی لکھا تھا۔ اُس کا عنوان اِس طرح ہے:

"متضمن روضۂ گلستانِ دلفروز بہ گلفشانیِ مضامینِ دلسوز"

اس واسوخت کا موضوع بھی نیا اور دلچسپ ہے۔ اِس کے شروع کے بند یہ ہیں۔

اے چارہ گر آ چک کہ دمِ چارہ گری ہے　　میں جان سے مرتا ہوں تجھے بے خبری ہے
کیوں پہلے ہی درماں سے یقینِ بے اثری ہے　　اپنی سی تو کر دیکھ، عبث نسخہ دری ہے
ہو جاؤں میں جانبر تو تری ناموری ہے　　یوں دعویِ بے صرفہ تو بیہودہ سری ہے
گر ہم سے مریضوں کی دوا ہووے تو جانیں
بیمار محبت کو شفا ہووے تو جانیں

ہر چند کہ درماں ہی نہیں عشقِ بتاں کا　　زخمِ دلِ مجروح پہ لگتا نہیں ٹانکا
مرنا قلقِ ہجر، میں بچتا ہے یہاں کا　　پر شکر ہوا سہل علاج اپنی تو جاں کا
وہ حال نہیں ہے دلِ بیتاب و تواں کا　　تھمتا نظر آتا ہے لہو زخمِ نہاں کا
تاثیر دوا اب تری کر جائے تو کر جائے
ہر چند کہ ناسور ہے بھر جائے تو بھر جائے

اس تمہید کے بعد مریضِ عشق اپنی روداد اس طرح سنانا شروع کرتا ہے۔

کل گھر میں وہ بیٹھے تھے سراسیمہ و حیراں　　اس حال کے دیکھے سے ہوا حال پریشاں
غصہ کے سبب چھپ نہ سکی رنجشِ پنہاں　　سمجھا میں کہ یوں بھی تو ہے مایوسی و حرماں
انصاف کرو، صبر کرے کب تلک انساں　　ناچار کہا طعن سے میں نے کہ میری جاں
کس سوچ میں بیٹھے ہو ذرا سر تو اٹھاؤ
گو دل نہیں ملتا ہے پر آنکھیں تو ملاؤ

اسی سلسلے کے کچھ اور بند نقل کیے جاتے ہیں۔

ہر اک سے بگڑ کر مرے دم پر نہ بناؤ　　دن رات جہاں رہتے ہو اب بھی وہیں جاؤ

کیوں ہاتھ سے جاتے ہو تم اتنا بھی نہ آؤ جو تم کو ستایا کریں تم ان کو ستاؤ
دل سرد ہوا تم سے مراجی نہ جلاؤ اِس گرمیِ الفت کو بس اب آگ لگاؤ
کب تک جلے کوئی یہ تپش خاک میں مل جائے
ٹھنڈا ہو کلیجا جو کہیں سوزشِ دل جائے

کچھ تم ہی تو دلبر نہیں اے یار جہاں میں تم سے بھی زیادہ ہیں طرحدار جہاں میں
باقی ہیں ابھی دل کے طلبگار جہاں میں اس جنس کی ہے گرمیِ بازار جہاں میں
نکلیں گے بہت آپ کے اغیار جہاں میں میرے بھی ہزاروں ہیں خریدار جہاں میں
معشوق مجھے، گر تمھیں عشاق بہت ہیں
یہ یاد رہے میرے بھی مشتاق بہت ہیں

لازم ہے کہ ضد سے میں تری بزم میں جاؤں دیکھے کہ نہ دیکھے کوئی، احوال دکھاؤں
ہر ایک کو افسانۂ دلچسپ سناؤں یہ تیری جفا، اس کی وفا سب کو جتاؤں
اس شعلہ زبانی سے میں کیا کیا نہ جلاؤں شاعر ہی تو ہوں شکر و شکایت پہ جو آؤں
مشہور اُسے اور تجھے بدنام کروں میں
ناکام تجھے اور اسے خود کام کروں میں

آخری بند یہ ہے۔

پھر دل نہ ملے بات سے گو بات کو ٹالوں پھر جان نہ سنبھلے مری، ہر چند سنبھالوں
ناچار ہو پھر آپ سے میں تجھ کو مَنالوں بیتاب ہو بس دوڑ کے چھاتی سے لگالوں
پھر دل کے لیے سر سے سب ارمان نکالوں تجھ کو بھی میں اپنا سا وفادار بنالوں
ہے نام جو پھر تابعِ فرمان کروں میں
مومن ہوں تو تجھ کو بھی مسلمان کروں میں

مومن کے واسوخت اردو کی بیانیہ شاعری کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں عاشق کے جذبات، کیفیات اور معاملات کی بہت کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ ان میں فکر کی تیزی اور خیالوں کی نزاکت کے ساتھ ساتھ بیان کا ربط، بندش کا لطف اور زبان کی خوبی بھی داد طلب ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ان کی طرف تا حال کما حقہٗ توجہ نہیں کی گئی ہے۔

(۵) مثنوی

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ہر قسم کی مثنویاں لکھی گئی تھیں۔ خود بادشاہ اور ملکہ ممتاز محل کی دلچسپی کے لیے فارسی زبان کی ایک دو مشہور رزمیہ داستانوں کو اردو کے قالب میں منتقل کیا گیا تھا۔ کچھ خیالی اور عشقیہ مثنویاں بھی لکھی گئی تھیں اور خود اپنی طبیعت کے جوش سے شاعروں نے اپنی عشقیہ زندگی کی بعض وارداتوں کو بھی مثنوی کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کی بعض مثنویاں اعلیٰ درجے کی نہیں ہیں لیکن بطور مجموعی ان کا معیار کچھ بہت گرا ہوا بھی نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک دو مثنویاں تو بلاشبہ اردو شاعری کے سرمایے میں قابلِ توجہ اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

1۔ منشی

شاہ عالم ثانی کے وقت کے شاعر تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

> ''منشی تخلص، منشی مول چند قوم کا۔ جھ، شاگرد ازلی شاہ نصیر مرحوم اور ملازم ابدی سرکار فیض آثار سلطانی حضرت شاہ عالم بادشاہ۔ ان کے حضور قصائد حمیہ پڑھتا رہا۔ شمشیر خانی کو اردو میں نظم کیا ہے۔ عرصہ بعید ہوا کہ عالم باقی کی طرف رحلت کی۔''[1]

تاریخ شمشیر خانی فردوسی کے شاہنامہ کا نثری ترجمہ بلکہ انتخاب ہے جس کا مولف میرزا توکل بیگ ابن تولک بیگ حسینی تھا۔ اصل قصہ کے اس اختصار کو مولف نے شمشیر خاں حاکم غزنین کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اس کی تکمیل کا سال 1063ھ (1653) ہے۔ منشی کی مذکورہ نظم کا ماخذ یہی انتخاب ہے چنانچہ اس نے خود بیان کیا ہے کہ:

تواریخ کا بھی جو مذکور تھا تو پھر ہر کسی نے بیاں یوں کیا
کہ ہے شاہنامہ تماشا کتاب عجب نظم دلکش ہے با آب و تاب
توکل کہ مرد سخن سنج تھا کیا ترجمہ اس نے شہنامہ کا
لکھا نثر میں نسخۂ مختصر کہ احوال معلوم ہو سربسر
بہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے تمام اس میں احوال مرقوم ہے

منشی کے ایک (غالباً بڑے) بھائی کا نام زور آور سنگھ تھا۔ وہ بھی اپنے زمانے کے معروف شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ تقریباً سبھی معاصر تذکروں میں اس کا حال درج ہے۔ قدرت اللہ خاں قاسم نے لکھا ہے:

"(عاجز تخلص) زور آور سنگھ کھتری نبیرہ رائے آنند رام مخلص شاگرد شیخ نصیر الدین غریب شعرش کیفیتے دارد۔"[2]

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ایسے کافر سے لگا دل کہ ہُوا کام تمام لے گیا صبر و دل و طاقت و آرام تمام
عاشقوں کو ترے یکجا نہیں آرام کہیں دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

افسوس ہے کہ لالا سری رام کے اتنے ضخیم تذکرے میں اس شاعر کے نام اور کلام کو جگہ نہیں مل سکی۔ بہرنوع منشی نے اپنے اسی بھائی کے کہنے سے شمشیر خانی کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا تھا۔ خود کہتا ہے۔

یہ سنکر برادر مرے مہرباں سخن فہم و دانشور و نکتہ داں
کہ زور آور اُن کا جہاں میں ہے نام بہ خُلق پسندیدہ مشہور عام
یہ بولے کہ اے منشی اس نامہ کو تم اب ریختے کی زباں میں لکھو

کرو نظم ترتیب با آب وتاب بنامِ شہنشاہِ گردوں جناب
ہُوا میں دل وجان سے مصروفِ کار لکھی نظم یہ دلکش وآبدار

تو پھر ہاتفِ غیب نے صبح دم
کہا قصۂ خسروانِ عجم

1225ھ(1810)

اپنی نظم کے شروع میں منشی نے درج ذیل عنوان قائم کیے ہیں:

مناجات بارگاہ حق سبحانہٗ تعالیٰ

نعت سرورِ کائنات جناب رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام

درتعریف ابونصر محمد معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی

اورسببِ تالیفِ کتاب۔

اوراس نے یہ دعا کی ہے کہ ع: مرے خامہ کوکرتو گوہرفشاں

اپنے بادشاہ کی مدح میں اس نے شاہانِ سلف میں سے کئی کے ناموں کی رعایت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ چند شعر یہ ہیں:

لکھ اے خامہ اب مدحِ شاہِ جہاں شہنشاہِ جمجاہ صاحب قراں
جہاندار اکبر شہِ بے نظیر خداوندِ تاج وکلاہ وسریر
ہمایوں خصایل شہِ نامور تجستہ شمایل فرشتہ سیر
محبت رکھے ہے وہ درویش سے مودت ہے اس کو وفا کیش سے
حقیقت کروں علم کی کیا بیاں نہیں اس کے ہم سنگ کوہِ گراں
درِ دولتِ شاہِ عالم پناہ فقیر دغنی کا ہے امید گاہ
شہنشہ کے اوصاف ہیں بے شمار نہیں تابِ کلک وزباں زینہار

منشی نے اپنی اس نظم پر بہت محنت کی تھی چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

بجز فکرِ اشعار شام وسحر نہ تھی مجھ کو زنہار فکرِ دگر

اوراس طرح اکبر شاہ ثانی کے چوتھے سال جلوس یعنی 1225ھ(1810) میں اس نظم کو

مکمل کر کے اس کا تاریخی نام "قصۂ خسروان عجم" مقرر کیا لیکن اسے شہرت "شاہنامۂ اردو" کے نام سے حاصل ہوئی۔ بمبئی، دہلی، لکھنؤ وغیرہ مراکز سے یہ شاہنامہ چھپتا بھی رہا۔ اس کے دو نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ ان پر نام اس طرح لکھا ہے:

"خسروانِ عجم یعنی شاہنامۂ اردو"

ہنومان پرشاد نامی کاتب نے اس میں سے ایک کی پندرہ سطری مسطر پر 1848 (1264ھ) میں کتابت کی تھی۔ اس کی ضخامت ایک سو ساٹھ ورق ہے۔

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے مولچند منشی کے حالات میں یہ اطلاع بھی قلم بند کی ہے کہ:

"حسب الحکم ارفع واقدس (شاہ عالم ثانی) قصہ منظوم می سازد۔"[3]

اس وقت وہ کون سا قصہ نظم کر رہا تھا اس بارے میں تا حال کوئی بات معلوم نہیں ہے البتہ اس بیان کی روشنی میں یہ امر یقینی ہے کہ شاہنامہ منشی کی پہلی نظم نہیں ہے شاہنامہ کی زبان کی صفائی اور بیان میں روانی بھی اسی خیال کی موید ہے۔ خود منشی نے شاہنامہ کے "خاتمۂ کتاب" کے عنوان کے تحت کہا ہے۔

جو شمشیر خانی میں تسطیر تھا — سو وہ بے کم و کاست میں نے لکھا
سپاسِ خدائے جہاں آفریں — بر آرندۂ آسمان و زمیں
کہ نخلِ تمنا ہُوا بارور — ہُوا گلشنِ آرزو تازہ تر
غرض نظمِ دلکش نے پایا نظام — بخوبی ہوا شاہنامہ تمام
نہیں ہے کسی کو ثبات و قرار — یہ نامہ جہاں میں رہے یادگار
الٰہی شہنشاہِ والا گہر — کہ یہ نامہ جس کے ہوا نام پر
خرد پرور و قدر دانِ سخن — شہِ نامور بادشاہِ زمن
سرِ تاجدارانِ گردن فراز — جہاندارِ عادل رعیت نواز
ابوالنصر اکبر خدیو زماں
جہاں میں رہے جب تلک ہے جہاں

وہ زمانہ تھا جب فارسی کا بول بالا تھا۔ اس نظم کا بھی حال یہ ہے کہ مصرعے کے مصرعے بلکہ

پورے پورے شعر بھی فارسی میں موزوں ہو گئے ہیں۔ شاعر نے شمشیر خانی کے مطالب کو ''بے کم وکاست'' اپنے لفظوں میں منتقل کیا ہے۔ اپنی طرف سے ترمیم واضافہ کرنے کا اس نے دعویٰ نہیں کیا ہے اس منظوم ترجمے میں شاعری یا جذبات نگاری کی تلاش بے جا ہے۔

منشی کی دوسری نظم ''سام نامہ'' ہے۔ اسے شاہنامہ کا تکملہ کہا جا سکتا ہے۔ شاہنامہ میں رستم، سہراب، گیو اور بیزن کے علاوہ اسفندیار وغیرہ کا ذکر آ گیا تھا لیکن اس میں سام کا مذکور نہیں آیا تھا۔ یہ کمی منشی کو کھٹکتی رہی تھی۔ فارسی میں ایک عشقیہ مثنوی سام نامہ کے نام سے موجود تھی جس کو خواجہ کرمانی نے 753ھ (1352) میں مکمل کیا تھا۔ منشی کو سام نامۂ فارسی کی کوئی روایت مل گئی تھی۔ دو برس کی مدت میں اُس نے اسے بھی اردو میں منتقل کر دیا اور اس کی تکمیل کی تاریخ اس مصرعے سے نکالی ع:

زہے نامۂ سام بس دلپذیر

1227ھ (1812)

منشی کا سام نامۂ اردو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی زبان اور بیان کا انداز بھی ویسا ہی ہے۔ اس کے کچھ شعر نمونہ کے طور پر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

صفیرِ عنادل گلِ بوستاں پری ایک مسکن گزیں تھی وہاں
اُتر اسپ سے یہ جواں مرد سام گیا سوے بُتاں بہ شوقِ تمام
یلِ نامور باغ میں جب گیا پری نے زمیں بوس حاصل کیا

اس عشقیہ مثنوی میں بھی داستانوں کی روایت کے مطابق دیووں اور پریوں کا عمل بخوبی موجود ہے۔ شاعر نے اپنے طریقہ کے مطابق اس مثنوی کو بھی حمد ونعت سے شروع کیا ہے اور اس کے بعد اپنے بادشاہ اکبر شاہ کی مدح کا آغاز کیا ہے۔

ہیر ورانجھا کا قصہ بارہویں صدی ہجری کے اوائل (اٹھارھویں صدی عیسوی کے اختتام) میں مشہور تھا اور یکے بعد دیگرے مختلف شاعروں نے اسے فارسی زبان میں نظم کیا تھا۔ ان میں ایک قدیم روایت فقیر اللہ آفریں لاہوری کی بھی ہے جس کا نام ''مثنوی ہیر ورانجھا با ناز ونیاز'' تھا۔

اس کے بعد منشی منسارام خوشابی کی مثنوی ہیر ورانجھا ملتی ہے۔اس مثنوی کا سالِ تالیف ذیل کے مصرعوں سے معلوم ہوتا ہے۔

ع قصۂ عاشقی تمام شنو

1157

ع عشق رانجھا و ہیر وصادق بود

1158

پہلی شاید آغاز کی اور دوسری غالباً اِس مثنوی کی تکمیل کی تاریخ ہے۔ ان دو کے علاوہ سعیدی، رستم علی اور سندر داس آرام وغیرہ نے بھی اس قصہ کو فارسی زبان میں نظم کیا تھا۔ یہ قصہ پنجاب کے علاقے سے متعلق ہے اور پنجابی زبان میں بھی اس کی چند روایتیں موجود ہیں۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں وارث شاہ (یکے ازافاضلِ اواخرِ صدی دوازدہم ہجری =اٹھارھویں صدی عیسوی) کا منظوم افسانہ ''ہیر ورانجھا'' مخطوطہ کی صورت میں محفوظ ہے۔4

سام نامۂ اردو کے بعد مولچند منشی نے ہیر ورانجھا کے قصہ کو اردو میں مثنوی کی ہیئت میں نظم کیا تھا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ شاید اس نے آرام کی مثنوی کا ترجمہ کیا ہوگا۔ منشی نے جو لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اکبر شاہ کی ملکہ ممتاز محل کی ایما سے یہ کام کیا تھا، اور اس نے غالباً کسی پنجابی روایت کو اپنا ماخذ بنایا ہوگا۔ وجہ اس کی ایک یہ بھی ہے کہ منشی کا خود بھی پنجاب کے خطے سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں اس نے خوب کہا ہے۔

پرستاں ہے یا ملکِ پنجاب ہے جہاں رخصتِ طاقت و تاب ہے

اس تعلقِ خاطر کی وجہ سے منشی کو قصے میں جو اپنائیت محسوس ہو رہی تھی اس نے اس مثنوی میں گویا جان ڈال دی ہے اور بصورتِ موجودہ یہ اس کی بہترین تخلیق کہی جا سکتی ہے۔

اس مثنوی کو بھی منشی نے ''مناجات بہ درگاہ مجیب الدعوات'' سے شروع کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے ''نعت جناب رسالت پناہ محمد رسول اللہ صلعم'' لکھی ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں۔

تمنائے دل ہے یہ صبح و مسا کہ اِس اُستانہ پہ ہو جبہ سا
کہ ہے خاک کو جس کی جوں مہر تاب نہیں اس کے روکش بلند آفتاب

سرِ سروراں سیّد المرسلین درخشندہ خورشید ایمان و دیں
محمدؐ کہ ہے ختمِ پیغمبراں جناب اس کی ہے قبلہ گاہِ جہاں
محمدؐ نہیں کوئی جس کا عدیل جناب اس کی ہے محبط جبرئیل

اس مقام پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے ماحول میں پلے ہوئے مولچند منشی نے چاروں خلفا کی مدح بھی لکھی ہے اور اس طرح خود کو سُنّی عقیدہ سے موافق ظاہر کیا ہے۔

کہا جا چکا ہے کہ یہ مثنوی ملکہ ممتاز محل کی ایما سے لکھی گئی تھی اس لیے بادشاہ وقت یعنی اکبر شاہ ثانی کے بعد ملکہ کی مدح میں بھی اشعار کہے گئے ہیں۔ بعض روشن خیال جو پردے کی مخالفت میں اپنی زبان خراب کرتے رہتے ہیں انھیں دیکھنا چاہیے کہ مسلم معاشرے کے آداب و رسوم کی پابندیوں کے باوجود شاہی کے آخر زمانے تک بھی بیگمات دنیا کے معاملات سے غیر متعلق نہیں رہتی تھیں۔ وہ علم و دانش کی سرپرستی اور فروغ میں بھی حسب ضرورت اور کما حقہ دخیل رہتی تھیں اور ان کی نوازشات سے بھی اہلِ کمال فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔

مولچند منشی نے ظاہراً اصل ماخذ کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ قصہ کو اپنے طور پر آزادانہ نظم کہا ہے اس لیے اِس میں اپنی طرف سے اس نے بعض مطالب کا اضافہ بھی کر لیا ہے۔ تمہید کے حصے کو ختم کر لینے کے بعد شاعر نے اصل کتاب کو ہندوستان کی تعریف سے شروع کیا ہے۔ کہتا ہے۔

تماشا ہے اِقلیمِ ہندوستان بہ خوبی ولطف انتخاب جہاں
سراپا لطافت، سراپا بہار بہارِ چمن جس پہ ہووے نثار
عجب سرزمیں ہے مسرّت فزا نہایت ہے دلچسپ اور دلکشا
جسے دیکھیے سو طرحدار ہے پری چہرہ ہے ماہ رخسار ہے

اس پس منظر میں قصہ کا بیان زیادہ واقعی اور حقیقی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے مناظر اور معاملات کی اچھی عکاسی کی ہے۔ نمونہ کے طور پر اس مثنوی کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

وہ بیٹھے ہوئے ہیر و رانجھا بہم بہت شاد تھے کچھ نہ تھا درد و غم
کبھی مسکرانا، کبھی قاہ قاہ خوشی سے زباں پر کبھی واہ واہ
ملانا کبھی لب سے لب شوق سے بہم سینہ کرنا کبھی ذوق سے

زباں پر تھی گفتار شیریں کبھی کبھی ذکرِ الفت بہ فرطِ خوشی

عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ:

''منشی تخلص، مولپہ کا رہنے والا دہلوی شاگرد نصیر دہلوی اٹھارہ سو بتیس عیسوی (48-1247ھ) میں انتقال کیا۔''5

منشی نے اپنی آخرالذکر مثنوی ''ہیر ورانجھا'' 1229ھ (1814) میں مکمل کی تھی۔ اس کے بعد وہ کافی مدت تک زندہ رہے تھے۔ قریب بہ یقین ہے کہ اس مدت میں بھی انھوں نے بعض تصنیفی کام کیے ہوں گے۔

3۔ سرور

شاہ عالم ثانی کے عہد کے معزز امرا میں تھے۔ قاسم نے ان کے تعارف میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''سرور بمعنی سردار تخلص اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سلمہ اللہ الاکبر خلف نواب اعظم الدولہ ابوالقاسم بہادر ظفر جنگ است۔ جوانیست خوش طبع کشادہ پیشانی، استفادۂ کتب متداولۂ فارسی از مرزا جان بیگ سامی دبیر فرزند علی موزوں فرمودہ۔ دیوانش چوں دیوان صاحب دولتاں بانہایت آرایش، تذکرۃ الشعرا بسیار خوب نوشتہ، دست بیعت بہ دست شاہ محمد عظیم دادہ۔''6

اس اقتباس میں یہ فقرہ کہ: ''دیوانش چوں دیوانِ صاحب دولتاں بانہایت آرایش'' خاص طور سے توجہ طلب ہے کہ اس سے اُس زمانے کی روش کا پتہ چلتا ہے۔

سرور اپنے زمانے کے معروف مثنوی نگاروں میں سے تھے۔ اُنھوں نے حسب تفصیل ذیل سات مثنویاں اردو میں مسلسل لکھی تھیں۔ حمد و نعت کے بعد ان کی کیفیت سرور نے اس طرح درج کی ہے:

''اول آں روایت یوسف و زلیخا در بحر ہزج مسدس محذوف، بدیں نمط: مفاعیلن مفاعیلن فعولن۔''

دوم حکایت لیلیٰ و مجنوں در بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف بایں طور:

مفعول مفاعلن فعولن

سوم مثنوی وامق وعذرا در بحر رمل مسدس مخبون مقطوع بایں وضع: فاعلاتن فعلاتن فعلن۔
چہارم افسانۂ فرہاد وشیریں در بحر سریع مطوی کسوف مسدس بایں منوال: مفتعلن مفتعلن فاعلن۔
پنجم حقیقتِ دیوانۂ عشق در بحر رمل مسدس مقصور بدیں ترکیب: فاعلاتن فاعلاتن فاعلات
ششم قصہ جواں سودا گر در بحر خفیف مسدس مخبون محذوف بدیں طرح: فاعلاتن مفاعلن فعلن
ہفتم واردات عشقیہ کہ در بحر متقارب مثمن مقصور است، وزنش چنیں: فعولن فعولن فعولن فعول۔"[7]

ان ساتوں کو مصنف نے یکجا مرتب کر کے اس مجموعہ کا نام "مثنوی سبعہ سیارہ" مقرر کیا تھا اور اس کے شروع میں ایک دیباچہ فارسی زبان میں لکھ کر شامل کر دیا تھا۔ اس میں ہے:

"چوں دریں ایام از تدوین طبعزاد خود و تالیف تذکرۂ ریختہ گویان فراغ حاصل شد، چناں بخاطر فاتر خطور کرد کہ اگر ہفت حکایت منظومہ در بحور مختلف بہ زبانِ ریختہ کہ خاتمۂ یکے بہ دیگرے مربوط باشد، چنانچہ اشعارے ازیں در اختتام ہر مثنوی ہویداست موزوں شوند، یادگارے باقی خواہد ماند۔"[8]

ہر مثنوی کے آخر میں ایک شعر میں اگلی مثنوی کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

اس مجموعے کے دیباچے میں شیخ ذوق کا کہا ہوا قطعہ و تاریخ بھی اس طرح درج کیا گیا ہے:

"و مادۂ تاریخ ایں قصص را شیخ محمد ابراہیم کہ ذوق تخلص دارد، فی زمانا در عرصۂ سخنوری یکہ تازاست، چنیں یافتہ۔

زطبع اعظم الدولہ حکایات بنظم آمد کہ باشد ایں چنیں کم
بجستم سالِ نظمش را، یکایک رسید آواز از ہاتف بگوشم
کہ ذوق ایں مثنوی در ہفت بحراست
بگو تاریخ ہم "دریائے اعظم"

1236ھ

اس کے علاوہ خواجہ نجف علی خاں شائق اور حسام الدین حیدر خاں کے بالترتیب چار اور دو شعر کے قطعہ تاریخ بھی شامل ہیں۔ پہلے نے "رشکِ ہفت پیکر" سے اور دوسرے نے

''رشکِ نجوم ثاقب'' سے تاریخ 1237ھ نکالی ہے۔ظاہراً ذوق نے آغاز کی اور باقی دو نے مثنوی سبعہ سیارہ کی تکمیل کی تاریخ کہی ہوگی۔ذوق کی تاریخ کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے:

> ''ایک دفعہ میر محمد خاں اعظم الدولہ نے کہ سرور تخلص کرتے تھے اور پرانے شاعر تھے ایک تذکرہ شعرائے اردو کا لکھا.....اُنھوں نے بلایا اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ ہمارا تذکرہ تمام ہوگیا۔اس کی تاریخ کہہ دو.....ان کے خطاب اور تخلص کے لحاظ سے خیال گذرا کہ ''دریائے اعظم'' دل میں حساب کیا تو عدد برابر تھے۔''[9]

آزاد نے سہواً تذکرہ کا ذکر کر دیا ورنہ دراصل یہ تاریخ مثنوی کے اس مجموعے کی ہے۔

سبعہ سیارہ کی ابتدائی تین مثنویوں کے مخطوطے علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہیں[10]۔ان کی ضخامت بالترتیب اٹھارہ، سولہ اور بارہ اوراق کی ہے اور کاتب نے ہر صفحہ پر صرف سات سطریں لکھی ہیں۔تینوں مثنویاں تسلسل کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ہر مثنوی مناجات، حمد اور نعت سے شروع ہوتی ہے۔پھر طرح طرح سے عشق کی تعریف نظم کی ہے اور اس کے بعد اصل قصہ کا بیان کیا گیا ہے۔ہر مثنوی کے بعد بحر بدل کر دوسری مثنوی کے شروع کرنے کا ذکر کیا ہے۔

مثنوی یوسف زلیخا میں ''آغاز مثنوی'' کے عنوان سے جو دعائیہ شعر کہے ہیں ان میں سے ایک دو یہ ہیں:

الٰہی کر عنایت دل میں وہ سوز — کہ ہووے نالہ میرا شعلہ افروز
رہے افروختہ سینے میں آتش — بنے تن داغِ سوزاں سے منقش
چمک رکھے یہ آہِ شعلہ افشاں — جسے ہو برقِ سوزاں دیکھ حیراں

کچھ شعر عشق کی تعریف میں کہنے کے بعد قصہ کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

رہے مجھ پر ہمیشہ سایۂ عشق — کہ برتر عرش سے ہے پایۂ عشق
حکایاتِ عجیب اس کی سُنی ہیں — روایاتِ غریب اس کی سُنی ہیں
ازاں جملہ یہ صادق ہے روایت — زلیخا اور یوسف کی حکایت
ملا گر حُسنِ یوسف کو دل افروز — زلیخا کو دیا عشقِ جگر سوز
کہوں کیا ان کے جو کچھ تھے حقائق — نہیں محتاج شرح وبسط مطلق

خوش است از بخرداں ایں نکتہ گفتن
کہ مشک وعشق را نتواں نہفتن

مول چند نشی کی طرح سرور نے بھی اپنی مثنوی میں جگہ جگہ فارسی زبان میں شعر کہے ہیں مثلاً۔

سخن دیباچۂ دیوانِ عشق است　　سخن نو بادۂ بستان عشق است

حضرت یوسف کے ایک مدت بعد تک زنداں میں رہنے کے دوران زلیخا پر جو بیتی اس کا بیان شاعر نے اس طرح کیا ہے۔

رہا زنداں میں یوسف جب کئی سال　　زلیخا کا ہوا تبدیلِ احوال
ستاتا نہایت دردِ ہجراں　　نہ بن آیا علاج اس کا نہ درماں
نہ پاس اُس کے رہا کچھ مال ودولت　　گیا برباد سب اسبابِ حشمت

یہ مثنوی ان شعروں پر ختم ہوئی ہے۔

کہا جاتا نہیں کچھ حال اُس کا　　وہی سمجھے جو ہو پامال اُس کا
بس آگے اب شروعِ داستاں ہے　　نئے انداز سے شرح وبیاں ہے

اعظم الدولہ سرور نے اپنی دوسری مثنوی لیلیٰ مجنوں کا آغاز حمد کے اس شعر سے کیا ہے۔

اے مالکِ لاشریکِ مطلق　　صانع اشیا کا تو ہے اُلحق

اور اس کا اختتام ذیل کے شعر پر کیا ہے۔

ہے وقتِ شروعِ مطلب آگے　　ہو ذہن نہ کند یارب آگے

اِس مجموعہ کی تیسری مثنوی واسق وعذرا کا پہلا شعر یہ ہے۔

اے خدائے دوجہاں بندہ نواز　　کوئی تیرا نہیں اصلا انباز

اس مثنوی کے خاتمہ میں اگلی مثنوی کی حکایت کی نشاندہی شاعر نے اس طرح کی ہے۔

ہو چکا جب کہ یہ افسانہ تمام　　میرے دل کا مجھے پہنچا اعلام
اور بھی کوئی حکایت لکھیے　　عشق بازی کی روایت لکھیے
سنتے ہی میں نے وہیں بحر بدل　　قافیوں میں نہیں کچھ جس کے خلل
مشورہ فکر سے کر بے تاخیر　　تھا جو مطلب وہ کیا یوں تحریر

یعنی فرہاد کا تھوڑا احوال ضمن اشعار میں رکھا فی الحال

کیا ہی افسانہ رنگیں ہے یہ
واقعی قصۂ شیریں ہے یہ

اس چوتھی مثنوی کے آخری اشعار اس طرح ہیں۔

ختم یہ جس وقت حکایت ہوئی شغل سے لکھنے کے فراغت ہوئی
ایک یہ افسانہ جو تھا مختصر زور طبیعت مجھے لایا اِدھر
یعنی بدل بحر کو میں نے شتاب ثبت کیا قصہ یہ با آب وتاب

اور پھر شاعر نے اپنی پانچویں مثنوی جس کا عنوان ہے ''حقیقت دیوانۂ عشق'' شروع کی۔
اس میں سے حمد وثنا کے چند متفرق شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

اے خداوند قدیر ذوالجلال لکھ سکوں حمد وثنا میں کیا مجال
بات کل کی کیا کہے جزو ضعیف کیونکہ ادنیٰ ہووے اعلیٰ کا حریف
بیت جو مشہور ہے وہ کیجیے عرض عجز ہے بندے کو واجب بلکہ فرض
مغفرت دارم امید از لطف تو زانکہ خود فرمودۂ لاتقنطوا

اور۔

نام جس کا ہے جناب مصطفےٰؐ بادشاہ کشور صدق وصفا
ہے وہی ایجاد عالم کا سبب سرور عالی حسب والا نسب
عرض یہ ہے یا حبیب کردگار میں ہوں تیرے لطف کا امیدوار
اے مطیع حکم خلاق ودود پہنچیو تجھ پر تحیات و درود
آل اور اصحاب پر تیرے سدا بھیجتا ہوں میں سلام اے مقتدا

اس میں چند شعر ساقی کو خطاب کر کے بھی کہے ہیں مثلاً

ہے کہاں تو ساقی بیدرد آ مجھ کو وہ جام سے خوشبو پلا
نکہت گل رشک سے جس کے ہے داغ اس کے پینے سے معطر ہے دماغ
الغرض اس مے سے ساغر دم بہ دم دے مجھے، زائل ہو میرے دل سے غم

تاکروں موزوں بیانِ عشق میں یعنی لکھوں داستانِ عشق میں
وقت پر کیا شعر یاد آیا ہے یہ عارفِ کامل نے فرمایا ہے یہ

کفر کافر را ودیں دیندار را
ذرۂ دُردے دلِ عطار را

اور پھر قصہ کی ابتدا اِس طرح کی ہے۔

یاد ہے مجھ کو کہ لکھا ہے کہیں شیخ شبلی مرجعِ اربابِ دیں
ایک دن بغداد میں وہ باصفا آن نکلا جانبِ دارالشفا
اتفاقاً واں ہوا اُس کا گذر اک جوانِ نازنین آیا نظر
کہتے ہیں دیوانۂ عشق اس کو سب بلکہ ٹھہرا ہے یہی اُس کا لقب
حضرت شبلی نے ایسا دیکھ حال پاس جاکر یہ کیا اس سے سوال
کون ہے تو کیا یہ تیرا حال ہے کس کے غم نے یوں کیا پامال ہے
سن چکا اس قصے کو جب وہ غمیں عرض کی اے سالکِ راہِ یقیں
کوچۂ نجاج جو مشہور ہے پاس ہے، یاں سے نہیں کچھ دور ہے
چار گھر کے بعد جو ہے پنجمیں اس میں رہتی ایک ہے زہرہ جبیں
میری جانب سے یہی ہے التماس یہ رباعی پڑھیے بے خوف وہراس

رباعی

درعشق تو ام طاقتِ تنہائی نیست وز ہجر تحمل وشکیبائی نیست
تاوسع و تواں بود تحمل کردم اکنوں چہ کنم تاب وتوانائی نیست

کہہ چکا جب وہ بصد عجز ونیاز بس وہیں راہی ہوا یہ چارہ ساز
بعد اس کے وہ رباعی دی سنا سن کے اس کو اس نے اپنا سر دُھنا
پھر کہا رو رو بصد عجز ونیاز میری جانب سے سن اے بندہ نواز
کہیو اس دلدادۂ جاں باز کو یعنی میرے ہمدم وہمراز کو

رباعی

درعشق کسے راکہ توانائی نیست　　وز ہجر تحمل وشکیبائی نیست
مرگ ست علاج اوکہ ازمرگ بروں　　ہر مصلحتے دگر کہ فرمائی نیست

سن کے یہ واں سے ہوا وہ رہ نورد　　ساتھ لے کر اشک گرم و آہ سرد
کر ادا واں کا جواب مختصر　　پھر رباعی کو سنایا سر بہ سر
اس رباعی کا سنا مضمون جب　　مرگیا اک آن میں وہ جاں بلب
شیخ شبلی یہ تماشا دیکھ کر　　پھر لگے فرمانے یوں باچشم تر
عشق نے گرچہ بنایا حال یہ　　پر ہوا ایذا سے فارغ البال یہ
بیقرار ومضطر وگریہ کناں　　وہ صنم رہتی تھی جس جا آے واں
پہنچے دروازے پہ دیکھا حال اور　　اس جگہ بھی یعنی ہے ماتم کا طور
ایک تربت میں دھرالا کر بہم　　عاشق و معشوق با چشم نم

اس قصے کے خاتمے کے شعر یہ ہیں۔

یہ تو قصہ ختم سرور اب ہوا　　مدعا جو تھا وہ حاصل سب ہوا
پرارادے میں ہے ٹھہرا آن کر　　اور کچھ لکھیے بہ آئین دگر
دے تغیر بحر کو میں نے شتاب　　مثنوی تحریر کی با آب وتاب

آگے اس سے ہے اسی کا اب بیاں
ہے سراسر عشق کی وہ داستان

چھٹی مثنوی میں ایک جوان سوداگر کے کسی حسینہ کے ساتھ عشق کا قصہ نظم کیا ہے۔ سوداگر خواب میں دیکھتا ہے کہ لوگ اُس حسینہ کو اس عشق کے سبب رونما ہونے والے ہنگاموں کی وجہ سے قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ حاکم شہر کے پاس جا کر اسے اپنے عشق کا یقین دلاتا ہے۔ حاکم شہر حسینہ کے گھر والوں کو رضامند کر کے دونوں کی شادی کرا دیتا ہے۔

ساتویں مثنوی میں مصنف خود اپنے عشق کا حال اور اپنی محبوبہ کا سراپا بیان کر کے کہتے ہیں کہ جس طرح دوسرے عاشق کچھ مدت بعد مل گئے ہیں خدا ان دونوں کو بھی ملا دے گا۔ اس مثنوی

کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

اسی طرح اب خدائے جہاں　　وہ دلدار مجھ پر بھی ہو مہرباں
کبھو جانِ غمناک بھی شاد ہو　　ہوا دل جو ویراں ہے، آباد ہو
یہ سرور جو ہے ہجر سے بیقرار　　رہے اپنے دلدار سے ہمکنار
بس آگے سن اے کلکِ جادونگار　　حکایت نویسی نہ کر اختیار
اب افسانے ساتوں ہوئے اختتام　　کیا چاہیے قصہ خوانی تمام
کہ اصلا نہیں انتہا عشق کی
بیاں کیجیے تعریف کیا عشق کی

یہ ساتوں مثنویاں زبان، بیان کی خوبیوں اور واقعات وجذبات کی پیشکش کے اعتبار سے کامیاب ہیں۔

اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کا زمانہ بھی پایا تھا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ نے ان کے وفات کی تاریخ اس طرح کہی ہے۔

نواب　محمد　میر خاں　بہادر　　کہ درماہِ صفر فوت شدند
1260ھ (1844)

یقین کیا جانا چاہیے کہ اِس طویل مدّت میں اُنھوں نے مزید مثنویاں بھی لکھی ہوں گی اور اپنے معیار کے لحاظ سے وہ اور بھی بہتر ہوں گی۔

4۔ذوق

شیخ محمد ابراہیم ذوق کی شاعری کا دامن صنفِ مثنوی کے نمونوں سے بھی یکسر خالی نہیں ہے۔ اُن کے دیوان کے مقدمہ میں مولانا محمد حسین آزاد نے ضمناً ذوق کے ایک مثنوی لکھنے کا ذکر کیا ہے، اِس طرح:

"(استاد ذوق) کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ (بہادر شاہ ثانی) عالمِ ولی عہدی میں تھے تو مرزا سلیم (ابن اکبر شاہ ثانی) کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی تھی۔ اس کی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ یہ جائز نہیں۔ میر نجات کی گل کشتی ہم نے دیکھی ہوئی تھی مگر حکیم مرزا محمد صاحب رحمہم اللہ زندہ تھے

اور میرے والد مرحوم انھیں کا علاج کرتے تھے۔ وسعت معلومات اور حصول تحقیقات کی نظر سے ہم نے ان سے جا کر پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ رواج اتفاقی ہے جو مثنوی انھیں آٹھ بحروں میں منحصر ہوگئی ہے ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے جو روکے۔ جس بحر میں چاہو لکھو۔ استاد کے مسودوں میں ایک پرچہ پر چند شعر اس کے نکلے تھے ان میں ساقی کا مضمون تھا۔ دو شعر اب تک یاد ہیں۔12

ٹھلیاں تو نہ تھیں وہ مے عشرت کے سبو تھے یا قلزمِ مستی کے حباب لب جو تھے
لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ ان کے گلو میں ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں

لیکن محض ان دو شعروں کی روشنی میں شیخ ذوق کی مثنوی نویسی کے بارے میں کوئی حکم لگانا مناسب نہیں ہے۔

شیخ ذوق کے دیوان میں مثنوی کے ان دو شعروں کے علاوہ ایک مثنوی ''نامۂ جاں سوز'' بھی موجود ہے۔ اس کا حال اپنے موقع پر لکھا جائے گا۔

5۔ غالب

مولانا الطاف حسین حالی نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے حالات میں لکھا ہے کہ:

''انھوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔''13

اس بیان کے حاشیے پر انھوں نے ایک مثنوی کا بھی ذکر کیا ہے جو بقول شخصے غالب نے پتنگ بازی سے متعلق لکھی تھی اور اُس وقت اُن کی عمر ''آٹھ نو برس کی تھی۔'' ایک جدید بہ زعم خود ماہرِ غالبیات نے حالی کے قول کی تصحیح کر کے اسے ''دس سال'' بنا دیا ہے اور غالب سے گیارہ شعر کی ایک مثنوی منسوب کر کے ان کے دیوان میں شامل کر دی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مثنوی مختلف ماخذ میں لفظوں کے کچھ کچھ فرق کے ساتھ نقل کی جاتی رہی ہے، جب تک متن کی کسی قابل اعتماد ذریعہ سے تصدیق نہ ہو جائے محض اس مثنوی کی بنیاد پر کوئی قطعی بات کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔

6۔ مومن

حکیم محمد مومن خاں مومن نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں سب سے زیادہ اور سب

سے بہتر مثنویاں لکھی ہیں۔ان کی شاید ایک مثنوی بھی ایسی نہیں ہے جو حقیقت پر مبنی نہ ہو۔شیفتہ کے تذکرے میں ان کی ایک مثنوی کا ذکر اس طرح آیا ہے:

''صاحب تخلص، نامش امتہ الفاطمہ بیگم مشہور بہ صاحب جی.....آفتاب صفت از مشرق بہ جانب مغرب آمدہ، بہ تقریب مدارا با مومن خاں کارش افتاد۔ ما ہے چند کار با در دو دو ابود۔ سالہا است کے باز بہ لکھنؤ رفت۔ مثنوی قول غمیں نام کہ از مصنفات خان معزی الیہ است شرح نسخہ حسن و جمال ہماں موزوں قد است۔''14

بات اسی ایک مثنوی تک محدود نہیں ہے۔ان کی بیشتر مثنویاں ان کی حیاتِ معاشقہ کی منظوم تصویریں ہیں۔ان میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں کم وبیش سب اُن کی آپ بیتی کے اجزا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں جس محبوب کا ذکر آیا ہے وہ جنسِ اناث سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ ان کے کلیات میں بار بار لفظ ''پردہ نشیں'' آیا ہے اور اس کے ساتھ جن معاملات کی عکاسی کی گئی ہے وہ بھی اسے دوسری جنس سے متعلق ظاہر نہیں کرتے ہیں۔مومن کی مثنویوں میں کوئی باضابطہ مرتب اور منضبط پلاٹ بھی نہیں معلوم ہوتا ہے۔واقعات جب اور جس طور پر ظہور میں آتے رہے شاعر نے ان کو اُسی صورت میں نظم کر دیا ہے۔

(1) مومن کی پہلی مثنوی ''شکایتِ ستم'' ہے جس کا سالِ تصنیف 1231ھ 1816ء ہے۔ اور نام اس کا تاریخی ہے۔اس کے آخر میں شاعر نے کہا ہے۔

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن ہے ابھی سترہ برس کا سن

کلیاتِ مومن کے دیباچے میں شیفتہ نے مومن کی عمر کا حساب اس طور پر بیان کیا ہے:

''بدزمانہ کہ تہذیب ایں دلفریب بستان اتفاق افتاد، از ہجرت ہزار و دو صد و چہل و سہ سال (28-1827) برفق ہلال گذشتہ بود۔ سنین عمرش کہ چوں از عمر خضر از حدِ شمار برکراں بادیہ بست و یک رسیدہ۔ از بس کہ ایں دیوان بے نظیر است، تاریخش دیوان بے نظیر است۔''
1243ھ

اس سے ظاہر ہے کہ 1243ھ میں اُن کی عمر انتیس کو پہنچ گئی تھی، یعنی ابھی صرف اٹھائیس برس پورے ہوئے تھے، اِس حساب سے مومن کا سالِ ولادت 1215ھ ہوا اور یہی آبِ حیات

وغیرہ ماخذ میں بھی تحریر ہے، اور اِس اعتبار سے مثنوی شکایتِ ستم کی تکمیل کے وقت مومن ستر ہویں برس میں پہنچ گئے تھے۔ پروفیسر گیان چند جین نے مومن کے سال ولادت کی جو تصحیح کی ہے وہ دراصل ان کے حساب کی غلطی ہے 15۔ انھوں نے مومن کے مصرعے کو بھی سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ مومن نے یہ نہیں کہا ہے کہ میری عمر سترہ برس کی ہو چکی تھی (یعنی اٹھارہواں سال شروع ہو گیا) ان کے لفظوں سے صرف یہی مطلب نکلتا ہے کہ 1231ھ میں ان کی عمر کا سترہواں سال جاری تھا۔

اِس مثنوی کے شروع میں شاعر نے عشق بازی اختیار کرنے کا بیان اس طرح کیا ہے۔

ہائے بچپن میں دل کا آجانا کچھ سمجھتے نہ تھے یہ کیا جانا
شوق آیا تو دل نیازی کا کھیل کھیلے تو عشق بازی کا
شغل طفلاں نہ دل کے پاس گئے ہوش کے آتے ہی حواس گئے

کسی شادی میں ان کی اِس محبوبہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس وقت کی کیفیت اُنھوں نے اس شعر میں بیان کی ہے۔

وہ نگاہِ ہراس آلودہ حرفِ امید یاس آلودہ

اس کے بعد ایک مدّت فراق میں گذری۔ دونوں فراق کے صدموں سے بیمار ہو گئے۔ ایک دن ہوش آیا تو دیکھا کہ اپنا سر کسی مہ جبیں کے زانو پر ہے۔ دونوں کھل کھیلے۔ کوئی ایک برس تک وصال کے مزے لوٹے۔ گھر والوں کو خبر ہوئی تو خوب ڈانٹ پڑی۔ اس موقع کے دو شعر یہ ہیں۔

وہاں سے ناچار آئے ہم گھر میں پاؤں رکھتے دہانِ اژدر میں
نغمہ دیپک کا، تھی صدائے قدم ہوئی آگ آتے ہی صدائے قدم

گھر والوں نے اس موقع پر جو کہا تھا یہ ہے۔

ہم کو بدنام کر دیا تونے اے زبوں کار کیا کیا تونے
کہیں کس منہ سے جائیں گے اب ہم ہائے کیا منہ دکھائیں گے اب ہم
تجھ سے بے ننگ و نام کو کیا عیب دل لگا کر ہمیں لگا یا عیب
کیوں نہ آنکھیں لڑاتے آئی حیا تیری آنکھوں سے یہ لحاظ گیا

ہم۔سمجھتے تھے اب تلک معصوم یہ سیہ کاریاں نہ تھیں معلوم

اُس محبوبہ (عورت) کو بھی اپنی رسوائی سے شدید رنج ہوا۔اس کی باتیں شاعر نے اس طرح نظم کی ہیں۔

کہ ترے واسطے میں خوار ہوئی بے حجابی سے شرمسار ہوئی
کیسی رسوائیاں ہوئیں ہے ہے محشر آرائیاں ہوئیں ہے ہے
کاوش اقربا کی دل شکنی حلقۂ دشمناں کی نیش زنی
سگ گزیدہ کی طرح ہوں مضطر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے گھر
بھوک بھی گر لگے تو کھاجاؤں تشنگی ہو تو اشک پی جاؤں

آخر طے یہ پایا کہ آدھی رات کو اسی مہ جبیں کے گھر پر ملا کریں اور یہ سلسلہ بھی بہت دن تک جاری رہا۔

ایک موقع پر ایک بڑھیا نے ڈانٹا۔اس وقت کے اندیشوں کا بیان ذیل کے شعروں میں کیا گیا ہے۔

گھر میں آیا پہ خوف سے جی جائے فتنہ اٹھنے سے جان بیٹھی جائے
اٹھ گیا رنگِ رو برنگِ شفق ہوگیا جوں سحر مرا منہ فق
منتظر اب قیامت آتی ہے تیرہ روزوں کی شامت آتی ہے
رازِ شب آشکارا ہوتا ہے شور محشر دوبارہ ہوتا ہے

خیریت گذری کہ بڑھیا نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ایک دن اُس مہ جبیں نے ایک بڑھیا بھیج کر انھیں بلایا۔اس وقت یہ دیوان خانہ بند کر کے شعر کہنے میں مصروف تھے۔بدگماں نے جا کر کہہ دیا کہ وہ دیوان خانہ میں کسی حسینہ کے ساتھ بند ہیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ محبوبہ نے ان کا منہ کبھی نہ دیکھنے کا فیصلہ کرلیا۔اس طرح یہ مثنوی ختم ہوگئی۔

(2) قصۂ غم مومن کی دوسری مثنوی ہے جس کا سال تصنیف 1235ھ (1819-20ء) ہے۔شکایتِ ستم کی طرح اس مثنوی کا نام بھی تاریخی ہے۔یہ دراصل ایک فراق زدہ نوجوان کی کہانی ہے جو خیالوں خیالوں میں اپنے محبوب کی بے اعتنائی کی شکایت کر رہا ہے۔اس محبوب کا جس طبقہ سے تعلق ہے اس کی طرف ذیل کے شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

کہتا میں اگر کہ جھوٹ ہے سب تم لوگ کسی کے ہوتے ہو کب

شاعر نے اِس محبوب کے ساتھ اپنے معاملات کا بیان اس طور پر کیا ہے۔

وہ سینہ پہ لیٹ کے ستانا مطلب کے سخن پہ روٹھ جانا
وہ منھ میں زباں کی لذتیں ہائے ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ جی چاہا کچھ اس سے بھی زیادہ
پھر کیا ہی ادا سے کج ادائی کس ناز سے کرنی ہاتھا پائی
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوشِ انکار وا کرنے نہ دینا بندِ شلوار
ہر جائے کی چٹکیاں وہ لینیں آزردہ ہوگا لیاں وہ دینیں

اِسی قسم کے مضامین کے بعد اور آگے چل کر کہتے ہیں۔

میلاں جو ہوا معاشرت کا دھیان آہی گیا مباشرت کا
بس خواہشِ دل سے رہ نہ سکنا اور پاسِ حیا سے کہہ نہ سکنا
پر کیا ہی شرارتوں سے کہنا پردے میں اشارتوں سے کہنا

کوئی بیس برس کی عمر میں مومن نے یہ مثنوی لکھی تھی۔ یہ نوجوانی اور نومشقی کا کلام ہے۔ اس میں بیانِ جذبات میں کہیں کہیں اگر کھل گئے ہیں تو اسے عمر کا تقاضا سمجھنا چاہیے۔ اس مثنوی میں مجنوں کی قبیل کے عاشق کا جو سراپا بیان کیا ہے وہ لائق توجہ ہے اور اسے نوعمر مومن کا ایک اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ کسی کا یہ اعتراض کہ مصائب زدہ اور صحرانشیں عاشق نے بندِ شلوار کا کیوں کر خیال کیا ہوگا، بہت عجیب ہے۔ خیالات کی رَو پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی ہے۔

(3) قولِ غمیں مومن کی تیسری مثنوی ہے اور اس کا نام بھی تاریخی ہے یعنی یہ 1236ھ (21-1820) میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں تین معاشقوں کا حال نظم کیا گیا ہے۔ مثنوی کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

"ساقیا زہر پلادے مجھ کو شربتِ مرگ چکھا دے مجھ کو

اِس تمہید کے بعد کسی بات پر محبوبۂ اوّل سے بگاڑ ہو جانے کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے بعد کچھ دن تک رنج وملال کی صورت رہی۔ پھر محبوبۂ دوم سے شناسائی ہوئی اور اس کے ساتھ

ملاقاتوں کا ڈھب نکل آیا اور پھر۔

ایک چندے یہی اوقات رہی　　روز پہروں کی ملاقات رہی
واں ہر اک طرح بہلتا تھا دل　　کہ ہوئی اُس میں بلا اک نازل
کہیں باہر سے کوئی واں آیا　　میرے بیٹھتے ہی وہ مہماں آیا
سنتے ہی اور کے آنے کی خبر　　پردے کے واسطے آیا باہر

دوسرے دن وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مہمان عزیز علیل ہے اور صاحب خانہ نے ان سے علاج کی درخواست کی ہے۔

صاحب خانہ نے بعد اکرام　　بیقرارانہ کیا مجھ سے کلام
کہ یہاں عید و محرم ہے بہم　　کل سے کیا کیا طرب و غم ہے بہم
یعنی وارد ہے وہ مہمانِ عزیز　　جس کے قربان مری جان عزیز
ایک بیمار پریشاں احوال　　نہ وہ جلوہ، نہ وہ رونق، نہ جمال
آپ کچھ چارہ گری کیجیے غرض　　نبض دیکھو کہ ہو تشخیص مرض

اس موقع سے متعلق پروفیسر گیان چند جین نے لکھا ہے کہ

"یہ مثنوی بائیس سال کی عمر میں تصنیف کی۔ حیرت ہے کہ اتنے کم عمر طبیب کو علاج کے لیے کیسے بلایا گیا۔ گلشنِ بے خار کے جواب میں مرزا قطب الدین باطن نے تذکرہ گلستان بے خزاں عرف نغمۂ عندلیب لکھا۔ مشہور ہے کہ یہ تذکرہ مولانا امام بخش صہبائی کی تصنیف ہے۔ اس تذکرے میں صاحب جی کے احوال میں بڑی جلی کٹی سنائی ہیں۔"16

مومن اس وقت اکیسویں برس میں تھے۔ بائیس سال کہنا حساب کی غلطی کی وجہ سے ہے۔ کم عمر طبیب کی بھی تشخیص اچھی ہو سکتی ہے، اِس لیے اس کے بُلائے جانے پر تعجب کرنا بجائے خود عجیب بات ہے۔ اور پھر یہاں اس طبیب کو بلایا نہیں گیا تھا بلکہ اشعار بالا سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے معمول کے مطابق وہاں پہنچا تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ یہ مریض بھی وہاں موجود تھا اور صاحب خانہ نے اس طبیب سے اس مریض کے علاج کی درخواست کی۔ تذکرہ گلستاں بے خزاں کو کسی

نے بھی صہبائی سے منسوب نہیں کیا ہے۔ یہ ''مشہور بات'' پروفیسر گیان چند کی تحقیق (من گڑھت) ہے۔ صاحب خانہ کے کہنے سے اس طبیب نے مریض کی نبض دیکھی۔ اس موقع کے اشعار یہ ہیں۔

میں نے اُس نبض پہ جو ہاتھ دھرا ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا
آفتِ تازہ جو جاں پر آئی یہ غزل اپنی زباں پر آئی

کیا لگا دستِ دلآ رام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

غرض عشق کا یہ ایک اور نیا سلسلہ شروع ہوا۔ کیفیت اس کی یہ تھی کہ ۔

سارے دن تو رہے ہم صحبت یار جب ہوئی شام تو اٹھے ناچار
اس کے کوچے سے نہ اٹھتا تھا قدم بیٹھے جاتے تھے ہر اک گام پہ ہم
واں سے آنے کی کہاں طاقت تھی کیا کہوں آہ عجب حالت تھی
دل میں جب ہوک اٹھی بیٹھ گیا پاؤں اٹھا بھی تو جی بیٹھ گیا

ایک مدّت تک عشق کے معاملے اسی طور پر جاری رہے اور پھر۔

بعد چندے فلکِ ناہنجار بدچلن، بدروش وکج رفتار
جمع احباب پریشاں گرداں گردش افزائے بیاباں گرداں
دیکھ واں روز کا جانا میرا بیٹھنا، ہنسنا ہنسانا میرا
راہ بیداد کی لی ظالم نے چھوڑدی راست روی ظالم نے
سر پہ ایک آفتِ تازہ لایا بدسلوکی سے مرے پیش آیا

اور اس نے آخر وہ دن بھی دکھایا جس سے دل ڈرتا تھا..... ع یعنی واں کوچ کی اُن کے ٹھہری

یہ خبر سن کر عاشق کے دل پر جو گذر گئی اس کا بیان شاعر نے بڑے پُر درد انداز سے کیا ہے چند متفرق اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

جس گھڑی ہم تلک آئی یہ خبر چھاگئی بے خبری سی دل پر
اک غلو ہوش پہ بیہوشی کا عالم اک اپنی فراموشی کا

خود فراموشی وغفلت کوشی　　بے خودی، بے خبری، بیہوشی
اس میں پیغامبر آیا واں سے　　ترجماں لعلِ لبِ جاناں سے
جی میں آجائے تو آجا یہاں　　آن کر شکل دکھا جاؤ یہاں
اور اِس وقت بھی گر آپ نہ آئے　　ہم کہاں، اور کہاں تم پھر آئے
سن کے یہ بات میں باحالِ تباہ　　بے خودانہ ہوا اس کے ہمراہ

اس موقع کی ملاقات کا انداز بھی اور ہی تھا۔

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی　　کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی
مل کے حسرت زدگانِ بے کس　　دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تابِ کلام　　پر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو　　مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اوروں سے لگالیجو جی　　نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
ہاں اگر فکر ہو تو ہم کو ہو　　رنج واندوہ ہو جو ہم کو ہو
کہ بُری آہ ہماری خو ہے　　ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے
کام دل رنج وبلا کو سونپا　　تم کو لو ہم نے خدا کو سونپا
کہہ کے یہ اٹھ گئی جی کھوتی ہوئی　　ہچکیاں لیتی ہوئی، روتی ہوئی
ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے　　بادلِ مضطرب و مضطر آئے

باطن نے صاحب کو ''ایک عورت خانگی یا فاحشہ'' بتایا ہے لیکن مومن کے شعروں سے ایسا معلوم نہیں ہوتا ہے۔ مومن نے اپنی اِس مثنوی کو ان شعروں پر ختم کیا ہے۔

دن مسرت میں گذرتے ہوں گے　　یاد بھی ہم کو نہ کرتے ہوں گے
رات کو اور بھی عشرت ہوگی　　غیر سے گرمیِ صحبت ہوگی

یہ مومن کی بہترین مثنوی ہے۔ مختلف واقعات اور معاملات کی اس میں بہت اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ دوسری مثنویوں کی طرح مومن کی اس مثنوی کو بھی اسی روشنی میں پڑھنا اور پرکھنا چاہیے جس میں یہ لکھی گئی تھی۔

(4) مومن کی چوتھی مثنوی "قلقِ آتشیں" ہے اس کا نام بھی تاریخی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ 1242ھ (1826-27) میں مکمل ہوئی تھی۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں اسی سال کا لکھا ہوا اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے[17]۔ مثنوی اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

کھولیو ساقی منہ کو سبو کے پیتے ہیں کب سے گھونٹ لہو کے

اس تمہید کے بعد شاعر نے ہجر نصیب عاشق کی بدحالی کا احوال خاصی تفصیل کے ساتھ نظم کیا ہے۔

ترتے ہے سینہ بات کیے سے درد اٹھے ہے سانس لیے سے
سبز گلستاں خار لگے ہے موجِ رواں تلوار لگے ہے

اس مثنوی کا قصہ بہت مختصر ہے۔ گھر میں کسی شادی کے سلسلے میں آئی ہوئی ایک حسینہ کو دیکھ کر اس پر دل آ گیا اُدھر اس کا بھی حال یہ تھا کہ کبھی کبھی بات کر لیتی تھی۔ چلتے وقت وہ مل کر رونے لگی۔ اس نے اپنے گھر کی پابندیوں کا حال بھی موثر انداز سے بیان کیا۔

قید کہوں کیا میں اپنے گھر کی کانپتی جاوے باد سحر کی
دھیان نہ آنے پاوے کسی کا ذکر نہ ہرگز آوے کسی کا
بادِ صبا پیغام نہ لاوے مرغِ سلیماں اُڑنے نہ پاوے
ضعف سے غش بھی ہونے نہ پاؤں طاقت کیا جو آپ سے آؤں
سب کی نیند اس فکر میں جاوے خواب میں بھی تا کوئی نہ آوے

غرض وہ رخصت ہو کر چلی گئی۔ کچھ مدت بعد عاشق نے اس کے پاس پیغام بھیجا۔ اس کے جواب میں اس نے صاف کہلا دیا کہ کوئی اور راستہ دیکھو، اور۔

مرتے ہیں تو مرجائیں بلا سے چاہتی ہوں میں یہ تو خدا سے

اس جواب سے بہت مایوسی ہوئی۔ شاعر نے ایک حکایت معشوقوں کی بے وفائی اور بے رحمی سے متعلق لکھ کر اس مثنوی کو ختم کر دیا ہے۔ علی گڑھ کے نسخے کا آخری شعر یہ ہے۔

حرفِ قلق نے سخت ستایا تیری طپش نے سب کو لٹایا

(5) پانچویں مثنوی "حنینِ مغموم" ہے۔ اس کے نام سے تصنیف کا سال 1244ھ (1828-29) معلوم ہوتا ہے۔ اس کے قصہ کو "مثنوی تفِ آتشیں" کا گویا تکملہ کہا جا سکتا ہے۔

شروع میں اپنی خستہ حالی کا بیان کرتے ہوئے حکیم مومن خاں مومن کہتے ہیں ۔

سوچتے شاگرد ہیں سالِ وفات مرثیہ کی فکر ہے شیون کے ساتھ

قصہ شروع کرنے سے پہلے شاعر نے عاشقی کے احوال میں یہ اشعار بھی کہے ہیں ۔

ایسے عاشق سے حذر بے فائدہ پاسِ عصمت اِس قدر بے فائدہ
کیا ہے آخر فتویِ اہلِ جمال گر نہیں معشوق عاشق پر حلال
مفتیانِ عشق لکھتے ہیں تمام بوالہوس شوہر بھی ہو تو ہے حرام
ہیں براہین و دلائل بے جواب لیکن اس سے کہہ سکے یہ کس کی تاب

یہاں عشق سے مراد عیاشی ہے اور عیاشی کے لیے لازم ہے کہ تمام اخلاقی اور مذہبی ضابطوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ مذکورہ شعروں میں مومن نے جو کچھ کہا ہے اس کا حال بھی وہی ہے اور ظاہر ہے کہ نہایت مذموم اور قبیح ہے۔

ثمنِ آتشیں میں انکاری جواب پا کر عاشق کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اس کے ایک مدت بعد ایک بڑھیا نے اس مہ جبیں کا پیغام پہنچایا کہ موقع ملنے پر ملاقات کروں گی لیکن یہاں بھی نفرت کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ شاعر نے اس نفرت کے لیے جواز پیدا کر لیا اور کہا کہ ۔

وجہِ نفرت یہ کہ وہ آتش عذار دور ہی سے خوشنما تھی جوں شرار
پاس سے دیکھا تو بس دیکھا نہ جائے ہر نگاہِ منفعل آنکھیں چرائے

اس کے بعد اُنھوں نے اس کی بدصورتی کا بیان پورے مبالغے کے ساتھ کیا ہے۔ کہتے ہیں

ع کیا بلائے جان وہ شکلِ مہیب

اور نتیجہ کے طور پر بات بننے کے بجائے بگڑ جاتی ہے۔ عاشق کسی اور محبوب کی طرف رجوع کرتا ہے لیکن پہلی ''مہ جبیں'' اُس محبوب کو بھڑکا دیتی ہے اور اس طرح یہاں بھی عاشق کو مایوسی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔

(6) اس سلسلے کی مومن کی چھٹی اور آخری مثنوی ''آہ و زاری مظلوم'' ہے یہ نام بھی تاریخی ہے اور اس سے سال تصنیف 1247ھ (32-1831) معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شاعر نے کسی محبوبِ غائب سے گفتگو کو نظم کیا ہے اور آخر میں ایک مختصر سی حکایت سنا کر مثنوی کو ختم کر دیا ہے۔

اس قصہ میں محبوبہ اپنے مرے ہوئے عاشق کی قبر پر جاتی ہے تو وہ قبر کھل جاتی ہے اور وہ لاش سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔

مومن کی مثنویوں پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ ان میں عریانیت ہے اور اخلاقی نقطۂ نظر سے وہ گری ہوئی ہیں لیکن ع: این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

عریانی بلکہ فحاشی نظم و نثر کی دوسری مختلف اصناف میں بھی دیکھی جا سکتی ہے بلکہ جدید دور کے بعض ناول اور افسانہ لکھنے والوں نے تو اس کے لیے خاصا نام پیدا کیا ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مومن نے مثنوی کی صنف کا ایک نیا مصرف نکالا اور من گڑھت، خیالی قصوں کے بجائے اسے انسانی زندگی میں رونما ہونے والے اچھے برے واقعات کے بیان کا ذریعہ بنا دیا۔ مومن نے ایک شخص کے تجربات کو نظم کر کے جو راہ دکھائی تھی اسی پر چل کر بعد کے زمانے میں قوموں کے نشیب و فراز کی داستانیں بھی سنائی گئیں۔ مومن کی مثنویوں میں انسانی زندگی میں پیش آنے والی بعض مخصوص حالتوں کا بیان پہلی مرتبہ کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے بھی ان کی مثنویاں قابلِ قدر ہیں۔

عشقیہ مضامین کے علاوہ مومن نے نشاط و غم، خوشی اور ماتم کے مواقع کی عکاسی کے لیے بھی مثنوی کی ہیئت کا استعمال کیا ہے۔ ان کے دیوان میں ایک طویل قطعہ ذیل کے عنوان سے مندرج ہے۔

"شور انگیزیِ قلمِ سینہ چاک اشک فشاں در ماتمِ حکیم غلام نبی خاں"

جہانِ نکوئی بہ کوئے جہاں — وحیدِ زماں والدِ مہرباں
یہاں تک اُنھیں شوقِ خلدِ بریں — کہ ہر دم کو گنتے دمِ واپسیں
نہ دل میں، نہ اُن کی زباں پر کبھو — رضائے الٰہی سوا آرزو
غرض آ گیا وقتِ موعود جب — گئی تن سے وہ جانِ عشرت طلب
تاسّف نے کیا کیا ستایا مجھے — قلق نے زمیں پر لٹایا مجھے
غضب جان کو بیقراری ہوئی — بری حالت ایسی ہماری ہوئی
کہ دُکھتا دلِ عشرت آلودِ مرگ — ہوئی زندگی اپنی محسودِ مرگ
جہاں سے جب ایسا شفیق اٹھ گیا — تو جینے کا سچ ہے مزا کیا رہا
کہوں کیا کسی سے کہ کیا غم ہوا — سزاوارِ اشفاقِ ماتم ہوا

ولے شعر کی جوہوس ہے کمال　　اسی غم میں تاریخ کا تھا خیال
جنازہ اٹھا یا فرشتوں نے آ　　تو قَد فازَ فَوزاً عَظیماً کہا

66　　-　　1307

1241 ھ (1826-27=)

کلیاتِ مومن میں ایک دوسرا قطعہ اسی ہیئت میں درج ذیل عنوان سے ہے:

''عقد عبارت و معانی با اظہار سال نکاح یار جانی''۔

کہاں تک تغافل بس اے بے خبر　　خبر بھی ہے کچھ ساقی بے خبر
شرابِ تمنا پلا آج تو　　ہو سہاے مُردہ جلا آج تو
مے رشک آوازِ خُم دے مجھے　　سُبو کے سُبو خُم کے خُم دے مجھے
علاج دل سر بسر جوش کر　　مے وصل سے بھی مجھ کو مدہوش کر
کہاں تک سیہ مستی اشک خوں　　کبھی تو پیوں بادۂ لالہ گوں

اس قسم کے تمہید کے کئی شعر کہنے کے بعد اصل واقعہ کی تفصیل شاعر نے اس طرح نظم کی ہے۔

ہے اقبال جس کا جہاں پر محیط　　سعادت زمین وزماں پر محیط
وہ خانِ فلک رتبہ عباس نام　　مجل جس کے جلوے سے ماہ تمام
نہ کیونکر ہو مہ اس کے جلوے سے داغ　　ہے کس مہر تاباں کا چشم وچراغ
وہ عبدالعلی خان گردوں مکاں　　جھکے جس کے آگے سرِ آسماں
خلیق وشفیق وسراپا وقار　　زمانے کو جس سے ہے سوافتخار
طبیعت میں اس کی کرم سا کرم　　سراپا مروّت سراپا کرم
محبت فزائے دل ریش ریش　　کرم گستر مومن مہر کیش

اس طور پر ''یار جانی'' کی ستائش کے بعد کئی شعروں میں اس جشن کی رونقوں کا بیان کیا ہے۔ ایک شعر یہ ہے۔

ہوا جشن کیا کیا نہ سامان سے　　گئے لے کے کس شوکت وشان سے

اور آخر میں واقعہ کی تاریخ اس طرح کہی ہے۔

کیا میں نے تاریخ کا جو خیال — یہ شعر آسماں پر پڑھا حسب حال

وصالِ دو مہ طالع و مہر اثر — قرانِ دو نجم سعادت ہنر

1244ھ — 1244ھ (=) 1828-29

غور کریں تو یہ دونوں قطعے زبان بیان اور ترتیب مضامین وغیرہ کے اعتبار سے بالکل مثنوی معلوم ہوتے ہیں۔

کلیاتِ مومن میں دو تین مثنویاں اور بھی ہیں۔ ان سب کا اگر بغور مطالعہ اور تجزیہ کریں تو بلاشبہ مومن کو اردو کے بہترین مثنوی لکھنے والوں میں تسلیم کرنا پڑے گا۔ اُنھوں نے اِس صنف میں کئی ثبت تجربے کیے ہیں اور باوجود اس کے کہ ان کی ایک مثنوی بھی زمانہ شیب کی معلوم نہیں ہوتی، اس صنف میں خاصا تنوع پیدا کر دیا ہے۔

7۔ حَسَن

مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرے میں اِن کا تعارف اس طور پر کرایا ہے۔

"حَسَن، مولوی ابوالحسن فرزند مولوی الٰہی بخش المتخلص بہ نشاط پدر مولوی نورالحسن کے، کاندھلہ میں رہتے ہیں۔ ان کی تصنیف سے دو مثنویاں اور چند رسالے ہیں۔ بالفعل وہ کاندھلہ میں ہیں۔ ایک مثنوی کا نام "گلزار ابراہیم" ہے۔ دوسری "بحر حقیقت" کہلاتی ہے۔ منصوری پہاڑ پر میں نے یہ دونوں مثنویاں دیکھیں۔ ان میں تصوّفانہ قصہ ابراہیم ادہم کا حال ہے اور عشق انگیز دو مثنویاں ہیں۔ عمر ان کی درمیان 1847 (1263ھ) کے تخمیناً ساٹھ برس کی ہوگی۔ سننے میں آیا ہے کہ ان کی تصنیف سے اور رسالے بھی اردو میں ہیں۔ بہت نیک بخت اور پارسا اور خوش خلق سننے میں آئے ہیں۔"[18]

ان کی مذکورہ مثنوی "گلزار ابراہیم" کے شروع میں بطور دیباچہ یا تعارف ذیل کی عبارت چھپی ہے:

"یہ دفتر دوسرا ہے، بحر الحقیقت کا اور نام اس کا گلزار ابراہیمی ہے۔ اس میں بظاہر قصہ ہے عاشق ہونے کا ادہم کے اوپر دفتر بادشاہ بلخ کے اور محنت کھینچی ان کی عشق میں

بادشاہزادی کے اور مرجانا پادشاہزادی کا بیمار ہوکر اور بعد مرنے کے قبر سے نکال لے جانا اوہم کا لاش کو بیقراری عشق میں اور پھر زندہ ہونا اس دختر کا اور نکاح ہونا اوہم کا اُس شاہزادی سے اور پیدا ہونا حضرت ابراہیم کا اُس دختر سے اور دریافت ہونا پادشاہ بلخ کو حال زیست دختر کا اور لانا بیٹی کو اور ابراہیم کو اپنے گھر اور بعد بلوغ کے ولی عہد کرنا ابراہیم کو سلطنت پر اپنی اور ترک کرنا پادشاہی کا اور درویش ہونا اُن کا۔ یہ قصہ ظاہر میں بطور افسانے اور کہانی کے ہے اور مُراد اس سے اور ہے اور نظر غور سے یہ حال ہر ایک بشر کا ہے اور اسرار باطن کے بہت اس کے اندر مندرج ہیں۔ اگر بہ نظر غور کے سمجھے اور گوش دل سے پنبۂ غفلت کو نکالے تو اکثر راز باطن کے منکشف ہوویں اور فائدہ بھی حاصل ہوں۔ عاقلوں کے واسطے طغرائے ہدایت اور غافلوں کے لیے افسانہ اور حکایت ہے۔ یہاں سے شروع ہے حمد اور تعریف اللہ تعالیٰ جل شانہ کی اور بیان قدرت کاملہ اُس کی کا۔"19

کریم الدین نے بحرالحقیقت اور گلزار ابراہیمی کو الگ الگ مثنوی شمار کیا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ثانی الذکر اپنے آغاز اور انجام کے اعتبار سے بجائے خود ایک مکمل مثنوی ہے۔ مندرجہ بالا عبارت میں اسے بحرالحقیقت کا دوسرا دفتر کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مثنویوں کے اِس سلسلے کا مجموعی نام بحرالحقیقت رکھا تھا اور اس سلسلے کی تیسری مثنوی بھی تھی جس کا عنوان خنجرِ عشق معلوم ہوتا ہے۔ پہلی مثنوی یعنی بحرالحقیقت کا سال تصنیف 1250ھ (1834) ہے۔

گلزار ابراہیمی کا آغاز "حمد اور تعریف اللہ تعالیٰ جل شانہ کی اور بیان قدرت کاملہ اس کی کا" سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد:

"بیان اپنے عجز اور قصور کا اور نہ ہوسکنا حمد ربِّ غفور کا"
مناجات جناب الٰہی میں"
نعت پیغمبر خیر الانام درود اللہ کا ان پر اور سلام"

ہے۔ پھر "سبب تالیفِ کتاب" میں مصنف نے کہا ہے۔

شوقِ دل سے باہزاراں التماس　　دیکھتا تھا میں کتابِ اقتباس
اس میں ہے مسطور حالِ اولیا　　مِن وعَن تفصیل میں سے لکھا
حال پیدائش کا ابراہیم کی　　دیکھ کر مجھ کو عجب حیرت ہوئی
دل میں یوں آیا کہ بس یہ داستاں　　کیجیے ہندی میں لطافت سے بیاں
تھا یہ قصہ خلق میں گو مشتہر　　میں نے کھولے اور رازِ مستتر
گوہرِ تاباں و دُرِّ آبدار　　خلق پر میں نے کیے ہیں نثار
ہے نگار نازنیں یہ مثنوی　　مغز معنی ہے نہیں یہ مثنوی
پیر و مرشد یہ مری گفتار ہو　　کاش سمجھے کوئی اس کے مغز کو
رازِ مخفی کو کیا میں نے بیاں　　قصے کے پردے میں اے افسانہ خواں

کتاب اقتباس سے مراد کتاب ''اقتباس الانوار'' ہے جو تواریخ اولیا کے طور پر مشہور ہے اور احوال الاولیا سے متعلق ایک مستند ماخذ کی حیثیت سے معروف ہے۔

گلزار ابراہیمی میں جگہ جگہ مناجاتیں اور کہیں کہیں توضیح مطالب کے لیے حکایتیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ چنانچہ ذیل کے عنوانوں سے ظاہر ہے۔

''آغاز داستان۔ عشق ادہم کا دختر شاہ بلخ پر اور رنج و تکلیف کھینچنی اُن کی بحالِ مضطر، چھلکانا بادۂ شورش کا ایاغ دماغ کو اور جانا بادشاہزادی کا سیر باغ کو'

مناجات بجناب الٰہی'

پہنچنا ادہم کا اُس باغ میں جہاں پر شاہزادی سیر کرتی تھی اور روکنا اور جھڑکنا دربانوں کا اندر جانے سے اور مار کر ہٹا دینا ادہم کو در باغ سے'

حکایت عشق فقیر کی چین کی بادشاہزادی پر اور ناحق قتل کرنا شہزادی کا فقیر کو غصے میں آکر، جانا اُدہم کا پاس بادشاہ بلخ کے اور سوال کرنا اپنے نکاح کا بادشاہ کی دختر سے'

بعد تین روز کے جانا ادہم کا بہ امید نکاح بادشاہ کی جناب میں اور مانع ہونا وزیر با تدبیر کا اور دراندازی کرنی اس باب میں، پھر ادہم کی ذلت و خواری تکلیف و بیقراری'

مناجات بجناب الٰہی'

جواب دینا بادشاہ کا وزیر کو اور رد کرنا اس کی محبت کا '

جواب دینا وزیر کا بادشاہ کو اور رد کنایہ تقریر بادشاہ کا '

مثنوی میں بیچ بیچ میں تصوف اور ولایت کے مسائل کا بھی بیان کیا گیا ہے' چنانچہ اِس سلسلے کے کچھ عنوان اس طرح ہیں:

بیان اقسام ولایت کا ہے وجہ کلی پر۔ اول قسم ولایت کا نام ہے ولایت محمدیؐ۔

دوسری قسم ولایت کی جس کا نام ولایتِ عشقی ہے'

تیسری قسم ولایت کی جس کا نام ولایت روحی ہے'

چوتھی قسم ولایتِ وہبی ہے کہ جو شخص کامل کے زور اور قوت سے عاصی ولی ہو جائے۔"

قصہ کو ختم کرنے کے بعد ذیل کے عنوان سے مصنف نے نصیحتوں کا سلسلہ شروع کیا ہے:

"لب لباب اس داستان کا، اس کو افسانہ نہ سمجھیں اور تعلق معنوی سے اپنے اپنے نفس پر منطبق کر لیں۔"

اور اس عنوان کے تحت ذیل کی حکایتیں سنائی ہیں:

حکایت معلّم ظریف و خرفروش ابلہ کی۔

حکایت طبیب کی کہ کرم نجاست کی پیدائش کو بے فائدہ سمجھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو متنبہ کر دیا۔

اور پھر "خاتمہ بہ مذمت دنیائے فانی اور اس کی ترغیب دلانے پر" ہے اور اس عنون کے تحت جو اشعار ہیں ان میں سے کچھ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

عقل وہ ہے جس سے ہو عقبیٰ درست — کام ہو جس سے کہ ایماں کا درست

اس سخن کا کچھ نہیں ہے پاؤں سر — اے حسن اس داستاں کو ختم کر

ہے یہ دنیا سخت جائے نابکار — ایک حالت پر نہیں اس کو قرار

دیکھی جب آنکھوں سے دنیا کی فنا — دیکھتے ہی خود بخود گریاں ہوا

تھا وہ زنداں رحم میں رہنے کی جا — تیرہ و تاریک و تنگ و بے ضیا

چھوڑنا ان کا ہوا جب مجھ پہ شاق — قتل کرتا ہے مجھے ان کا فراق

یہ مکان واسع و بازیب و فر — یہ گل و گلزار و بستان و ثمر

ہوں گا جب میں چھوڑ کر ان کو جدا اے خدا یا راہیِ ملکِ بقا

شاعر نے اپنی اس مثنوی کی تکمیل کی تاریخ اس طرح نظم کی ہے۔

جب ہوا اس مثنوی کا اختتام تھے سنینِ ہجرت خیرالانام
اے برادر بالیقیں بے ریب وشک یک ہزار دوصد وپنجاہ و یک
1251

پانچویں تاریخ تھی شوال کی ختم جمعے کو ہوئی یہ مثنوی
حق تعالیٰ اس سے فیض عام دے میری محنت کا یہی انعام دے

نام حق پر ختم کر اپنی کتاب
اے حسن واللہ اعلم بالصواب

تمام شد

مصنف نے ''فیض عام'' کے لیے محنت کر کے اکبر شاہ ثانی کے آخری زمانے میں شوال 1251ھ (1835) کو یہ مثنوی مکمل کی تھی۔ زبان اس کی صاف، سلیس اور رواں ہے اور بیان کا انداز بھی واضح غیر مبہم اور سریع الفہم ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر فارسی کا اثر نہیں ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فارسیت نے اس کی سلاست کو مجروح نہیں کیا ہے اور مومن اور غالب کے دور میں یہ خوبی لائق ستائش ہے۔ ایک یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ مومن کی مثنویوں میں اخلاقی معیاروں کے متلاشیوں نے حسن کی اس مثنوی کی طرف برائے نام سی توجہ بھی نہیں کی۔ اس بے توجہی کا سبب کچھ ظاہر نہیں ہے۔

8۔ ممنون

میر نظام الدین ممنون کے کلیات میں بھی چھوٹی بڑی کئی مثنویاں ہیں۔ ان میں سے بیشتر اکبر شاہ ثانی کے عہد کی ہیں چنانچہ ایک ان کی تخت نشینی کے موقع کی ہے اور دوسری ان کے بیٹے مرزا جہانگیر کی شادی کی تقریب پر لکھی گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ کی فرمائش سے انھوں نے ایک

عشقیہ مثنوی بھی لکھی تھی جو نایاب ہو چکی ہے۔ کچھ مثنویاں عیدین کی تہنیت میں لکھی گئی ہیں اور ایک تخت شاہی کی تعریف میں بھی ہے ان سب کو نظر میں رکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ممنون نے صنف مثنوی کو قصیدے کے بدل کے طور پر استعمال کیا تھا۔

9-متفرق مثنویاں

علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں بھی اس زمانے کی بعض مثنویاں مخطوطہ کی صورت میں محفوظ ہیں۔ان میں سے دو یہ ہیں:

(الف) عقاید المسلمین 20 اس کا مصنف کوئی محمد مہدی صدیقی گنگوہی ہے۔ سال تصنیف اس کا 1245ھ (30-1829) ہے۔ تیرہ سطری مسطر پر یہ کُل بیس اوراق پر محیط ہے۔اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

الٰہی کفر اور شرکت سے ہم کو بچا رکھنا سدا بدعت سے ہم کو

اور خاتمہ کا شعر اس طرح ہے۔

الٰہی جو مولف اِس کا ہووے اسے رکھ دو جہاں میں آبرو سے

اس کے مطالب سنّی عقیدے کے مطابق اور ردِ بدعت میں ہیں۔

(ب) جنگ نامہ محمد حنیف 21۔اس کا مصنف کوئی شیخ عباداللہ ہاپوڑی ہے۔اس کو محمد امراو خان نے اٹھارہ سطری مسطر پر بیس ورقوں میں 1258ھ (1842) میں نقل کیا تھا۔مثنوی شروع حمد و نعت سے ہوتی ہے۔چنانچہ پہلا شعر یہ ہے۔

ثنا بے حد ہے ربّ العالمین کی پھر اس کے بعد ختم المرسلینؐ کی

آخری شعر میں شاعر نے بتایا ہے کہ تیس دن میں اسے میں نے فارسی سے زبان ہندی (=اردو) میں منتقل کیا ہے۔

یہ قصہ تھا زبانِ فارسی میں کیا ہندی زبان در روزِ سی میں

اِن چند کے علاوہ دلّی اور اس کے مضافات میں اور بھی بہت مثنویاں لکھی گئیں تھیں چنانچہ حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد عبدالواحد مسکین نے ''چشمہ شیریں'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی:

غلام مصطفےٰ خاں تیر کی بھی ایک مثنوی موجود ہے۔ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں ایک

مثنوی مظہر معجزات محفوظ ہے۔ اسی مصنف کی ایک اور مثنوی مختار نامہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور بھی کتنی مثنویاں ہوں گی جن تک فی الوقت ہماری رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ ان سب پر نظر کریں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دلی اور مضافات میں اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں جتنی زیادہ اور جتنی قسم کی مثنویاں لکھی گئیں، اتنی کسی دوسرے مرکز پر کسی دوسرے دور میں شاید نہیں لکھی گئیں۔ مثنوی کے موضوع وغیرہ سے متعلق تجربے بھی یہیں سب سے زیادہ ہوئے۔ یہ صحیح ہے کہ تمام مثنویاں شاہی سرپرستی میں نہیں لکھی گئی تھیں لیکن بادشاہ کی طبیعت کا میلان زمانے کے رجحان کو بہر حال متاثر کرتا ہے۔ اکبر شاہ ثانی مثنویوں کو پسند کرتے تھے اور ان کی ملکہ نے بھی اس صنف سے دلچسپی لی تھی۔ شاہی دربار میں ''افسانہ خواں'' رہتے تھے۔ شیفتہ نے ان میں سے ایک کا ذکر کیا ہے:

آگاہ تخلص، میر حسن علی از افسانہ خوانان شاہی شنیدہ است و بہ نہایت جودت طبع وجدت ذہن در چندیں فنوش نیکو دستے است۔''22

ان افسانہ خوانوں کی موجودگی بھی صنف مثنوی کے فروغ کی محرک ہو سکتی تھی۔

(و) نامۂ منظوم

منظوم خطوں کی روایت اردو میں خاصی قدیم ہے۔ بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے خاتمہ میں شاہ عالم ثانی نے بھی عجائب القصص میں کچھ منظوم خط شامل کیے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں یہ سلسلہ آگے بڑھا اور منظوم نامہ نویسی کی طرف بعض شاعروں نے اہتمام کے ساتھ توجہ کی۔

1۔ احسان

حافظ عبدالرحمان خاں احسان نے جو شاہ عالم ثانی کے زمانے کے ممتاز شاعر تھے طویل اور مختصر ہر قسم کے منظوم عریضے لکھے تھے۔ ایک عریضہ کا عنوان اس طرح ہے:

''قطعہ عریضہ ہذا بہ خدمت اکسیر خاصیت مرزا صاحب عالم محمد عالی بخت بہادر''

شاعر نے اس عریضہ کو شروع اس طرح کیا ہے۔

حماک اللہ نسیم صبح گاہی جزاک اللہ ہو سوئے قلعہ راہی
نہ سیم و زر سے تجھ کو گر کیا شاد نہیں جانے کی نیکی میری برباد
ہوا خواہی پہ اپنی تو نظر کر یہ سوئے خانۂ عالی گذر کر
یہ کہہ عالی سے عالی بخت تو [illegible] کہ الوند وفا یک لخت تو ہے

کفِ ہمت ڈُر دریائے احساں کرم گستر کرم فرمائے احساں

اس نوع کی تمہید کے بعد چند شعروں میں مکتوب الیہ کی خوبیوں کا بیان کرکے کہا ہے ۔

وَلے تجھ کو سدا ہے خیال میرا جَزاک اللہ فی الدارین خیرا
زیادہ کیا کہوں اپنی کہانی قوی سستی، قوی ہے نا توانی
چلوں کیونکر میں سوئے بزم عالی بدل ہے آرزوئے بزم عالی
سُنوں تیرے دہن سے شعر تیرا الٰہی غنچۂ امید بکشا
حواسِ خمسہ میرے پابہ گل ہیں اگر چہ خار ہر سوگرد دل ہیں
نہیں دولت سے تیری دلخراشی الٰہی تاجہاں تو زندہ باشی

دیکھا جاسکتا ہے کہ عریضہ مثنوی کی ہیئت میں ہے۔اس کے مطالب بھی اسی صنفِ سخن سے مطابقت رکھتے ہیں۔لیکن خود احسان نے بعض ''نامے'' غزل کی صورت میں بھی لکھے ہیں۔یہاں صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا نامہ جو غزل کی ہیئت میں ہے،اس کا عنوان اس طرح ہے:

''قطعہ ہذا بہ صادق علی خاں خسر نواب اعتمادالدولہ میر فضل علی خاں در لکھنؤ برائے ملاقات۔''

کہو نواب سے اے مخلصِ صادق میرے شہر میں تیرے عجب طرح کا دیکھا ہے رواج
نامِ احساں سے یہاں ننگ ہے آتا سب کو تنگ ہوں میری ملاقات نہ کل ہوئی نہ آج

فرض کر دم کہ بیادِ تو دلم خرسند است
لیکن ایں دیدۂ دیدار طلب راچہ علاج

اور دوسرا نامہ جو صرف دو شعروں پر مشتمل ہے،اس طرح ہے:

''قطعہ ہذا بہ نواب مذکور بہ بے مزگی نوشتہ''

صبا یہ کہو تو فضل علی سے اے نواب کہ قدرِ نعمتِ احساں نہ تم نے سمجھی حیف
جو اپنی فیل سواری کا آپ کو ہے گھمنڈ شروع کرتا ہے بندہ بھی لے اَلم تَرکیف

احسان کے یہ تینوں قطعے ''نامہ'' کے ابتدائی نمونے کہے جاسکتے ہیں کہ ان میں شاعر نے اپنی بات قطعیت اور اختصار کے ساتھ بغیر کسی تکلف اور تصنع کے کہہ دی ہے۔

2۔ مومن

حکیم محمد مومن خاں مومن نے ''نامہ'' نویسی کو فن کی حیثیت سے اختیار کیا تھا۔ انھوں نے دو منظوم نامے لکھے تھے اور ان میں اپنے شاعرانہ کمالات کا بدرجۂ احسن اظہار کیا تھا۔ ان کے پہلے نامے کا عنوان اس طرح ہے:

''نامۂ مومن جانباز بہ جانب محبوبۂ دلنواز''

اس میں مکتوب الیہ کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے۔

اے چارہ گرِ مریضِ بیتاب — دے نور فزائے چشمِ بیخواب
مرہم نہِ زخمہائے عاشق — دردِ عاشق دہم دوائے عاشق
اے نبض شناسِ جانِ مضطر — ناسور زدائے دیدۂ تر
اے مایۂ لطفِ زندگانی — جان بخشِ وفائے جا ودانی
اے جانِ وفا شعارِ مومن — درمانِ دلِ فگارِ مومن

اس کے بعد اپنے احوال کی طرف ان شعروں میں اُسے متوجہ کیا ہے۔

دھیان آپ کا اِن دنوں کدھر ہے — کچھ حال کی میرے بھی خبر ہے
بیمار ہوں اور قریبِ مَردن — ہر دم ہے عذابِ جاں سپردن
اک آگ سی لگ رہی ہے تن میں — شعلے سے بھڑکتے ہیں بدن میں
کیا عضو گدازیاں کہوں میں — انگشت نمائے شمع ہوں میں

پھر مرض اور معالجہ کا حال نظم کیا ہے۔

کیا کیجیے صداع کی شکایت — کس دکھ میں ہے اس قدر سرایت
از بسکہ صداع کر دیا ہے — صندل کو بھی دردِ سر دیا ہے

اور نامے کو ذیل کے شعروں پر ختم کیا ہے۔

ہر چند غمِ امام ہووے — پر تجھ کو نہ غم سے کام ہووے
ہر شب تجھے عشرتِ دل افروز — ہر روز ہو تیرے گھر میں نو روز
ہر شامِ طرب سعید تجھ کو — ہر صبح ہو صبحِ عید تجھ کو

ہو ں میں بھی شریک محفل سور تو مجھ سے رہے، رہوں میں تجھ سے مسرور

کلیاتِ مومن میں دوسرے خط کا عنوان اس طرح سے درج ہے:

''نامۂ باسوز و گداز بہ سمتِ معشوقۂ طناز''

اس میں ''معشوقۂ طناز'' کو شاعر نے اس طرح مخاطب کیا ہے۔

اے گلِ گلستانِ رعنائی نو بہارِ ریاضِ زیبائی
اے مہِ آسمانِ حُسن و جمال بے نظیرِ جہانِ وہم و خیال
اے دُرِ شاہوارِ ناسفتہ گوہرِ آبدارِ ناسفتہ
اے گلِ تر بسر نیامدہ اے نہال بہ بر نیامدہ
غنچۂ با صبا بخو شیدہ رنجِ گلچیں ہنوز نادیدہ
اے بتِ روبہ دہر نہادہ درکفِ کافرے نے فتادہ
اے دل و دیں بیک نگہ بُردہ خون بیچارہ مومنے خوردہ

اس مفصل تخاطب کے بعد اپنے احوال کی طرف محبوب کو ان شعروں میں متوجہ کرتے ہیں۔

اے تغافل شعار بے پروا حال معلوم کیا تجھے میرا
تجھ کو داں لافِ کبریائی ہے یا نکلا دین و دل پہ آئی ہے

چند شعروں کے بعد کہتے ہیں۔

مجھ سے عاشق کی یوں دل آزاری ہووے فی النار ایسی دیداری
شعلہ کی طرح ہاتھ ملتا ہوں بہم دوزخ سے تیری جلتا ہوں

اور ۔

عذر بیہودہ دل پسند نہیں بابِ توبہ ہنوز بند نہیں
ایسے نازک کو کون دے ہے سزا نوجوانی کا تم اٹھاؤ مزا

اس قسم کے مضامین کے بعد نامہ کو ان شعروں پر ختم کرتے ہیں۔

فائدہ پھر ہوس سے کیا تجھ کو مجھ سا مشتاق مل چکا تجھ کو

میری باتیں نہیں تمھیں معلوم ورنہ کا ہیکو یوں رہو محروم
میں وفادار ہوں وفا کی قسم تیری حسرت فزا جفا کی قسم
بیوفا بندۂ خدا گر ہوں لیک تجھ سے پھروں تو کافر ہوں
تو جو ہے ہاشمی نسب اے جاں ہے محبت تری مرا ایماں

آخری شعر سے ظاہر ہے کہ یہ محبوب فرضی یا خیالی نہیں ہے۔ ان ناموں کو بھی مومن کی مثنویوں کے سلسلے کی کڑی خیال کیا جانا چاہیے۔ زبان اور بیان وغیرہ کے اعتبار سے بھی یہ ویسے ہی ہیں۔

3۔ ذوق

''آبِ حیات'' میں مولانا محمد حسین آزاد نے شیخ محمد ابراہیم ذوق کے مثنوی لکھنے کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ''نامۂ جانسوز'' کا حال قلمبند کیا ہے۔ بعد میں انھوں نے دیوانِ ذوق میں اس نامے کے اڑتیس شعر درج کیے اور ان کی تمہید کے طور پر وہی ''آبِ حیات'' کی عبارت بعض اضافوں کے ساتھ نقل کر دی ہے۔ ذوق کا یہ نامہ اگرچہ بہادر شاہ ثانی کے عہد کا ہے، نامہ نویسی کی روایت میں ارتقا کا مظہر ہونے کی وجہ سے اس کا یہاں ذکر کرنا مناسب تر معلوم ہوا۔ اس کے تعارف میں آزاد کی عبارت یہ ہے:

''نواب حامد علی خاں مرحوم نے عاشقانہ موقع پر ایک شوقیہ خط کی استاد مرحوم سے فرمائش کی۔ بادشاہ کی متواتر فرمائشیں ایسے کاموں کے لیے کب فرصت دیتی تھیں مگر اتفاق کہ ان ہی دنوں میں ماہِ رمضان آ گیا اور بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ ان کی زبان کب رہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس چمن کی ہوا کھانے کو اپنا دل بھی چاہتا تھا۔ انھوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کر دیا اور کئی دن میں تین سو شعر ہو گئے لیکن اُدھر ماہِ رمضان ہو چکا، اِدھر بادشاہ نے پھر غزلیں شروع کر دیں۔ مثنوی وہیں رہ گئی۔ بیچ میں کبھی کبھی پھر طبیعت میں اُمنگ اٹھی مگر ایک دن، کبھی دو دن۔ بیس پچیس شعر ہوئے، پھر رہ گئے۔[1]

''میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا تو اکثر اس کا ذکر کیا کرتے اور کہیں کہیں کے شعر بھی پڑھا کرتے۔ میرے بار بار کہنے سے اسے نکالا تو دیکھا کہ تین

تختیاں مشقِ اطفال کی تھیں۔ دونوں طرف سیاہ تھیں اور کچھ کاغذی مسودے تھے۔ تختیاں اکثر جگہ سے پڑھی بھی نہ جاتی تھیں۔ فرصت کے وقتوں میں وہ سوچ سوچ کر بناتے گئے، میں لکھتا گیا۔ پانچ سو شعر سے زیادہ ہو گئے۔ نامہ ناتمام تھا مگر ایک ایک مصرع ریزۂ جواہر تھا۔ میرے صاف کیے ہوئے مجموعے بھی انھی غزلوں میں تھے جو میں خلیفہ صاحب کے ہاں جا کر صاف کیا کرتا تھا۔ سب کے ساتھ وہ بھی گئے۔ اس کا نام 'نامۂ جانسوز' تھا۔ اوّل حمد و نعت تھی، پھر ساقی نامہ، پھر القابِ معشوق۔ اسی میں اس کا سراپا۔ اس کے بعد یادِ ایامِ وصل، اس میں چاروں موسموں کی بہار۔ معنوں کی نزاکت، لفظوں کی لطافت، ترکیبوں کی خوبیاں، اندازوں کی شوخیاں، کیا کہوں، سامری کا جادو اس کے آگے دھواں ہو کر اڑتا تھا۔ چند متفرق شعر دیوانِ مطبوعہ میں ہیں۔ چند شعر مجھے یاد تھے۔ یکجا لکھ دیتا ہوں جو یادگار رہ جاتے وہی غنیمت ہے۔"[2]

"نامۂ جانسوز" کے مضامین کا جس طرح آزاد نے بیان کیا ہے، اس کی روشنی میں یہ نامہ یقینی طور پر لاجواب تھا۔ اردو کی قدیم ترین منظومات میں مہینوں اور موسموں (=رُتوں) وغیرہ کی کیفیتوں کے بیان کا چلن رہا ہے۔ آزاد کے قول کے مطابق نامۂ جانسوز میں ذوق نے اُس قدیم روایت کو بھی زندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ دیوانِ ذوق میں اس کے جو متفرق اشعار درج ہیں اُن سے اصل نظم کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنی مشکل ہے، بہرنوع اِس نامے کی بہ صورتِ موجودہ ابتدا اس طرح ہوئی ہے۔

چاہیے نام اسی کا اے خامہ　　زینتِ نامہ زیبِ سرنامہ
ہے فلک اک نمونہ قدرت کا　　یا قلمداں ہزار صنعت کا

شاعر نے حمد وغیرہ کے بعد ساقی نامہ لکھا ہے۔ اس کے دو شعر یہ ہیں۔

ساقیا جلد اٹھ درنگ نہ کر　　عرصہ مطلب کا دیکھ تنگ نہ کر
طاق سے تو اتار لے شیشہ　　طاق پر رکھ کتابِ اندیشہ

اِس جزو میں شاعر نے ایک قطعہ بھی شامل کیا ہے، اس طرح۔

کردے یاں تک مجھے نشہ میں چور　　تا کہ مانندِ خوشۂ انگور

دل کے سارے پھپھولے پھوڑوں میں　　نکتہ باقی کوئی نہ چھوڑوں میں

ایک جُو وشب ہجراں کے رنج کے بیان میں بھی ہے۔اس کے دو شعر یہ ہیں۔

شب ہجراں بسر نہیں ہوتی　　نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی

بسترِ رنج وگنجِ تنہائی　　رات کیا آئی اک بلا آئی

اس میں دل اور جان دونوں کے اضطراب اور بیقراری کا بھی بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے۔کہتے ہیں۔

مضطرب اب جو ہو رہا ہے دل ہے　　دل ہے یا مرغِ نیم بسمل ہے

دل کی واشد کی کیا کروں تدبیر　　غنچہ وگل ہے غنچۂ تصویر

جان بیتاب جیسے بیکل برق　　وہ گرم رو فنا کا لبرق

نبض چھوٹی ہوئیں، غشی طاری　　ایک فرقت ہزار بیماری

آخری شعر محبوب کے سراپا کے ہیں، اس طرح۔

کمرو ناف از پے دلِ زار　　رشتۂ کار و عقدۂ دشوار

رنگِ پاں لعل روح افزا پر　　خون ثابت کرے مسیحا پر

اِن مختلف تمہیدی اجزا کے بعد اصل نامہ نظم کیا ہوگا۔ جو اشعار موجود ہیں، ان سے زبان وبیان پر شاعر کی حاکمانہ قدرت ظاہر ہے۔ان کی روشنی میں بغیر کسی تامل کے کہا جاسکتا ہے کہ ذوق مثنوی لکھنے کی بھی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔اور ان کا ''نامۂ جانسوز'' اگر مکمل ہو جاتا تو اپنے بیان اور مطالب کے اعتبار سے اردو میں نامہ نگاری کا ایک معیاری اور مثالی نمونہ ہوتا۔

(ز) مرثیہ وغیرہ

دہلی پھر دہلی تھی، لکھنؤ نہیں تھی۔ وہاں حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ وغیرہ سے محبت اور عقیدت میں کمی نہیں کی جاسکتی تھی البتہ دوسرے اکابرِ مذہب کا بھی کماحقہٗ احترام کیا جاتا تھا اور ان کی شان میں زبان کھولنے کو برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔

1۔ احسان

حافظ عبدالرحمان خاں احسان پرانے شاعر تھے۔ شاہ عالم ثانی سے بہادر شاہ ثانی تک کا زمانہ دیکھا تھا۔ کہتے تھے۔

جو اہلِ تسنن پر آوازہ کسے ناحق　　شاگرد ہے شیطان کا ابلیس مقرر ہے

انھوں نے ایک مسدس لکھا تھا جس کا عنوان اس طرح ہے:

''مسدس در منقبت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ و در منقبت محمد مرتضیٰ علی صلی اللہ علیہ گوید''

یہ مسدس ترجیع بند ہے۔ اس کے عنوان کا دوسرا جز و مشتبہ ہے۔ کاتب نے کچھ کا کچھ لکھ دیا ہے۔ خیر! اس میں کل تین بند ہیں اور وہ یہ ہیں۔

مصطفیٰ و مرتضیٰؓ کی فرض ہے مجھ پر ثنا　　وہ مراحاجت روا اور یہ مرا مشکل کشا

جان تن سے جب جھگڑ ہونے لگے یارب جدا　　دمبدم نکلے مرے منھ سے یہی اُس دم صدا

یا محمدؐ یا نبی یا مجتبیٰ یا مصطفیٰؐ
یا علیؓ یا ایلیاؓ یا بوالحسنؓ یا مرتضیٰؓ
کفر سے بیماری سے اور فقر سے رکھتا ہوں بیم صحت و حشمت ہو یہاں بخت میں واں ہوں میں مقیم
ہو دعا مقبول میری یا غفور و یا رحیم یا قریب و یا مجیب و یا سمیع و یا علیم
یا محمدؐ یا نبیؐ یا مجتبیٰؐ یا مصطفیٰؐ
یا علیؓ یا ایلیاؓ یا بوالحسنؓ یا مرتضیٰؓ
آل اور اولاد میری صاحب ایمان ہو ناصر اسلام ہو ہم حافظِ قرآن ہو
اور مجھ پر مشکلِ جاں کندنی آسان ہو ہم عذابِ قبر سے محفوظ یہ احسان ہو
یا محمدؐ یا نبیؐ یا مجتبیٰؐ یا مصطفیٰؐ
یا علیؓ یا ایلیاؓ یا بوالحسنؓ یا مرتضیٰؓ

اس مثال سے اہل دہلی کے عقیدہ اور ان کے معاملات کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

2۔ نصیر۔

شاہ نصیر استاد اساتذہ تھے اور اطرافِ ملک کی سیر کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی ایک ''قصیدہ در منقبتِ جناب امیر المومنین علی مرتضیٰؓ'' لکھا تھا جو مسدس ترکیب بند کی صورت میں ہے۔ پہلا بند یہ ہے۔

وہ تیرا رتبۂ عالی ہے یا امیر اُمم کہ تو نے دوش پہ رکھا ہے مصطفیٰؐ کے قدم
بنا ہے گردۂ تصویر سے ترے آدم ہر ایک صاحبِ معنی کے دل پہ ہے یہ رقم
بصورتِ تو کسے رانہ آفرید خدا ترا کشیدہ دوست از قلم کشید خدا

اور ایک ''سلام بہ جناب امام ہمام'' بھی تحریر کیا ہے جو مسدس ترجیع بند ہے۔ اس سلام کا پہلا بند اس طرح ہے۔

بہر سلام طرح کیا رنگیں ہم نے نکالی پھولوں کی
لختِ جگر سے ایک لڑی اب طرفہ بنالی پھولوں کی
ہے جو ہوا خواہوں میں صبا اک چاہنے والی پھولوں کی

کہنے لگی یوں غور سے رنگت دیکھ نرالی پھولوں کی
ہے یہ خونِ شاہِ شہیداں جس سے ہے لالی پھولوں کی
کیوں نہ جھکے مجرے کے لیے فردوس میں ڈالی پھولوں کی

چھ بند کے اس سلام میں آخری بند اس طرح ہے۔

کرتا ہے کیا ابر بہاری گر یہ وزاری لیل ونہار
موج ہوا پیچاں بھی چلی ہے سر کو در و دیوار سے مار
کھینچے ہے یہ ہر آن حرارت پر فلک کو ہو کیونکہ قرار
رعد کرے ہے شور و فغاں اب کہہ کے نصیر یہی ہر بار

ہے یہ خونِ شاہِ شہیداں جس سے ہے لالی پھولوں کی
کیوں نہ جھکے مجرے کے لیے فردوس میں ڈالی پھولوں کی

شاہ نصیر سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کے لیے معروف تھے۔ انھوں نے اپنے طرزِ خاص میں یہ سلام بھی خوب کہا ہے۔

3۔ ذوق

مرثیہ اور سلام کے سلسلے میں شیخ محمد ابراہیم ذوق کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد نے بس مختصر سی بات یہ لکھ دی ہے کہ:

> ''مرثیے سلام کہنے کا انھیں موقع نہیں ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔'' 1

ردیف نون کے متفرق شعروں میں آزاد نے لکھا ہے:

> ''شعر مرقوم الذیل ایک مسدس کا ترجیع بند ہے کہ جناب سید الشہدا کے مرثیہ میں (ذوق نے) لکھا تھا۔ کئی بند اس کے بندۂ آزاد کو یاد ہیں۔ اپنی جگہ پر وہ بھی درج ہوں گے 2

کرتے اپنے سر کو جو نوکِ سناں پر تاج ہیں عشق میں وہ کرتے حاصل رتبۂ معراج ہیں

کٹا کر اپنا سر نوکِ سناں پر تاج کرتے ہیں حصول اس طرح عاشق رتبۂ معراج کرتے ہیں

یاد ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود آزاد نے اس ترجیع بند کا ایک بند بھی نقل نہیں کیا ہے۔ دوسرا مطلع بجنسہٖ حفیظ دہلوی کے دیوان میں مندرج ہے۔ وہی آزاد کو یاد رہ گیا ہوگا اور انھوں نے ذوق کے نام سے ان کے دیوان میں تحریر کر دیا ہوگا۔ ظاہراً آزاد کا یہی بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ذوق نے مرثیے اور سلام وغیرہ نہیں لکھے۔

4۔ مومن

یہ محض اتفاق اور چلن کی بات ہے کہ مرثیہ کو واقعات کربلا کے ساتھ مخصوص خیال کر لیا گیا ہے اور اس کے لیے مسدس کی صورت عام ہو گئی ہے، ورنہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ ایک عام اصطلاح ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ کسی خاص ہیئت کی پابند نہیں ہے۔ حکیم محمد مومن خاں مومن نے اپنے طرز کا ایک مرثیہ لکھ کر صحیح صورت حال کو سامنے لانے کی کوشش کی تھی۔

حکیم محمد مومن خاں مومن کی عاشقانہ زندگی کے آغاز کی نشاندہی اُن کے درج ذیل شعروں سے کی گئی ہے۔

یعنی طفلی سے ہوں میں پیر مغاں بلدِ راہِ گمرہانِ جہاں
تھے برس ہم شمارۂ افلاک کہ ہوا پائمال صورتِ خاک

نہ سپہر کے مطابق اس وقت مومن کی عمر نو برس کی تھی۔ اس کے بعد جو افتاد پڑی، اُس کا بیان ان شعروں میں کیا گیا ہے۔

آفتِ جان و دل فراق و وصال الغرض کٹ گیے یوں ہی دو سال
بہرِ تسکینِ شدّتِ خفقاں ٹھہری گلگشت روضۂ رضواں
گئی جنت میں بسکہ ایسی حور ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور

یعنی جس وقت مومن کی عمر گیارہ برس کی ہوئی ان کی ''وہ حور'' جنت کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔ اس واقعہ سے مومن کے دل کو جو صدمہ ہوا اس نے انھیں بیقرار کر دیا۔ اس مقام پر کسی کا یہ اعتراض کہ اس کم عمری میں عشق کیوں کر ہوا ہوگا، فضول ہے۔ اپنے چاہنے والوں سے بچپن میں جو محبت ہوتی ہے اس کا اثر زندگی کے آخری لمحوں تک بھی کسی نہ کسی درجے میں باقی رہ سکتا ہے۔

مومن جب اس لائق ہوئے تو انھوں نے جنت کو سدھار جانے والی اپنی حور کا مرثیہ لکھا۔
اس مرثیہ کا عنوان اس طرح قائم کیا گیا ہے:

''ترکیب بند بہ مضمون مرثیہ معشوقۂ حور طلعت ملک شیم خصلے وصالہا فی جنت النعیم۔''

اس ترکیب بند کے ہر بند میں مومن نے گیارہ گیارہ شعر کہے ہیں۔ پہلا بند اس طرح ہے۔

خمیازہ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج　　آغوش رشک حلقۂ اہل عزا ہے آج
برباد شور رعد ہوا آب اشک پر　　کیسا وفور شیون وجوش دبکا ہے آج
جیتے رہے تو لال تمانچوں سے منہ کیا　　تنجیر رنگ شرم وخجالت فزا ہے آج
پانی کے بدلے منہ میں جو بھر آئے ہے لہو　　لب کاٹنے میں ہائے کہاں وہ مزا ہے آج
مجھ کو نہ اپنے ساتھ عدم میں لیے گیا　　ہر دم شکایت نفس نارسا ہے آج
آواز ہائے ہائے کی آتی ہے متصل　　گردوں طلسم گنبد ماتم سرا ہے آج
اتنے کہاں حواس کہ تدبیر مرگ ہو　　اتنی خبر نہیں مجھے کیا جانے کیا ہے آج
اے دل خبر لے نغمۂ شادی کو کیا ہوا　　لب پر ہمارے نالۂ واحسرتا ہے آج
پیٹے مجھے جو روئے، وہ کہتے تھے بار بار　　کیا روئیے اسی کا ہمیں پیٹنا ہے آج
اترے گلے سے گھونٹ نہ آب حیات کے　　دل آہ زندگانی سے کتنا خفا ہے آج

مرنا یہ کس کا جان سے بیزار کر گیا
ماتم میں مر رہا ہوں میں یہ کون مر گیا

طوالت کے خوف سے اب پورے پورے بند نقل کرنے کے بجائے بعض کے صرف آخری شعر لکھے جاتے ہیں۔

افسوس یوں وہ جان جہاں جائے ہاتھ سے　　دینا تھا غسل خضر کو آب حیات سے
کیا کیا کدورتیں ہیں دل ناصبور میں　　کیوں نیند آ گئی اسے آغوش گور میں
اس سیم تن کو ہائے ملایا ہے خاک میں　　گردوں نے گنج حسن چھپایا ہے خاک میں

اس مرثیے کا سب سے زیادہ موثر اور دلدوز حصہ وہ ہے جہاں شاعر نے اس مہروش کی مرگ کا ماتم کیا ہے۔ یہاں اس موقع کا ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔

کھودی خزاں نے رونقِ گلزار ہائے ہائے
پژمردہ ہوگئے گلِ رخسار ہائے ہائے

پھرتی نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب
نعش اس کی جائے سربازار ہائے ہائے

سروِ فتادہ قامتِ محشر خرام ہے
کیاہوگئی وہ شوخیِ رفتار ہائے ہائے

ہمخواب مہ جبیں کی مرے آنکھ مُند گئی
کیا سوگئے ہیں طالعِ بیدار ہائے ہائے

وہ شمعِ مہر پر تو مہ جلوہ بجھ گئی
دن رات ہے فروغِ شب تار ہائے ہائے

ہے کچھ خبر بھی گھر مرا ویران ہوگیا
سر پھوڑو اپنا اے درودیوار ہائے ہائے

اب پوچھے مجھ سے عاشقِ بیکس کی بات کون
اس میں نہیں ہے طاقتِ گفتار ہائے ہائے

روتا ہوں جان کو ملک الموت کی ذرا
کہہ میرے ساتھ تو بھی تو غمخوار ہائے ہائے

اے چرخ بارکش تجھے پاس وفا نہیں
میں اور رنجِ محنت وآزار ہائے ہائے

اس مہروش کی مرگ نے خفّاش کردیا
ہے اضطراب مانعِ دیدار ہائے ہائے

نظارہ ہے محرکِ ماتم ہزار حیف
ابروئوا ہلالِ محرم ہزار حیف

اس کے بعد کے کچھ بندوں کا صرف پہلا شعر نقل کیا جاتا ہے۔

مدفن بنے زمین چمن وامصیبتا
معدوم ہو وہ غنچہ دہن وامصیبتا

کیا میرا سدِّ راہ ہے سنگ مزار حیف
چھاتی کا پتھر ان کی ہوا انتظار حیف

وہ مہر جلوہ زیرِ زمیں اے فلک دریغ
گردوں نشیں ہو خاک نشیں اے فلک دریغ

اور اِس مرثیہ کا آخری بند اس طرح ہے۔

اے جوشِ نالہ کاوشِ ہر دم کہاں تلک
یوں موت سے شکایتِ پیہم کہاں تلک

اُس مہروش کو روز کے رونے سے کیا حصول
اے اشک بیقراریِ شبنم کہاں تلک

گردن جھکی ہوئی ہے وہی بارِ دوش ہے
اے دل خیالِ ابروِ خوش خم کہاں تلک

جل جل کے میرا دل قدح خاک ہوگیا
اے آہ سینہ سوز ہے ہمدم کہاں تلک

میں صحن اس کے گھر کا سمجھتا ہوں نور کو
اللہ مجھ سے تنگ ہے عالم کہاں تلک

سینے کے سارے آبلے ناسور ہوگئے
اے دستِ عیش وصل کا ماتم کہاں تلک

ہے جستجوئے یار میں سعیِ رہِ عدم　　اے شوق دیکھیے کہ رہے دم کہاں تلک
تاثیر کو بھی آ گئی موت اس کے ساتھ ہائے　　کھایا کروں امید اثر سم کہاں تلک
اس زندگی سے میرا دم آیا ہے ناک میں　　آخر تحملِ قلق و غم کہاں تلک
اللہ سینہ کو بیوں سے ہاتھ تھک گیا　　پیٹیں گے اپنی جان کو یوں ہم کہاں تلک

اے مرگ اس عذاب سے آ کر چھڑا مجھے
مومن ہوں قید خانہ ہے دارالفنا مجھے

ظاہر ہے یہ مرثیہ وقوع حادثہ کے ایک مدت بعد لکھا گیا تھا، باوجود اس کے اس میں جو درد، سوز اور گداز ہے اسے شاعر کے جوشِ فکر اور زورِ قلم کا کرشمہ سمجھا جانا چاہیے۔ مومن نے صرف یہی ایک مرثیہ لکھا تھا لیکن اسی ایک سے انھوں نے مرثیہ گوئی سے متعلق اپنی عمدہ صلاحیتوں کا کامیابی کے ساتھ اظہار کر دیا ہے۔ اس مرثیہ سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ مرثیہ کے لیے کسی ہیئت کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

5۔ مضطر

یہ ایک ہندو شاعر تھا۔ لکھنؤ سے آ کر پچھم کے علاقوں میں رہنے لگا تھا۔ کربلا کے واقعات سے واقف تھا اور ان سے متعلق اس نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ شیفتہ نے اس کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''مضطر تخلص، کنور سین از سکنائے لکھنؤ است۔ از عرصہ دوازدہ سال بہ علاقہ تحصیلداری ڈہای از متعلقات بلند شہر است بسر اوقات میسازد۔ بافقیر بارہا برخوردہ شوق شعرش از اندازہ افزوں است و بہم انکسار فراواں دارد۔ قصیدہ در واقعۂ کربلا نوشتہ دو سہ بیت ازاں بر من خواندہ بود۔ معلوم می شد کہ مضامین معقول یافتہ باشد۔ خود را از تلامذۂ مصحفی می گیرد۔''3

شیخ مصحفی نے اپنے پہلے تذکرے میں ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔ ان کا اختصار یہ ہے:

''لالہ کنور سین مضطر تخلص، پسر دیوان دیبی پرشاد قوم کایستھ سکسینہ، برزگانش کہ ہم عمدہ

معاش وبا جاہ وثروت بودند، ازشاہجہاں آباد اند، وخودش درلکھنؤ تولد وتربیت یافتہ.....از عالم کتب نشینی چیزے درزبان ہندی وفارسی موزوں می کرد.....

از چندے معرفت محمد عیسا تمنا بہ حلقۂ شاگردی مولف درآمدہ....."4

افسوس ہے کہ ان کا واقعہ کربلا سے متعلق کوئی شعر دستیاب نہیں ہوسکا۔

6۔افسر

یہ بھی مصحفی کے شاگرد تھے۔ چنانچہ شیفتہ کے تذکرے میں ہے:

"افسر تخلص، غلام اشرف آبائش سرخدمت گاوخانہ بادشاہی بودند، ازتلامذۂ غلام ہمدانی مصحفی است۔ بیشتر فکرش مقصور برمراثی بودہ۔"5

مصحفی نے ان کے بارے میں بھی خاصی مفید معلومات قلمبند کی ہیں:

"غلام اشرف ولد غلام رسول کہ درمرثیہ وسلام اشرف تخلص می کند ودرشعر افسر قرارزادۂ قوم شیخ....مشارٌ الیہ بہ مقتضائے موزونیٔ طبع از یک دوسال فکرِ مرثیہ وسلام برسبیلِ رواج زمانہ کردہ ومی کند۔ درایامیکہ مولف طرح مشاعرہ افگندہ، درآں روزہا بہ ترغیب فقیر مجموع پنج غزل طرحی مشاعرہ گفتہ، ازنظرِ فقیر گزرانیدہ....."6

ان کا بھی کوئی مرثیہ یا سلام اس وقت ہمیں نہیں مل سکا۔

معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے واقعات کربلا سے متعلق مرثیے اور قصیدے وغیرہ لکھے تھے لیکن ان کو شہرت نہیں ملی یا بہ وجوہ انھوں نے اپنے کلام کو عام نہیں کیا۔ مرثیہ کے بارے میں اس زمانے میں خود لکھنؤ میں بعض باتیں مشہور تھیں مثلاً: "مرثیہ گوئی سہل اور غزل گوئی دشوار"7

اور:

"بگڑا شاعر مرثیہ گو"

1 وغیرہ۔ ایسے حالات میں اگر مضطر اور افسر جیسے شاعروں کے ایسے کلام کا معیار بھی کچھ زیادہ بلند نہ ہوسکا یا وہ نامقبول رہ گیا تو اس میں تعجب یا افسوس کی کوئی وجہ نہیں۔

(ح) رباعیات و مستزاد

فنی نقطۂ نظر سے اپنی تمام دقتوں کے باوجود، رباعی اردو شاعری کی غالباً مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا شاعر ملے گا جس نے تمام عمر میں کوئی رباعی نہ کہی ہوگی۔ قدرت اللہ قاسم کے تذکرے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عالم ثانی کے وقت کی بیشتر روایتیں برگ و بار لا رہی تھیں۔ صنف رباعی کو بھی اس دور میں خوب ترقی ہوئی تھی۔ کیفیت یہ تھی کہ بعض مثنویوں میں بھی رباعی شامل کی جانے لگی تھی لیکن اُن کے بعد یہ صورتِ حال جاری نہیں رہ سکی۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ضمناً یہ اطلاع قلمبند کی ہے کہ:

"افسوس ہے کہ ذوق کے شاگرد بہادر شاہ ظفر کی کوئی رباعی نہیں مل سکی۔"[1]

اِس صنفِ شاعری سے ظفر کے دلچسپی نہ لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر شاہ ثانی اور پھر بہادر شاہ ثانی کے عہد میں بھی دربار سے وابستہ شاعروں نے زیادہ رباعیاں نہیں لکھیں۔ اور بطور مجموعی ان کے عہد میں اِس صنف کو زیادہ فروغ نہیں حاصل ہو سکا۔

1۔ احسان

جیسا کہ مذکور ہوا حافظ عبدالرحمان خاں احسان شاہ عالم ثانی کے عہد کے باکمالوں میں سے تھے اور انھوں نے بہادر شاہ تک کا زمانہ دیکھا تھا۔ ان کے دیوان میں چند ہلکی پھلکی رباعیاں

موجود ہیں اور وہ عموماً مذہبی جذبات کی آئینہ دار ہیں مثلاً

احساں جو اجل سے کام تیرا بگڑے　　اُس وقت نہ ہوں دل میں جہاں کے جھگڑے
یوں تو کلمہ پڑھے ہے طوطا بھی ولے　　ٹیں ٹیں کرتا ہے بلی پکڑے

اور

تعظیم جنابِ اولیا ایماں ہے　　ہے مظہرِ حق وہی جہاں انساں ہے
کر سجدۂ تعظیم بزرگوں کو ضرور　　آدم کو جو سجدہ نہ کرے شیطاں ہے

2۔ نصیر

شاہ نصیرالدین نصیر بڑے قادرالکلام استادوں میں سے تھے۔ فی البدیہہ رباعی کہہ لیتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے۔

"دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے اور کچھ رنگترے دتی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب رنگتروں کی تکلیف کیا ضرور تھی۔ آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے۔ ان رنگتروں کی حُسن تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمایئے۔ اُسی وقت رباعی کہی اور سنائی۔"

اے منیر برجِ آسمانِ اقبال　　ان رنگتروں پر غور سے کیجیے گا خیال
یہ نذرِ فقیر ہو قبولِ خاطر　　پردہ میں شفق کے ہیں یہ گلرنگ ہلال

شاہ صاحب کی رباعیاں عموماً کسی واقعہ سے متعلق ہوتی تھیں اور انھیں میں وہ معنی آفرینی کے جوہر خوب خوب دکھاتے تھے۔ یہاں ان کی صرف دو۔ رباعیاں نمونہ کے طور پر نقل کی جاتی ہیں۔

کیا ابر بہار سے ہے گلشن سیراب　　دے بھر کے ہمیں ساغرِ گل میں بے ناب
فوارہ نہیں حوض میں چھوٹے ہے یہ　　ساقی تری تعظیم کو اٹھاہے آب

اور

کی کوکنی تو زور کس نے دیکھا　　اور قیس کا بن میں شور کس نے دیکھا
کرتا ہے جو کچھ کرینگے اُن کے در پر　　ناچا جنگل میں مور کس نے دیکھا

شاہ نصیر کے کلیات میں کچھ رباعیاں ایسی بھی موجود ہیں جن سے اخلاقیات کا درس ملتا ہے

لیکن وہ بھی کسی مخصوص واقعہ سے ہی متعلق معلوم ہوتی ہیں مثلاً۔

کیا جوہرِ بد ہے، جھوٹے انسان میں دیکھ　　منہ ڈال کے ٹک اپنے گریبان میں دیکھ
اے وعدہ فراموش بس اتنا ہے خلاف　　کذّاب کو کیا کہا ہے قرآن میں دیکھ

اور۔

جو اشک کہ آنکھوں سے جدا ہوتا ہے　　مژگاں تلک آیا کہ فنا ہوتا ہے
آنکھوں سے کسی کی کوئی یارب نہ گرے　　آنکھوں کا گرا بہت برا ہوتا ہے

3۔معروف

نواب الٰہی بخش خاں معروف نے بھی شاہ عالم سے بہادر شاہ تک کا زمانہ پایا تھا۔ انھوں نے زیادہ رُباعیاں نہیں کہی تھیں۔ان کی رباعیاں عموماً عشقیہ مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں۔ شاہ نصیر کی طرح ان کی رباعیوں کی زبان بھی صاف اور سلیس ہے مثلاً۔

فرقت میں تری جو ہم پہ دلبر گذری　　کیا تجھ سے کہوں کہ آہ کیونکر گذری
دل کو تو کبھو آہ کی تکلیف نہ دی　　جو کچھ گذری وہ اپنے جی پر گذری

4۔ذوق

شیخ محمد ابراہیم ذوق کی رباعیوں کے بارے میں امداد امام اثر نے لکھا ہے کہ:

''ذوق نے تو جو کچھ رباعیاں لکھی ہیں ان میں بادشاہِ وقت کی خوشامد کے سوا کوئی ایسا مضمون نہیں پایا جاتا ہے کہ جس کو اخلاق وتمدن، معاشرت، معاد، مذہب وغیرہ سے کسی طرح کا تعلق حاصل ہو۔''3

اپنے شاگرد، آقائے نعمت، حاکمِ وقت اور بادشاہ کی خوبیوں اور عمدہ کارکردگی کی تعریف کرنا کسی بھی اعتبار سے معیوب نہیں ہے۔ پھر یہ دعویٰ کہ ذوق کی رباعیوں میں ''خوشامد کے سوا'' کوئی مضمون نہیں پایا جاتا صریحاً غلط ہے۔دیوانِ ذوق میں آزاد نے لکھا ہے:

''رباعی مرقومہ ذیل دیوانِ مروّج ومطبوعہ میں مولفوں کی بے خبری سے درج ہوگئی تھی۔ الحمدللہ کہ جو اِس میں اصلاح ہوئی بندۂ آزاد کو یاد تھی۔ ایسی اصلاحیں ان کی ہمیشہ جاری تھیں۔

اے ذوق کرے گا کوئی دنیا کیا ترک　　دنیا ہے بُری بلا ارے کیسا ترک
کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دنیا　　جب تک نہ کرے آپ اُسے دنیا ترک

اس رباعی کے بارے میں آزاد نے مزید یہ بھی کہا ہے کہ:

''رباعی مرقومہ میں نے ایک دن استاد مرحوم کے سامنے پڑھی اور کہا کہ حضرت اس میں وہ گرمی اور تیزی اور صفائی نہیں جو آپ کی زبان کا جوہر ہے۔ فرمایا کاٹ دو۔ میں نے کہا مضمون تو بہت خوب ہے۔ فرمایا۔ رباعی کی بحر میں تو یہی ہوگا۔ اچھا قطعہ کر دیتے ہیں۔

دنیا میں ذوق رشتۂ الفت کو توڑ دے　　جس سر کا ہے یہ بال اُسی سر میں جوڑ دے
پر ذوق تو نہ چھوڑے گا اِس پیرزال کو　　یہ پیرزال گر تجھے چاہے تو چھوڑ دے''

دیکھنے کی بات ہے کہ اس قطعہ اور رباعی میں بادشاہ کی خوشامد تو درکنار، اُس کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔

ذوق نے کچھ رباعیاں عقیدہ اور عمل سے متعلق بھی کہی ہیں چنانچہ ایک یہ ہے۔

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال　　غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے ان کا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر　　نقل کرتا ہے مسلمان کی کافر نقال

اپنے آقائے نعمت کے لیے ذوق نے جو رباعیاں لکھی ہیں۔ ان میں سے بیشتر دعائیہ ہیں مثلاً۔

کہتا ہے یہ فیروزیِ رنگِ نوروز　　تو ہو صفِ اعدا پہ مقرر فیروز
ہو دشمنِ سرکش کے لیے سہم الموت　　اے شاہ عدو کش ترا تیرِ دلدوز

اور۔

شاہا تجھے بادولت و بختِ فیروز　　فرخ ہو سدا جہاں میں جشنِ نوروز
ہووے شرف اندوز ترے طالع سے　　ہر سال حمل میں مہرِ عالم افروز

یہ افسوس کی بات ہے کہ اکثر لوگوں نے دعا اور خوشامد کے فرق پر نظر نہیں کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شیخ ذوق مذہب پسند شخص تھے۔ ان کی رباعیاں عموماً ناصحانہ اور اخلاقی مضامین و مطالب پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں صرف دو نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہیں۔

جب تک تھے گرہ میں احمقوں کی پیسے　　سب کہتے تھے ان کو آپ ایسے ایسے

مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق　　پوچھا نہ کہ تھے وہ کون ایسے تیسے

اور۔

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھل کھل　　اب درد سے ہیں وہی رلاتے ہل ہل

پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے مزے　　اے ذوق بڑھاپے سے ہے دانتا کل کل

مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان ذوق کے زمانے میں بھی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ان سے متعلق ذوق کی یہ رباعی لائق توجہ ہے۔

کھلتا نہیں اے ذوق یہ ہم پر مضموں　　ہر شخص جو مذہب کا ہے اپنے مفتوں

کہیے کسے حق پہ اور باطل پہ کسے　　کُلُّ حِزبٍ بِّمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُون

اپنے مضامین ومفاہیم کے اعتبار سے شیخ محمد ابراہیم ذوق کی رباعیاں نہایت مفید اور کارآمد ہیں اور اسی لیے ان میں سے بعض زبانوں پر جاری ہو کر ضرب المثل کا درجہ بھی حاصل کر چکی ہیں۔

5۔غالب

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں مرزا اسداللہ خان غالب نے کچھ بہت زیادہ رباعیاں نہیں لکھی تھیں۔اس وقت کی ان کی تقریباً سبھی رباعیاں عشقیہ مضامین پر مشتمل ہیں مثلاً۔

آتش بازی ہے جیسے شبِ اطفال　　ہے سوزِ جگر کا بھی اُسی طور کا حال

تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی　　لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

ایک رباعی میں وہ اپنی شعر گوئی کے بارے میں کہتے ہیں۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ایک اور رباعی مرزا غالب کے اس زمانے کے طرزِ خاص میں یہ ہے۔

گلخن شرر اہتمامِ بستر ہے آج　　یعنی تپِ عشق شعلہ پرور ہے آج

ہوں درد ہلاک نامہ بر سے بیمار　　قارورہ مرا خونِ کبوتر ہے آج

6۔مومن

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے مومن کی رباعیوں کے سلسلے میں اس طرح رائے ظاہر کی ہے:

''دیوانِ مومن مرتبۂ ضیا بدایونی میں مومن کی اکتیس رباعیاں شامل ہیں مگر مومن نے اس سے بھی زیادہ رباعیاں کہی ہیں۔ کلیاتِ مومن مرتبۂ ڈاکٹر عبادت بریلوی میں ایک سو انتیس رباعیاں موجود ہیں.....''5

مومن کو رباعی گوئی سے خاص شغف تھا۔ ان کی بہت سی رباعیاں اردو ادب کے خزانے میں دُرِ یکتا کی حیثیت رکھتی ہیں خصوصاً وہ رباعیاں جو عشقیہ ہیں۔ ان کی لطافت اور سوز و گداز میں کوئی شک و شبہ نہیں.....انھوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔''

مومن کی دو عشقیہ رباعیاں نمونہ کے طور پر یہاں درج کی جاتی ہیں۔

تھا ہم سے بھی ربط بے وفا یا کہ نہ تھا　　ایسے ہوئے کچھ کبھی بھی گویا کہ نہ تھا
یاروں میں تمھارے ہم تھے یا کہ نہ تھے　　دیکھو تو اِدھر کو، کبھی کچھ تھا کہ نہ تھا

اور۔

جب سے وہ گئے اُدھر، نہیں یاد کیا　　بھیجی نہیں کچھ خبر، نہیں یاد کیا
ہم یاد میں جس کی آہ سب کچھ بھولے　　اُس نے ہمیں بھول کر نہیں یاد کیا

زمانے کی روش پر نظر کر کے مومن نے بعض رباعیاں سبق آموز بھی کہی ہیں چنانچہ ایک یہ ہے۔

ہے عہدِ شباب زندگانی کا مزا　　پیری میں کہاں وہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا　　باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا

کچھ رباعیوں میں حکیم مومن خان نے اپنی زندگی کے تجربوں کو بھی نظم کیا ہے۔ مثلاً۔

کیا گوشۂ خفا میں، انجمن میں بھی تو تھا　　کیا دشت کہ تنگ دل چمن میں بھی تو تھا
کچھ اور انھیں سفر میں ایذا لیکن　　اک درد دل میں، سو وطن میں بھی تو تھا

چند رباعیاں عقیدے اور عمل سے متعلق بھی مومن نے کہی ہیں مثلاً ''اولادِ نبیؐ'' کی مظلومیت کو نظم کیا ہے۔ مومن کے عقیدے کے اس پہلو کی طرف معمولاً توجہ کم کی گئی ہے۔ اس

سلسلے کی دو رباعیاں یہ ہیں۔

ہنگامۂ حشر جب کہ برپا ہوگا　　یوں روے سوال، سوے اعدا ہوگا
اولاد نبیؐ پہ ظلم کیا کیا نہ کیے　　سمجھے نہ یہ تم کہ ہم پہ کیا کیا ہوگا

اور ۔

روشن ہے جو ہے آل عبا کا پایہ　　ہاں مرتبۂ تسلیم ورضا کا پایہ
قندیل ہے عرش کی جو ہر جانِ شہید　　کیا ہوگا شاہِ شہدا کا پایہ

رباعیوں کے علاوہ حکیم محمد مومن خاں مومن نے چند مستزاد بھی لکھے ہیں اور اس طرح بھی صنفِ رباعی پر انھوں نے اپنی حاکمانہ قدرت کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ دو مستزاد یہ ہیں۔

گہہ دین میں تھا لقب یگانہ اپنا　　تھے بت سے خفا
گاہے صنموں کو ہم نے جانا اپنا　　اللہ رے خطا
سب دیر وحرم کی خاک چھانی مومن　　کیا خاک کہیں
دیکھا تو کہیں نہیں ٹھکانا اپنا　　جی بیٹھ گیا

مستزاد رباعی دیگر۔

مومن دل سامکان جو برباد دیا　　مانندِ حباب
ان سنگ دلوں کو دیکے کیا خاک لیا　　جُز رنج وعذاب
یعنی وہ مکاں کہ تھا خدا کا مسکن　　کرنذر بتاں
برباد کیا اسے یہ کیا کام کیا　　اے خانہ خراب

رباعی کے موضوع میں مومن کے یہاں جو تنوع ملتا ہے ان کے معاصرین میں شاید کسی کے یہاں بھی نہیں ہے دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہر رباعی میں مومن کی طبیعت کا اصل انداز نمایاں ہے۔ زبان اور بیان کے اعتبار سے بھی ان کی رباعیوں کا معیار بہت بلند ہے۔

(ط) قطعات

غزل، قصیدہ وغیرہ مختلف شعری اصناف میں قطعہ بند اشعار شامل کرنے کی روایت پہلے سے چلی آتی تھی۔ شاہ نصیر اور ان کے معاصرین اور تلامذہ نے اس روایت کو شعوری طور پر مستحکم کیا۔ بعض شاعروں نے دو یا زائد شعروں پر مشتمل قطعے الگ سے بھی لکھنے شروع کر دیے۔ شدہ شدہ قطعہ نے ایک علاحدہ صنفِ سخن کا درجہ حاصل کر لیا۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں بعض طویل اور بہت اچھے قطعے لکھے گئے تھے۔

1۔ احسان

حافظ عبدالرحمان خاں احسان کے دیوان میں جو قطعے ہیں عام طور سے، غزل کے طور پر ہیں یعنی بظاہر ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل اور بامعنی ہے اور دوسرے سے برائے نام سا ربط معلوم ہوتا ہے۔ بیشتر قطعے بہت طویل نہیں ہیں۔ بعض تو صرف دو شعروں پر مشتمل ہیں مثلاً۔

دکھایا زلف کا عالم تو بس میرا یہ عالم ہے — اساسِ صبر برہم ہے بنائے عقل درہم ہے
نہیں ہے تری زیرِ نگینِ تاجداراں بھی — اگر شاہِ جہاں یاں ہے برائے نام خرم ہے

احسان کا ایک نسبتاً طویل قطعہ اس طرح ہے۔

ہوں فضل حق سے وہ دُرِ یکتائے بحرِ فضل — افضل سمجھ کے ہیں مرے طالب شہ و گدا

ایسا ہوں میں یگانۂ آفاق، ہاں نہیں　　مجھ سا تو اس سرائے میں دوسرا
طوطی ہند کہوے ہے جگ جگ تو جی یہاں　　کہتی ہے اوج بلبلِ آمل کہ مرحبا
احسانِ ملک محسنِ طبعِ رسا ہوں میں　　ٹھہرا ہوں نارسائی طالع سے نارسا
اب تو نسب کو سُن کہ مرا جد ہے بالیقیں　　عمِ رسولؐ حضرتِ عباسؓ باخدا
لیکن ہوں تیرے سامنے بے قدر اِس قدر　　تیرا نہیں قصور، مری ہے یہی سزا

جرم منست پیشِ تو گر قدرِ من کم است
خود کردہ ام پسند خریدارِ خویش را

2۔ نصیر

شاہ نصیر نے اپنی غزلوں میں کبھی کبھی دو دو، تین تین قطعے بھی شامل کیے ہیں اور ان کا ذکر ان کی غزلوں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو میں قطعات لکھنے کو رواج دینے والوں میں شاہ نصیر کو خصوصیت حاصل ہے۔ ان کے کلیات کے آخر میں چند قطعے الگ سے لکھے ہوئے ہیں۔ یہاں ان میں سے دو نقل کیے جاتے ہیں ۔

برقعے میں نہیں ہے اس کے جالی　　تک دیدۂ غور سے تو جھانکو
کھینچے ہے وہ شوخ جنتری میں　　تارِ رگِ جانِ عاشقاں کو

قطعہ دیگر ۔

معجون کو نام رکھ نہ اے شیخ　　آگاہ نہیں تو خوب اس سے
کھا دیکھ ذرا، ابھی کھلے ہیں　　معنی مفرّح القلوب اس سے

عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرہ ''قطعۂ منتخب'' میں شاہ نصیر کے دس قطعے نقل کیے ہیں۔ اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے قطعات بعد تک بھی نہایت مقبول رہے تھے۔

3۔ ذوق

شیخ محمد ابراہیم ذوق کے دیوان میں قطعات زیادہ نہیں ہیں لیکن جو ہیں اپنے موضوع کے اعتبار سے ان میں تنوع موجود ہے۔ ذیل کا قطعہ ''خلعت ولی عہدی'' کے عطا ہونے کے موقع پر کہا گیا ہے ۔

دعا ہے ذوق کی، ہو خلعتِ ولی عہدی　　مبارک آپ کو با آفتابی و کرسی
یہ آفتابی و کرسی خدا کرے فرخ　　بحقِ سورۂ والشمس و آیۃ الکرسی

اپنے عقیدے سے متعلق ذوق نے ایک قطعہ کہا ہے۔

دل سے میں اپنے رسولِ عربی کا ہوں غلام　　دل کہو، جان کہو، جانے ہیں اس بات کو سب
میں حضوری میں رہوں اس کی نہ کس طرح مدام　　ہے یہ مشہور مثل، مالِ عرب پیشِ عرب

ایک قطعہ آزاد نے اس تمہید کے ساتھ نقل کیا ہے۔

''ایک دوست کا چند اشخاص سے کچھ تنازعہ تھا۔ استاد کے مزاج میں سلامت روی اور صلح جوئی بہت تھی۔ دوست کو مجبور کر کے صلح کرادی اور اس قطعہ سے اس کی بھی دل جوئی فرمائی۔ گویا اس کی زبانی کہتے ہیں۔

ناصحا مجھ کو ملامت تو نہ کر　　کس طرح میں عشق سے بیزار ہوں
بسکہ مجھ کو عشق بازی کا ہے ذوق　　کیا کروں میں ذوق سے ناچار ہوں [1]

ذوق کی طبیعت مذہب پسند تھی۔ اِس لیے انھوں نے قطعوں میں بھی اسی قسم کے مضامین نظم کیے ہیں۔ ایک قطعہ اِس طرح ہے۔

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہائے رنگا رنگ ہم　　مثلِ نرگس جب تلک ہے اس چمن میں چشم وا
آخرش ہوگا وہی اک دن خزاں کے ہاتھ سے　　جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا
ہے غنیمت کوئی دَم نظارۂ رنگِ بہار　　پھر کہاں یہ گلشن اور گل اور سبزہ یہ ہوا

درعدم بودیم و دیگر درعدم خواہیم رفت
ایں تماشائے جہاں رامفت می بینیم ما

شیخ ذوق کا ایک اور قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

کل ایک تارکِ دنیا سے میں نے پوچھا ذوق　　کہ تو اُکھڑ کے اُدھر سے اِدھر ہُوا پیوست

اِس قطعہ میں کُل تیرہ شعر ہیں۔ ان میں سے آخری شعر یہ ہیں۔

کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ　　گیا زباں سے نکل اس کی جیسے تیر از شست
کہ کرد قطعِ تعلق کدام شد آزاد　　بریدۂ زہمہ، باخدا گرفتار است

عبدالغفور خاں نساخ نے اس قطعہ کے علاوہ ذوق کے نو قطعے اور بھی اپنے تذکرہ ''قطعۂ منتخب'' میں درج کیے ہیں۔

ذوق کا سب سے مشہور قطعہ وہ ہے جس کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے۔

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب، ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ اوبے مہر، بداختر کمینے

اس کے بعد آسمان کے مظالم کا شکوہ کئی شعروں میں نظم کیا ہے اور پھر۔

کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سورہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جاں کنی نے

نوبت بہ ایں جا رسید کہ۔

لگے پانی چُوانے منہ میں آنسو — پڑھی یٰسین سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے

اور پھر۔

بشارت مجھ کو صبحِ وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یُمن، دلفرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہوکر کہا خود یہ خوشی نے

موذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

اس قطعہ کا آخری شعر تو ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اور بھی بیشتر شعر ایسے بیساختہ ہیں کہ مدتوں زبانوں پر جاری رہے۔

ذوق کے قطعوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر شعر دوسرے سے پوری طرح مربوط ہے گویا پورے قطعے کا مضمون پہلے سے شاعر کے ذہن میں موجود ہوتا ہے اور اس میں بھرتی کے شعر لاکر قطعے کو طول دینے کی کوشش نہیں ہوتی ہے۔

4۔غالب

مرزا اسداللہ خاں غالب کے قطعات کے بارے میں امداد امام اثر نے تحریر کیا ہے کہ:

''جتنے قطعات دیوانِ غالب میں موجود ہیں کسی مسئلہ علمی سے علاقہ نہیں رکھتے۔''[2]

لیکن حقیقت صرف یہ ہے کہ غالب نے اکبر شاہ ثانی کے عہد میں بعض قطعہ بند اشعار اپنی غزلوں میں ضرور شامل کیے تھے لیکن الگ سے کوئی قطعہ غالباً نہیں کہا تھا۔ایک ضعیف روایت کا سہارا لے کر ان سے دو قطعے البتہ منسوب کیے گئے ہیں لیکن جب تک کوئی قابلِ قبول شہادت دستیاب نہ ہو جائے ان کو غالب کے کلام میں شامل کرنا مناسب نہیں ہے۔قطعہ بند اشعار کی جو غالب کی غزلوں میں شامل ہیں دو مثالیں یہ ہیں۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ۔۔۔ ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے اِتنی ۔۔۔ ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید ۔۔۔ جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

اور دوسری مثال یہ ہے۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ۔۔۔ زنہار اگر تمھیں ہوسِ نَاؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔۔۔ میری سنو، جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ۔۔۔ مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ۔۔۔ دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ ۔۔۔ یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں ۔۔۔ نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۔۔۔ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یہ دوسرا قطعہ اپنے مطالب کے اعتبار سے قابلِ ستائش ہے۔

5۔مومن

حکیم محمد مومن خاں مومن کے دیوان میں قطعات کے لیے ''مقطعات'' کا لفظ آیا ہے لیکن مقطع کی اصطلاح کا مفہوم مختلف طور پر متعین ہے اس لیے جلدی ہی اس نئے معنی میں وہ متروک

ہوئی اور ''قطعہ'' کی اصطلاح رائج ہوگئی۔ مومن نے چھوٹے بڑے کئی قطعے لکھے تھے لیکن وہ سب ہی عشقیہ ہیں، اوران میں شگفتگی اور شوخی کا عنصر نمایاں ہے مثلاً۔

جب کہا میں نے کہ تم بیداد گر، نا آشنا　　بے مروّت، بیوفا، بیگانۂ احباب ہو
ہنس کے فرمایا کہ میں تو خیر جو کچھ ہوں سو ہوں　　تم بھی تو بے چین ہو بے صبر ہو، بیتاب ہو

ایک قطعہ میں اپنے سمھوان جانے کا احوال اس طرح بیان کیا ہے۔

صاحبو میرا حال مت پوچھو　　بندۂ سخت بے وفاہوں میں
چھوڑدلّی کو سمھوان آیا　　ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
عذر بیجا ہے سرکشی کے لیے　　شاکی بے سبب جفاہوں میں
یک خداوندِ شوخ کے غم میں　　قابلِ رحم ہوگیا ہوں میں
مجھے پہنچادو میرے صاحب تک　　کہ غلامِ گریز پاہوں میں

اسی طور پر اور دو قطعوں میں شاعر نے اپنے حالِ زار کو نظم کیا ہے۔ پہلا قطعہ اس طرح شروع کیا ہے۔

وہ نوجوان عابد وزاہد کہ سب جسے　　کہتے تھے مومن اور بہت دیندار تھا
کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں　　جو تھا سو اُس کو دیکھ کے زار ونزار تھا
عبرت کی جاہے یوں صنموں نے کیا خراب　　ملنے سے جن کے معتقدِ ننگ وعار تھا
بیمار کردیا شبِ ہجراں نے آہ　　کیا ہوگئے وہ روز کہ پرہیز گار تھا

اس تمہید کے بعد اس بیمار کے حالِ زار کی تفصیلات نظم کی ہیں اور پھر کہتے ہیں۔

جنبش بھی تھی محال، تڑپنا تو اک طرف　　کاہیدہ جسم ضعف سے کوہِ وقار تھا
ہوخود ہی بے حواس تو احوالِ دردِ دل　　کس سے کہے خبر ہی نہیں کون یار تھا

اوران شعروں پر قطعہ کو ختم کیا ہے۔

اور اک یہ شعر شعلہ فشاں وزبانہ زن　　بُتخانہ ریزکام دوہاں بار بار تھا
آغاز کار عشق میں انجام کار تھا　　میں کیوں فنا سے ہستیِ بے اعتبار تھا

دوسرے قطعہ میں حکیم مومن خاں مومن نے طب اور معالجہ کے متعدد معاملات نظم کیے

ہیں۔اس کے شروع کے اشعار یہ ہیں۔

مواجاتا ہوں میں، اب جی میں ہے، اُس بیدرد کو لکھوں
کہ مجھ کو تختۂ مشقِ اطبا کیوں بنایا ہے

نہ یہ سمجھیں سبب، نے کچھ علامت سے مرض پاویں
سڑی ہیں آپ ، مالنخولیا مجھ کو بتایا ہے

تمہید کے شعروں کے بعد اطبا کی طرح طرح کی تشخیص کا حال شاعر نے بیان کیا ہے۔بعض باتیں یہ ہیں۔

کوئی کہتا ہے یہ سکتا ہے نظروں میں ہماری تو
کئی بار احمقوں نے لاکے آئینہ دکھایا ہے

کسی کو کم غذائی سے گماں ہے ناتوانی کا
تو کہتا ہے کہ جلدی لاوگر کچھ بھی پکایا ہے

کوئی کہتا ہے روغن دیجیے بادامِ مقشر کا
یہ نکتا مرتے دم استاد نے مجھکو بتایا ہے

مگر عم فلاطوں منزلت میرے یہ کہتے ہیں
مرض وہ ہی ہے لیکن شرم کے مارے چھپایا ہے

اس قسم کی متعدد اور مختلف تشخیصوں کے بیان کے بعد اس قطعہ کو شاعر نے ان شعروں پر ختم کیا ہے۔

نہ کیونکر امتلائے معدہ ہو محسوس اک مدت
غمِ فرقت تری دوری میں کس کثرت سے کھایا ہے

غرض آخک کہ میں بچ جاؤں اور مرجائے بن آئے
مسیحا دردِ حسرت سے کہ کیا مُردہ جلایا ہے

اس قطعہ میں شاعر نے علم طب میں اپنی مہارت کا اظہار کیا ہے۔زبان، بیان اور مضامین میں ربط و تسلسل کے اعتبار سے مومن کے یہ سبھی قطعے لائقِ تحسین ہیں۔

(ی) تضمین

تضمین کی صورتیں کئی ہیں۔ کبھی اپنے، کبھی کسی دوسرے شاعر کے ایک مصرعے، ایک شعر یا پورے قطعے یا غزل کے ہر شعر پر دو، تین، چار یا زائد مصرعے لگا کر مثلث، مربع، مخمس، مسدس وغیرہ بناتے ہیں۔ جب ایک ہی مصرع یا شعر پر طرح طرح سے مصرعے لگا کر کئی بند مکمل کرتے ہیں تو ترجیع بند وجود میں آتا ہے۔ بصورتِ دیگر وہ ترکیب بند ہو جاتا ہے۔ بعض شاعروں نے زیرِ تضمین مصرع یا شعر کے بعد بھی مصرعے لگائے ہیں اور اپنی جدتِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن یہ صورت دقت طلب ہونے کی وجہ سے عام نہیں ہے۔

تضمین سے مقصود عموماً اپنی قوتِ مشق کا اظہار ہوتا ہے لیکن اکثر محبت، عقیدت اور تعلقِ خاطر کو ظاہر کرنے کے لیے بھی تضمین کی گئی ہیں۔ مقصود جو بھی ہو، نتیجہ یہی ہے کہ اس سے شاعر کی قدرتِ کلام اور زورِ بیان کا پتہ چلتا ہے اس لیے اساتذہ نے لزوم مالا یلزم کی قبیل سے خود پر بعض قیدیں عائد کر لی تھیں مثلاً کسی شعر پر تین مصرع اس طرح لگاتے تھے کہ مضمون کے اعتبار سے پانچوں میں تسلسل ہو اور پہلے دوسرے، اور تیسرے مصرعے کو اگر الگ الگ پانچویں مصرعے سے ربط دیں تو ہر ایک جدا شعر معلوم ہو۔

1۔احسان

حافظ عبدالرحمان خاں احسان بڑے قادرالکلام استادوں میں سے تھے۔انھوں نے تضمین کے لیے جدّت کی ایک صورت یہ نکالی کہ اردو کی غزل پر فارسی زبان میں مصرعے لگائے۔ان کے دیوان میں درج ذیل عنوان سے ایک خمسہ ملتا ہے:

''مخمس فارسی بر غزلِ ریختہ الٰہی بخش معروف ؎

بُرد ہندی بُتے زجا مارا　　کشت آں شوخ دلربا مارا
گفت در ہندی از ادا مارا　　آہ وہ کون تھا خدا مارا
جس نے اس سے مجھے لگا مارا

کچھ شک نہیں کہ ردیف کے استعمال میں شاعر نے زبان دانی کا حق ادا کر دیا ہے۔

2۔نصیر

شاہ نصیر کی قادرالکلامی تو مشہور ہے۔ان کے کلیات میں کئی مخمس، مسدّس وغیرہ ہیں لیکن سب مدحیہ ہیں۔انھوں نے فارسی کے ایک شعر پر مصرعے لگا کر ایک ترجیع بند لکھا ہے جس کا عنوان ہے:

''مسدّس در حمدِ باری تعالیٰ''

اس مسدّس کا پہلا اور آخری بند درج ذیل ہے:

نہ بہر یار تو ہر شب فغان وغوغا کن　　نہ ہر سحر پے وصلش تلاشِ بیجا کن
برائے دیدنِ او قلب را مصفا کن　　مثالِ آئینہ غافل تو چشمِ دل وا کن
جمالِ اوست بہر شش جہت تماشا کن
خدا نقاب نہ دارد تو دیدہ پیدا کن

سخن کو طول نہ دے بس خموش باش نصیر　　نہ ہوگی لکھنے سے محصور وسعتِ تحریر
مثالِ آئینہ پیدا کر اب صفائے ضمیر　　ہر ایک ذرّے میں چمکے ہے مہرِ پُرتنویر
جمالِ اوست بہر شش جہت تماشا کن
خدا نقاب نہ دارد تو دیدہ پیدا کن

کلیاتِ شاہ نصیر میں ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں اس عنوان سے درج ہے:

''مخمس بر غزلِ نکہت شاعر''

اس کا بھی صرف پہلا اور آخری بند لکھا جاتا ہے:

رکھتا نہیں نیام میں یہ کینہ دار تیغ　　کھینچے ہے کہکشاں سے سر آبدار تیغ
کھاتا ہوں دستِ چرخ سے لیل و نہار تیغ　　چمکا رہا ہے برق کی ابر بہار تیغ
دکھلائے ہے مجھے چمن روزگار تیغ

نکہت کی ہو پذیر یہ گفتار اے نصیر　　شاگرد ہے ترا وہ خوش اطوار اے نصیر
طولِ سخن ہے موجبِ آزار اے نصیر　　کر مختصر درازیِ اشعار اے نصیر
رکھ دے قلم کی ہاتھ سے معنی نگار تیغ

3۔ ممنون

میر نظام الدین ممنون بھی شاہ نصیر کے ہم عصر تھے اور بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے بھی بڑی کامیابی سے بعض شاعروں کے کلام کو تضمین کیا ہے۔ حافظ شیرازی کی ایک فارسی غزل کے ممنون کے خمسہ کا پہلا اور آخری بند یہاں نمونہ کے طور پر لکھا جاتا ہے:

چوں سالِ جشنِ شہنشاہِ عیش کوش آمد　　بہ جنبش است رگِ ساز و نے بجوش آمد
ترانۂ غول و صوت نے بگوش آمد　　صبا بہ تہنیتِ پیرِ مے فروش آمد
کہ موسمِ طربِ و بانگ ناوٗنوش آمد

نشاط دیکھے ہے اب بے حساب وحد حافظ　　نہ رکھے جام پہ ممنون دستِ رد حافظ
سمجھتا صحبت زاہد ہے آج بد حافظ　　زخانقاہ بہ میخانہ می رود حافظ
مگر زمستی زہد دریابہ ہوش آمد

4۔ معروف

نواب الٰہی بخش خاں معروف کو خمسے کہنے کا شوق تھا۔ ان کے دیوان میں کئی اچھے خمسے ہیں۔ دو تین خمسوں کے دو دو بند نمونہ کے طور پر یہاں لکھے جاتے ہیں:

(1) ''مخمس بر غزل سید نظام الدین صاحب المتخلص بہ ممنون''

ہے دادخواہ تجھ سے وفا اور وفا سے ہم　　راضی ہے تیری خو سے جفا اور جفا سے ہم
کیا لگ چلی ہے تجھ سے ہَوا اور ہوا سے ہم　　نکہت کو تجھ سے لے ہے صبا اور صبا سے ہم
لے عطر تیرے تن سے قبا اور قبا سے ہم

کرنی ہے ہم کو عمر بسر راہِ عشق میں　　ہے کس کو جان و تن کی خبر راہِ عشق میں
یعنی گئے ہیں سر سے گذر راہ عشق میں　　دینا ہر ایک گام پہ سر راہِ عشق میں
الفت سے سیکھتی ہے وفا اور وفا سے ہم

(2) ''مخمس بر غزل شیخ محمد ابراہیم المتخلص بہ ذوق''

جو کوئی عاشق بتِ سفاک پر ہو جائے ہے　　خنجر بیداد سے آخر شہادت پائے ہے
لیکن ایسی موت بھی ہر ایک کو کب ہاتھ آئے ہے　　سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کے جائے ہے

میں پڑا ہوں قید میں اور موسمِ گل آئے ہے　　شوق کی موج صبا بیتابیاں دکھلائے ہے
سخت تنگ آیا ہوں بیٹھے بیٹھے جی گھبرائے ہے　　رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوار مرا کھجلائے ہے۔

(3) ''مخمس بر غزل اسداللہ خاں المتخلص بہ اسد''

جی سے گذریں گے ترے در پہ گذر ہونے تک　　مر ہی جاویں گے ترے کوچے میں گھر ہونے تک
ہے یہ جنجال ہمیں عمر بسر ہونے تک　　آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

پوچھ دریائے محبت کے نہ مجھ سے نیرنگ　　ہے حباب اور ہَوا صورتِ ربطِ سر و سنگ
کیا کرے اس میں شنا کا کوئی غوّاص آہنگ　　دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

امتیاز علی خاں عرشی نے غالب کی اس غزل کی ردیف میں ''ہوتے'' بتادیا ہے۔ معروف کے اس خمسے میں ''ہونے'' ہی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اعظم علی خاں اعظم کے دیوان میں بھی ایک غزل اسی طرح میں ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

پڑ گیا داغ رخِ مہ میں قمر ہونے تک　　لگ گیا عیب بڑا اہلِ ہنر ہونے تک

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے کی غالب کی کوئی تضمین نہیں مل سکی ہے۔

5۔ذوق

شیخ محمد ابراہیم ذوق کے دیوان میں ایک "مخمس در مدح" ہے۔اس کے دو بند یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

خسروا چڑھ کے سرِ گنبدِ دوّار ہلال　　خود لب عجز سے کرتا ہے یہ اقرار ہلال

حاضر خدمت عالی ہے بہر کار ہلال　　گرز بردار ہے خورشید، کماندار ہلال

آسمان لے کے سپر چلتا ہے تلوار ہلال

ذوق کرتا ہے سخن تیری دعا پر کوتاہ　　عید ہر سال ہو فرخ تجھے باحشمت وجاہ

تیری دولت سے ہوں خورسند ترے دولت خواہ　　اور جو حاسد ہیں ترے واسطے ان کے ہر ماہ

چرخ پر تیز کرے خنجر خونخوار ہلال

شیخ ذوق بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ان کے کلیات میں تضمین کی ہر قسم کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ایک واقعہ مولانا محمد حسین آزاد نے اس طرح نقل کیا ہے:

"(معروف کے یہاں ایک) سوداگر آیا اور اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ان میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی۔وہ پسند آئی۔خم دم، آبداری اور جوہر دیکھ کر تعریف کی اور میری (ذوق کی) طرف دیکھ کر کہا۔

اِس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار کا

میں نے اُسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخلِ غزل کیا۔بہت خوش ہوئے۔

سر لگا دیں ابروئے خمدار کی قیمت میں آج　　اِس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار کا"[1]

اسی قسم کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ:

"ایک دن (ذوق) بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔تیر ہمیشہ، تصویر ہمیشہ۔(مجھ آزاد سے) کہنے لگے تم بھی تو کچھ کہو۔میں نے کہا کیا عرض کروں۔فرمایا، میاں اسی طرح آتا ہے، ہوں ہاں، غوں غاں کچھ تو کہو۔میں نے کہا۔

سینہ سے لگائے تیری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کر کے کہا، ہاں درست ہے۔

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ" 2

تضمین کی ایک اور صورت درج ذیل اقتباس میں سامنے آتی ہے:

"(ذوق) قصیدہ لکھ رہے تھے۔ مطلع تھا۔

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

.....دو تین دفعہ فرمایا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں موقع سے تضمین کریں گے۔

مئے دوسالہ ومحبوب چاردہ سالہ ہمیں بس است صحبتِ صغیر وکبیر

ایک دن جو میں (آزاد) گیا.....سناتے سناتے پھر شعر مذکور پڑھا۔ بعد اس کے قطعہ پڑھا کہ خود کہا تھا۔

ہُوا ہے مدرسہ بھی درسگاہِ عیش ونشاط کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر

اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبرا نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر وکبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اب بھی؟ میں نے عرض کی: سبحان اللہ اب اس کی کیا ضرورت رہی۔" 3

ان متفرق واقعات کے علاوہ تضمین کی بعض مثالیں آزاد نے اور بھی آبِ حیات میں درج کی ہیں۔ یہاں طوالت کے خوف سے اُن کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

6۔ ظفر

مرزا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تخلص کے کلیات میں مثلث، مربع، مخمس، مسدس وغیرہ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں تضمین کی مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یہاں پہلے دیوان سے صرف ایک مثلث کے کچھ بند مثالاً نقل کیے جاتے ہیں۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا

اس خرد نے مجھے سرگشتہ وحیران کیا کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا

تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

دل کو میرے خم و خمخانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

اس سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد نے جو لکھا ہے وہ بھی توجہ طلب ہے:

''والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمھارا زمین کا بادشاہ ہے۔ طرحیں خوب نکالتا ہے مگر تم سرسبز کرتے ہو ورنہ شورزار ہو جائے۔ مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف و قافیہ معلوم ہو جاتا تھا، باقی بخیر۔ یہ (ذوق) اُن ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حُسن و عشق کی پُتلیاں بنا دیتے تھے۔''4

جو بھی ہو بصورتِ موجودہ وہ سب اب ظفر کا کلام ہے اور اُس کو اسی نظر سے دیکھا جانا چاہیے۔

۷۔ مومن

حکیم محمد مومن خاں مومن کے دیوان میں مختلف قسم کی تضمینوں کی مثالیں موجود ہیں۔ پہلی کا عنوان اس طرح ہے۔

(1) ''مثلث بر غزل مولانا عرفی شیرازی''

اس مثلث کے دو تین بند یہ ہیں:

منظور ہے کچھ اور کہ اشک آنکھوں سے چلے من خود کنم کہ گریہ بحالم کنی دلے

می زہدت برزگس شہلا گریستن

لاکھوں تباہ حال ہیں، ہے اشکبار ایک ہر کس کہ ہست گریہ بحالش رواست لیک

نتواں بہ عالمے تن و تنہا گریستن

مومن یہ کہہ دے جا کے کہ ہے گریہ دل پہ شاق عرفی زگریہ دست نہ داری کہ در فراق

وردت زدل نمیرد الّا گریستن

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر شعر سے پہلے شاعر نے ایک مصرع لگا کر مثلث بنایا ہے۔

(2) دوسری مثال جو درج ذیل ہے اس میں ہر شعر سے پہلے تین تین مصرعے لگا کر اُسے مخمس بنا دیا ہے۔ اس کا عنوان اِس طرح قائم کیا گیا ہے:

"تخمیس غزل خواجہ حافظ علیہ الرحمتہ"

جی گیا مفت میں حاصل نہ ہوئی ہائے مراد　　کیوں نہ ہو نیش زنِ دل گلہ ہائے جلاد

شوخیاں ہیں قلقِ بسملِ مضطر سے زیاد　　از سرِ کشتۂ خودی گذرد ہمچوں باد

چہ تواں کرد کہ عمرست دشتابے دارد

ایک دشمن ہے یہ مومن کو خدا دفع کرے　　بختِ بدخواہ عزیزاں ہے کہیں جلدی مرے

اس سے کہتا ہے کہ خاموش ہو یا آہ بھرے　　کے کند سوے دلِ خستۂ حافظ نظرے

چشم مستت کہ بہر گوشہ خرابے دارد

(3) اب ایک مصرع کی تضمین کی مثال نقل کی جاتی ہے کہ اِس طرح ترجیع بند وجود پاتا ہے۔ اس کا عنوان اِس طرح ہے:

"تضمینِ مصرع خواجہ حافظ بہ طریق تخمیس"

کس کے گھر رات تو اے غیرتِ مہتاب رہا　　کون سا بیدہ سرکام ہوس یاب رہا

بسترِ خواب نہ تھا ہائے کہ بیخواب رہا　　نیند آئی نہ نزاکت سے جو بیتاب رہا

خواب ایں نرگس فتاں تو بے چیزے نیست

شب کسی نے تجھے مہمان بلایا ہوگا　　بیٹھ کر پاس عجب لطف اٹھایا ہوگا

ہوس آلودہ نے کیا کیا نہ ستایا ہوگا　　بختِ بیدار نے دشمن کے جگایا ہوگا

خواب ایں نرگسِ فتاں تو بے چیزے نیست

کیا شبِ ہجر عذابِ دلِ مضطر نہ سہا　　ایک دریا تھا کہ بس دیدۂ حافظ سے بہا

صبح دیکھا اُسے مخمور، تو حسرت سے کہا　　اے بت افسوس تو مومن سے ہم آغوش رہا

خواب ایں نرگسِ فتاں تو بے چیزے نیست

(4) اس کے بعد "مخمس بر غزل قدسی در نعت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم" ہے اور یہ خمسۂ نعتیہ کی مثال ہے۔ اس کے دو بند یہ ہیں۔

ہوں تو عاشق مگر اطلاق یہ ہے بے ادبی　　میں غلام اور وہ صاحب، میں اُمّت وہ نبیؐ
یا نبیؐ یک نگہِ لطف بہ اُمّی وأبی　　مرحبا سیّدِ مکّی مدنی العربی
دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

مظہرِ نورِ خدا شکل ہے محسود صنم　　محو تیرے ملک وحور وپری آدم
کیا ہی عالم ہے کہ تصویر ہی کا سا عالم　　منِ بیدل بہ جمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی

تضمین کی خوبی یہ سمجھی گئی ہے کہ جس کلام یا فقرے کو تضمین کیا جائے اس کے مفہوم کی پوری طرح نہ صرف وضاحت ہو جائے بلکہ اُس کے مفہوم میں وسعت بھی پیدا ہو جائے۔ مومن کی تضمینوں پر نظر کریں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اس عمل کے معیار کو بلند تر کر کے اُسے فن کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ وہ جس شعر یا مصرعہ کو تضمین کرتے ہیں اُس کے مزاج اور معیار کے مطابق اس پر مصرعے لگا دیتے ہیں۔ ان کے لگائے ہوئے مصرعوں میں عموماً بے ساختگی کا وصف بھی پایا جاتا ہے جو کمیاب ہے۔

(ک) تاریخ گوئی

شاہ عالم ثانی کے عہد تک تاریخ گوئی کا خاصا چلن ہو گیا تھا۔ اکبر شاہ ثانی کے دور میں اس فن نے اور بھی ترقی کی۔ بعض شاعروں نے تاریخ گوئی کے لیے نام حاصل کیا اور وہ اِس فن میں نئی نئی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کرنے لگے۔ کچھ تاریخیں تو ایسی بے ساختہ کہی گئی ہیں کہ سننے والے منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

1۔ احسان

اگلے زمانے کے شاعر تھے۔ کوئی قابلِ ذکر واقعہ سامنے آتا تو اس کے لیے تاریخ کہہ دیتے تھے۔

ایک قطعہ یہ ہے ؎

حامد علی پھکیت پھکیتوں کا اوستاد
وہ نزع میں فرشتوں کے بھی سامنے ہوا

جیتا نہ جب اجل سے بھی اور اپنی جان دی
تاریخ دوں ہی میں نے کہی رحمتِ خدا

1253ھ

سیدھی سادی تاریخ ہے جس میں نہ تعمیہ کی ضرورت پڑی، نہ تخرجہ کی۔ نہایت بے ساختہ اور موقع محل کے مناسب ہے۔ احسان کی بیشتر تاریخوں کا انداز یہی ہے۔

2۔ممنون

میر ممنون بھی کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر تھے۔ان کی کہی ہوئی زیادہ تاریخیں شاہ عالم ثانی کے عہد سے متعلق ہیں۔اکبر شاہ ثانی بادشاہ ہوئے تو ان کی خدمت میں یہ قطعہ نذر کیا:

''قطعہ تاریخ جلوس اکبر شاہ''

جلوۂ مہرِ فلک تا ہے، شہِ اکبر کے — زیرِ پا تختِ شہی، زیرِ سر افسر ہو
بہرِ تاریخِ جلوس اس کی مجھے فکر یہ تھی — کچھ سوے غیب سے الہام مرے دل پر ہو
یوں سرِ چاہِ عدو توڑ کہا ہاتف نے — اے خداوندِ جہانگیر یہی اکبر ہو

3 (-) 1224 . 1221=ھ

اکبر شاہ کا سالِ جلوس 1221ھ ہے۔بہرلوع ممنون اپنے زمانے کے معروف اور معتبر تاریخ گویوں میں سے تھے۔ان کے کلیات میں اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک کی تاریخیں موجود ہیں۔یقین ہے کہ کچھ تاریخیں انھوں نے بہادر شاہ کے زمانے میں بھی ضرور کہی ہوں گی۔

3۔نصیر

شاہ نصیر استادِ زمانہ تھے اور تاریخیں کہنے کے لیے انھوں نے شہرت پائی تھی۔کلیات میں متعدد قطعاتِ تاریخ مندرج ہیں۔بعض بہت صاف اور برجستہ ہیں۔مثلاً

مبارک ہو کہ اب برجِ حمل سے — ہوا خورشید پُر انوار پیدا
یہ برخوردار وہ ہے جس کی تاریخ — کہی ہاتف نے برخوردار پیدا

1230ھ

دیگر

درزمانِ اکبرِ ثانی کہ او — رشکِ داراوفریدون وجم است
شکراً للہ کرد در دہلی بنا — مسجد وچاہے کہ درعالم کم است
بے تکلف گفت تاریخش نصیر — کعبۂ ثانی و چاہِ زمزم است

1228ھ

"قطعہ تاریخ شاہ وجیہ الدین منیر"

آہ رحلت کرد فرزند نصیر　　شد غروب از خواہش ربِ قدیر
سالِ تاریخِ وفاتش گفت عقل　　وائے پنہاں گشت آں ماہِ منیر

1242ھ

اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے کہ بیشتر قطعات تاریخ فارسی میں کہے ہیں۔ عموماً کوشش کرتے ہیں کہ مادۂ تاریخ مکمل ہو اور ایسا ہو کہ اس سے واقعہ کا بھی پتہ چل جائے۔

شاہ نصیر نے بعض موقعوں پر تخرجہ اور تعمیہ سے بھی کام لیا ہے چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد نے ایک کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"میر باقر علی صاحب ایک سید خاندانی دلی کے تھے۔ شہر سے درگاہ کو چلے۔ راہ میں کسی نے مار ڈالا..... شاہ صاحب نے اسی وقت تاریخ کہی۔ کیا بے بدیل تخرجہ ہے۔

قطعہ تاریخ

بہ شب عُرس حضرتِ محبوب　　میر باقر علی چو گشت شہید
بے شش و پنج گفتم ایں تاریخ　　ہر کہ اورا بکشت بود یزید" 1

6 + 5　　(-) 1203　　=1192ھ

4۔ ذوق

مولانا محمد حسین آزاد نے شیخ محمد ابراہیم ذوق کی تاریخ گوئی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"صدہا تاریخیں تھیں مگر تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصہ میں آئی کیونکہ بہت بلکہ کل تاریخیں انھیں کی فرمائش سے ہوئیں اور انھیں کے نام سے ہوئیں۔" 2

ذوق کی کہی ہوئی چند تاریخیں گذشتہ اوراق میں نقل کی جا چکی ہیں۔ اکبر شاہ ثانی کی مدح کے ایک قصیدے کی تاریخ انھوں نے اس طرح کی ہے۔

کہو سر لبِ بستہ سے شادیِ فرزند　　مبارک آپ کو ہو اے شہِ سپہر وقار

2 + 30　　+ 1193　　=1225ھ

یہ تاریخ بہت خوب ہے۔ تعمیہ کی لطافت خصوصاً داد طلب ہے۔

شیخ ذوق کی ایک اور دلچسپ تاریخ آزاد نے اس طرح نقل کی ہے:

''چھتیس برس کی عمر تھی جب کہ جملہ منہیات سے توبہ کی اور اس کی تاریخ کہی ۔

اے ذوق مجھ سے بار توبہ

3"1239=413x3ھ

ذوق کا سال ولادت بقول آزاد 1204ھ ہے۔ 1239ھ میں اُن کی عمر پینتیس برس ہو چکی تھی اور چھتیسواں سال شروع ہو گیا تھا۔ مزید دو تاریخوں کا ذکر آزاد نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

''والد مرحوم نے بہ نیتِ وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ان سے تاریخ کے لیے کہا اسی وقت تامل کر کے (استاد ذوق نے) کہا:

تعزیت گاہ امام دارین"4

1260ھ

پوری تاریخ ہے۔ حکیم میر فیض علی مرحوم ان کے استاد بھی تھے اور اُن ہی کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے..... نوکر نے آ کر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعتہً بولے کہ

ہائے میر فیض علی

1226ھ

مجھ سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہے؟ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔''

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذوق نے تاریخ گوئی میں طرح طرح کے تجربے کیے تھے اور بہت اچھی تاریخیں بیساختہ اور فی البدیہہ کہی تھیں۔

5۔ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اردوئے معلّٰی کے ایک خط میں صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ:

''اس کو سب جانتے ہیں کہ مادۂ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے دیے ہوئے مادّے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادّہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہُوا کرتا ہے۔''

لیکن غالب کے اِس بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے تاریخیں کہی ہیں اور ان سب کو ہرگز بھی ''لچر'' نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اُن کا کہا ہوا گلشنِ بے خار کا قطعہ تاریخ درج کیا جاتا ہے۔

غالب ایں رنگیں کتاب گلشن بے خار نام — روکشِ جنات تجری تحتھا الانھار ہست
گر کسے لب تشنۂ تاریخ اتمامش بود — جو بہاے آب ہم در گلشن بے خار ہست

38 + 1213 = 1251ھ

اس تذکرے کے مولف نے اِس کی تاریخ ''خرم گلشنے'' سے نکالی ہے اور سبھی ہم عصروں نے اسی کو مانا ہے۔ غالب نے جو کہا ہے اُس سے 1251 برآمد ہوتے ہیں۔ اگر چہ ایک دو کے فرق کو جائز مانا گیا ہے تعمیہ کی صورت میں یہ مناسب نہیں ہے۔ جو بھی ہو غالب کے مذکورہ اعتراف کی روشنی میں اس مادۂ تاریخ کے لیے غالب کو پوری طرح ذمہ دار ٹھہرانا بہت مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔

6۔ خرد

نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

''خرد تخلص، نواب فخر الدین خاں خلف الصدق نواب شرف الدین محمد خاں کہ خدمت بخشی گری تن جاہ افزاے ایشاں بود۔ تاریخ دیوانِ فقیر بہ آں مایۂ خوبی گفتہ کہ خامہ نتواندش ستود و ہم بریں تذکرہ تاریخے دل پسند دارد و آں بجاے خود مذکور شود، لعنا تاریخ دیوانِ ریختہ نظم عالم پسند گفتہ است۔''[5]

247

ان کا مذکورہ قطعہ تاریخ اس طرح ہے۔

قطعہ تاریخ زادہ طبع نواب فخر الدین محمد خاں المتخلص بہ خرد

چوں جناب شیفتہ گلچینِ دہر — گلشنِ بے خار را از خار رفت
حاملِ جمعِ خرد تاریخِ او — نغمہاے طوطیانِ ہند گفت

1250ھ

7۔ مومن

حکیم محمد مومن خاں مومن کی تاریخ گوئی کے بارے میں آزاد نے اس طرح رائے دی ہے:

''تاریخ میں تعمیہ اور تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے مگر ان کی طبع رسا نے اسے محسنات تاریخ میں داخل کر دیا ہے چنانچہ اپنے والد کی تاریخ وفات کہی ہے۔

بمن الہام گشت سال وفات کہ غلام نبی بہ حق پیوست

1241 = 108 + 1133

غلام نبی کے اعداد کے ساتھ حق ملائیں تو پورے سنہ فوت نکل آتے ہیں۔ ان تاریخوں کے لطف و نزاکت میں کلام نہیں لیکن اصول فن کے بموجب نو سے زیادہ کمی و بیشی جائز نہیں۔ اس انداز کے ایجاد داخل معمے ہیں۔''[6]

یہ اعتراض غالباً مناسب مقام نہیں ہے حق کے پیوست کیے جانے کی نوعیت تعمیہ اور تخرجہ سے مختلف ہے اس لیے اس میں قباحت معلوم نہیں ہوتی ہے۔

مومن نے سادہ تاریخیں بھی کہی ہیں اور خوب کہی ہیں۔ ان سے مومن کی علمی فضیلت کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ اُن کا ایک قطعہ یہ ہے:

''تاریخ وفات جدۂ مومن سراپا غم دخلت اللہ فی جنت النعیم''

جب کہ اس غم سرا سے رحلت کی جدۂ مومن پریشاں نے
سال تاریخ حسب حال کہی دخلت بالنعیم رضواں نے

1237ھ

مومن نے بعض تاریخیں بہت دلچسپ کہی ہیں مثال کے طور پر شاہ عبدالعزیز کی تاریخ وفات ہے[7]:

''تاریخ رحلت وحید زماں، یکتائے دوراں از یں ایرماں سرائے ویرانی بنیاں''

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیز ہے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے آ گیا تھا کیا کہیں مُردوں کے ایماں میں دخل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل

جب اٹھائی لاش اک عالم تہ و بالا ہُوا　　لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسیِ گردوں محل
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن　　ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
مجلسِ درد آفریں تہذیب بیں میں بھی تو تھا　　جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آ کر بے مبتذل

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل
40+30+200+9+50+800+10+100
ھ 1239

''الفاظِ مصرعِ آخر کے اول و آخر کے حرفوں کو گرا دو۔ بیچ کے حرفوں کے عدد لے لو تو 1239 رہتے ہیں۔''[7]

8۔ صہبائی

دہلی کے شاعروں میں عمر میں سب سے کمتر، لیکن تاریخ گویوں میں سب سے بہتر اور بڑھ کر شیخ امام بخش صہبائی ہوئے۔ انھوں نے جتنی قسم کی اور جتنی کثرت سے تاریخیں کہی ہیں شاید کسی دوسرے نے نہیں کہی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان کی تاریخیں الا ماشاءاللہ نہایت برمحل اور بے ساختہ ہوتی ہیں۔

صہبائی کی سادہ تاریخوں میں سے بعض یہ ہیں:

(1)　شرحِ حُسن و عشق کی ابتدا کی تاریخ　　آغازِ امر سے نکالی
1250

(2)　صنعتِ معما میں اپنی رباعیوں کے مجموعہ کا تاریخی نام　　جواہر منظوم رکھا
1251

تاریخ گوئی کے شوق کا حال یہ تھا کہ صہبائی نے بعض گذشتہ واقعات کی بھی تاریخیں کہہ ڈالی تھیں چنانچہ تاریخ وفات شاہ عالم بہ تعمیہ ؎

حضرتِ فردوس منزل شاہ عالم بادشاہ　　رفت ازیں دارِ فنا کرد در جنت مقام
سال تاریخ وفاتِ آں شہِ عالی گہر　　دل زروئے نالہ گفتا ہفتم شہر صیام
1221=1171+50ھ

تاریخ جلوسِ اکبر شاہ ثانی

بہ بر چو کرد لباسِ خلافت اکبر شاہ　　بہ شرف ودولت واقبال وعزّت وناموس

سروشِ غیب ز روئے بدیہہ اِک ناگاہ　　جہز عشرت پرویز گفت سالِ جلوس

1221ھ=　　1220　+　1

ان دونوں میں تعمیہ کی اچھی مثالیں موجود ہیں۔ ذیل میں صوری معنوی تاریخوں کی مثالیں بھی نقل کی جاتی ہیں:

شرح حسن وعشق کی تکمیل کی تاریخ یہ ہے:　　یوم چہارشنبہ سویم من شعبان

1251 ھ

اورشرح معمائے جامی کے آغاز کی تاریخ اس طرح کہی تھی　　ودیم شہر شعبان مبارک

1251 ھ

ان مثالوں سے صہبائی کے تاریخ گوئی پر ملکہ کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ صہبائی کی کہی ہوئی تاریخوں کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

(ل) معمّہ

معمّہ کے فن سے بھی اکبر شاہ ثانی کے دور میں بعض بعض لوگ دلچسپی لے رہے تھے۔ دو شخصوں نے زیادہ نام پایا۔

1۔ مومن

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں مومن کے حالات میں لکھا ہے کہ:

''ان کے معمے بھی متعدد ہیں، مگر ایک لاجواب ہے۔ ایسا سنا نہیں گیا ۔

بنے کیونکر کہ ہے سب کار الٹا ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا

یعنی مہتاب رائے''1

شیفتہ کے نام کا معمّہ انھوں نے اس طرح کہا تھا:

''معما بہ اسم نواب مصطفیٰ خاں بہادر''

نوا بلبل کی بے بس کر رہی ہے بہار اک جام بیجا بھر رہی ہے

صدا بے درد قمری کی بلا ہے سر طاقت بھی جس کا نقشِ پا ہے.

فلک کو کل نہیں بے جور و بیداد بسر ے کیا ہو گو ہے فصلِ حر داد

کہ وہ سرو خراماں یہاں نہیں ہے سرور اپنا تو اب امکاں نہیں ہے

بہار سبز پا کے پاؤں ٹوٹیں

کہ در و بیجِ حسرت سے چھوٹیں

ان کے علاوہ اور بھی کئی معمے مومن کے دیوان میں موجود ہیں۔

2۔صہبائی

شیخ امام بخش نام، صہبائی تخلص، تھانیسر کے رہنے والے، مولانا محمد بخش فاروقی کے فرزند تھے، فارسی کے غیر معمولی عالم تھے اور معمولاً اسی زبان میں شعر کہتے تھے۔ کبھی کبھی محض بہ ضرورت اردو میں بھی ایک دو شعر کہہ لیتے تھے۔ فنِ معمہ سے شروع سے ان کو دلچسپی تھی چنانچہ آخر زمانے میں ''صہبائی معمائی'' کہلانے لگے تھے۔ اُنھوں نے فنِ معمہ سے متعلق کئی کتابیں لکھی تھیں اور وہ اس طرح ہیں:

(1) ''شرح معمائے نصیر اے ہمدانی۔'' یہ صہبائی کی معلوم پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔ شروع میں چھبیس صفحوں کی تمہید میں معمہ کی تعریف اور اس کے اصولوں کا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد پچیس صفحوں میں ان مقاموں کی تشریح کی ہے۔ جہاں معمے ہیں۔ صہبائی نے اس کام کو 1247ھ (=1831-32) میں مکمل کیا تھا۔ کچھ مدت کے بعد اس کتاب کے خاتمے میں صہبائی نے اپنی سرگذشت لکھ ڈالی۔''[2]

(2) شرح معمائے جامی۔ یہ مختصر رسالہ کُل اٹھائیس صفحوں پر محیط ہے۔ شروع میں معما کی تعریف اور جامی وغیرہ استادوں کے اس سلسلے میں اقوال درج کیے ہیں۔ پھر معمائے جامی کی تشریح لکھی ہے۔ اس کے دیباچے میں صہبائی نے لکھا ہے:

''شرحِ حُسن و عشق سے فارغ ہوتے ہی احباب کا تقاضا ہوا کہ معمائے جامی کی شرح لکھوں۔ میں نے معذرت چاہی مگر سماعت پذیر نہیں ہوئی۔ مجبوراً دوم شعبان کو شرح کا آغاز کیا۔ تاریخ آغاز بھی

<u>دوم شہر شعبان مبارک</u>

1251ھ (=1835-36)

سے برآمد ہوتی ہے۔''[3]

(3) 'جواہر منظوم' شرح معمائے جامی کی تصنیف کے دوران صہبائی کو صنعتِ معما میں خود بھی تصنیفی کام انجام دینے کا خیال ہوا۔ غور و فکر کے بعد انھوں نے اس صنعت میں اپنی ایک سو تیس

رباعیوں کا ایک مجموعہ مرتب کر کے، اس کا تاریخی نام 'جواہر منظوم' مقرر کیا۔ آخر میں تین صفحوں پر مشتمل ایک طویل قطعہ اس عنوان سے لکھا ہے:

''قطعہ مشتمل بر استخراج اسم اللہ از علی و بالعکس بہ اجرائے اعمالِ معمائی۔''4

بہادر شاہ بادشاہ کے زمانے میں صہبائی دلّی کالج میں ملازم ہو گئے تھے۔ وہاں پرنسپل کے حکم سے انھوں نے شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے پانچویں حدیقے کے بارے میں صہبائی نے لکھا ہے:

''حدیقہ پانچواں معمّے کے فن میں ___ معلوم کیا چاہیے کہ یہ فن ایک شعبہ ہے بدیع کا اور معمّا ایک صنعت ہے صنایع لفظی سے لیکن اس فن کے قواعد اور فروع اس کے محکم ہیں گویا برابر ایک فن علاحدہ معلوم ہوتا ہے اور یہ فن طبایع فہیم کے نزدیک الطف فنون کا اور الذ اشیا کا ہے لیکن چونکہ بیشتر اشخاص کو بہ سبب دقت کے اس طرف رغبت کم ہے اس واسطے صاحب والا مناقب بوترس صاحب پرنسپل بہادر دام اقبالہ، کا ارشاد اس طرح پر ہوا کہ اس فن کو ترک کرنا چاہیے، اس سبب سے مترجم بہ موجب اس عبارت کے کہ اَلْمَامُوْرُ مَعْذُوْرٌ اس حدیقہ کے ترجمے سے ہاتھ اٹھا کر خاتمہ کا ترجمہ کرتا ہے۔''5

اس طرح فن معمّہ سے متعلق مطالب کو مدرسۂ شاہجہاں آباد کے نصاب سے خارج کر دیا گیا اور رفتہ رفتہ یہ فن مر گیا۔ صہبائی معمائی کے بعد ایک دو شخص اور ہوئے جنھوں نے اس فن سے دلچسپی لی لیکن انھیں کچھ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔

(م) پہیلیاں، گیت وغیرہ

سعادت یار خاں رنگین نے اردو شاعری کی اصناف میں ''پہیلیوں'' کو بھی شمار کیا ہے چنانچہ مرزا محمد رفیع سودا اور انشاء اللہ خاں انشا کے کلیات میں بھی بہت سی پہیلیاں موجود ہیں۔ ان اساتذہ کی پہیلیوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ معمولاً پہیلیوں میں کسی چیز کے اوصاف اور خصوصیات کے علاوہ بعض اوقات ضروری نشان اور پتے بیان کر کے مخاطب سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ ان خصوصیات وغیرہ کی روشنی میں پہیلیوں کی متعدد صورتیں اور قسمیں ہو جاتی ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کا بیان غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اکبر شاہ ثانی کے ولی عہد مرزا ابوظفر ظفر نے جو بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ثانی کہلائے پہیلیوں سے کما حقہ، دلچسپی لی تھی چنانچہ ان کی بھی پہیلیاں مشہور ہیں مثال کے طور پر ''نیم'' کی پہیلی انھوں نے اس طرح کہی ہے:

ساری کو جو کہیں ہیں اَدّھا ناہیں کوئی پوچھن ہار[1]

اس میں فارسی لفظ ''نیم'' کا ہندوستانی مرادف ''اَدّھا'' لا کر پہیلی بنائی گئی ہے۔

پہیلیوں کے لیے عام طور سے پوربی زبان استعمال میں لائی جاتی ہے۔ ظفر کی مذکورہ پہیلی میں بھی یہی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہوئی ہے کہ دہلی کے اکثر معتبر شعرا نے اِس صنف سے دلچسپی نہیں لی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے شیخ محمد ابراہیم ذوق کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے بھی

پہیلیاں سٹھنیاں وغیرہ لکھی تھیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ اپنے دعوے کی تائید میں آزاد نے ان کی ایک بھی پہیلی نقل نہیں کی ہے۔2

حکیم محمد مومن خاں مومن نے بھی پہیلیاں کہی تھیں اور خوب کہی تھیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''پہیلیاں بھی کہیں۔ ایک یہاں لکھی جاتی ہے کہ گھڑیال پر ہے۔

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بلائے　　نہ لفظ او رمعنی سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چور، پر وہ لگتا رہے　　زمانے کا احوال بکتا رہے
شب وروز غوغا مچایا کرے　　اسی طرح سے مار کھایا کرے ''3

مومن کی پہیلیاں عموماً کتابی اردو میں ہیں اور اس لحاظ سے وہ قدما کی پہیلیوں سے الگ ہیں۔

گیت (ٹھمری وغیرہ)

یہ تو صحیح ہے کہ زبان اردو میں عالمگیر اورنگ زیب کے وقت سے بتدریج ''میرزایانِ ہند'' کے روزمرہ کے ساتھ ساتھ ان کی پسندیدہ شعری اصناف کا بھی رواج بیش از بیش ہوتا جارہا تھا لیکن یہ بھی قابلِ توجہ حقیقت ہے کہ شاہ عالم ثانی کے عہد کے بعد بھی ہندوستانی اصناف شاعری کا کسی نہ کسی درجے میں چلن باقی تھا۔ سعادت یار خاں رنگین نے اردو شاعری کی جو ستائیس اصناف شمار کی ہیں ان میں یہ دو بھی شامل ہیں: 4

(1) گیت　　(2) دوہرہ

خود شاہ عالم ثانی کے مجموعۂ کلام ''نادراتِ شاہی'' میں ذیل کی اصناف میں بھی ان کا کلام موجود ہے:

(1) ہوری (=ہولی)　　(2) ترانہ　　(3) نایکا بھید

اکبر شاہ ثانی کے دور میں ان کے علاوہ اور بھی بعض شعری اصناف کے زبان اردو میں رواج کا مذکور ملتا ہے۔

1۔ ذوق

شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد وقت تھے۔ بہ کثرت شاعر ان کے شاگرد اور متبع تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ان کے حالات میں تحریر کیا ہے کہ:

''ہزاروں گیت، پتے، ٹھمریاں، ہولیاں (انھوں نے) کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہیں اور ان باتوں میں وہ اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے۔''5

اس قسم کے شیخ ذوق کے کلام کے نمونے آزاد نے آب حیات اور دیوان ذوق کے مقدمے میں بھی درج کیے ہیں۔ ایک یہ ہے:

''ایک بڈھا چورن مرچن کی پڑیاں بیچتا پھرتا تھا اور آواز دیتا تھا:

لے ترے مچھلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

کنجڑے کی سی ہاٹ ہے دنیا ساری اکٹھی میٹھی چاہے میٹھی لے لے، کھٹی چاہے کھٹی

لے ترے مچھلے کا سودا ہے کھٹا او رمیٹھا

روپ رنگ پر پھول نہ دل میں دیکھ عقل کے بیری اوپر میٹھی نیچے کھٹی، انبوا کی سی کیری

لے ترے مچھلے کا سودا ہے کھٹا او رمیٹھا

ایک فقیر صدا کہتا تھا، کچھ راہ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا۔

حضور کو پسند آئی۔ ان (ذوق) سے کہا۔ انھوں نے بارہ دوہرے اس پر لگا دیے

کچھ راہِ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا

محتاج خراباتی یا پاک نمازی ہے کچھ کر نہ نظر اس پر واں نکتہ نوازی ہے

کچھ راہ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا

اس طرح کی ہزاروں چیزیں تھیں۔ پتے، ٹھمریاں، پہیلیاں، سیٹھنیاں کہاں تک لکھوں۔''6

شیخ ذوق کے حالات میں آزاد نے ایک اور واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

''ایک دن ٹہل رہے تھے۔ حافظ ویران ساتھ تھے۔ بہ تقاضائے استنجا بیٹھ گئے۔ وقت معین سے زیادہ دیر ہوئی۔ انھوں نے قریب جا کر خیال کیا تو کچھ گنگنا رہے ہیں اور چٹکی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں۔ پوچھا کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے؟ فرمایا کہ حضور نے چلتے ہوئے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سنائے تھے کہ اسے پورا کر دینا۔ اس وقت اس کا خیال آ گیا۔ پوچھا یہ جوتی پر آپ چٹکی کیوں مارتے

تھے؟ فرمایا کہ دیکھتا تھا اس کے لقمۂ تال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں۔"

2۔ ظفر

بہادر شاہ ثانی خود شاعر تھے۔ ظفر تخلص کرتے تھے۔ بادشاہ کے لیے مناسب تر تھا کہ وہ اپنے ملک کے عوام کی بول چال اور ان کی شعری اصناف کی بھی سرپرستی کرتے چنانچہ ان کے نام سے گیت، ہوری وغیرہ مشہور ہیں ایک گیت یہ ہے:

ہند میں کیسو پھاگ مچوری جورا جوری
پھول تختہ ہند بنا تھا کیسر کی سی کیاری
کیسو پھوٹے بھاگ ہمارے لٹ گئی باگ بہاری
لٹ گئی سب پھلواری
گولن کا گلال بنایو توپن کی پچکاری
آئی ہے سگری کھ پر ایسی تک تک ماری
سودنیا میں مچوری
گنگا رام یہودی نے تخت کا ناس کیوری
او کھو نے کاہے ایسا پاپ کیوری
سراپ سب کا لیوری
بہادر شاہ درگاجی مردنے دین کا ساتھ ڈیوری
مرتے دم تک اس پر یکما نے دین دہی دین کیوری
نام اس رب کا لیوری
ہند میں کیسو پھاگ مچوری جورا جورا سی

اگر یہ کلام الحاقی نہیں ہے تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آخر زمانے تک بھی بہادر شاہ ان شعری اصناف میں کچھ کچھ کہہ رہے تھے اور یہ اس کلام کے علاوہ ہے جو ذوق کی زندگی میں ان کے نام سے مشتہر ہو رہا تھا۔

3۔صہبائی

شیخ امام بخش صہبائی اردو کے شاعر نہیں تھے نکتہ سنج اور نکتہ شناس بھی تھے اور بہ ضرورت اردو میں شعر کہہ لینے پر قادر تھے۔انھوں نے شعرائے اردو کے کلام کا جو انتخاب مرتب کیا تھا اس میں بعض شاعروں کے گیت بھی شامل کیے تھے۔نمونہ یہ ہے ۔

ٹھمری

نہیں کل ری بنا ہر جیارا جب سے گئے سدھ نہ لینی
بکل رہ داہمارا جیارا

میرے پچھواڑے منے رام سنر وا گھڑ دے رے باجو بند
ہر دا نہیں کل رے بناہر

بہادر شاہ ثانی کا ان ہندوستانی اصناف میں طبع آزمائی کرنا اور سعادت یار خاں رنگین اور شیخ امام بخش صہبائی جیسے فاضل کا ان کو اردو شاعری کی معتبر اصناف میں شمار اور شامل کرنا ایسی بات نہیں ہے جس سے سرسری گذر جایا جائے۔بے شک مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد زمانے کی ہوا بدل گئی تھی اور صاحبانِ عالی شان کی ایما اور منشا ہر معاملے میں دخیل ہو گئی تھی چنانچہ شعرائے اردو کی توجہ اس طرف سے ہٹ گئی تھی۔شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اکثر کم نظر اور ناواقف ان چیزوں کو اردو کے لیے ''غیر'' خیال کرنے لگے ہیں۔

(ن) مذہبی نثر

اردو زبان میں قرآن پاک کے ترجمہ کا کام شاہ عالم ثانی کے عہد میں شروع ہوا تھا۔ پھر اس سلسلے نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا اور حاشیہ پر ضروری مقامات کی مختصر تفسیر لکھی جانے لگی۔ اکبر شاہ ثانی کے دور میں کام کی نوعیت اور معیار میں مزید ترقی ہوئی۔ زبان و بیان میں بھی صفائی اور صراحت کی صورت پیدا ہوئی۔

1۔ رشید الدین

شاہ رفیع الدین وغیرہ کے شاگردوں میں مولوی محمد رشید الدین خاں ولد امین الدین ایک معروف عالم تھے۔ وہ مفتی صدر الدین خاں آرزو کے اعزا میں سے تھے۔ ان کی ایک تصنیف رشید المومنین کا ایک قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ ''وجہ تالیف'' مؤلف نے اس طرح بیان کی ہے:

> ''پوشیدہ نہ رہے کہ سابق اس کمتر و احقر، ضعیف و مسکین، خاکپائے مسلمین، ہیچمدان محمد رشید الدین نے رسالہ ''نور الایمان'' میں کچھ حال حشر کا بے دلیل و سند مجمل بیان کیا تھا کہ بعض محب و مخلص وقت مطالعہ یا سماعت کے واسطے سند اس کے مضمون کے متردد ہوتے تھے۔ اس واسطے چاہا کہ ایک رسالہ جدا اس بیان میں باسند و دلیل ترتیب دیجیے۔ الحمد اللہ کہ سن بارہ سو چوبیس ہجری (=1809) میں یہ رسالہ مرتب ہوا۔''[1]

اس اقتباس سے کئی مفید مطالب سامنے آتے ہیں مثلاً یہ کہ سابقاً کتب مذہب کے پڑھنے اور ان کے سننے سنانے کا چلن زیادہ تھا چنانچہ اس مؤلف نے بھی ایک رسالہ "نورالایمان" اسی مقصد سے لکھا تھا۔ بات سننے سنانے کی تھی اس لیے اس قسم کی کتابوں میں مآخذ کے اندراج کا رواج نہیں تھا لیکن پڑھتے سنتے وقت بعض لوگوں کو سند کی جستجو بھی ہوتی تھی۔ اکبر شاہ کے زمانے میں اس کمی کو دور کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ امتیاز علی خاں عرشی نے کتاب رشید المومنین کے بارے میں بتایا ہے کہ:

"مؤلف نے اپنے مآخذوں میں تفسیر فتح العزیز مولفہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ترجمہ قرآن مولوی شاہ رفیع الدین، ترجمہ مولوی عبدالقادر، حشر بلدۂ مولوی رفیع الدین اور قصر الامال مولفہ مولوی رفیع الدین خاں مرادآبادی کا بھی ذکر کیا ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالقادر بھی قرآن پاک کا ترجمہ شاہ عالم ثانی کے آخر زمانے میں مکمل کر چکے تھے۔ کتاب رشید المومنین کا آغاز ان لفظوں سے ہوتا ہے:

"تبارک الذی نزل القرآن علی عبدہ ۔ بعد حمد و نعت کے ناظران اس اوراق پر پوشیدہ نہ ہے....." الخ

اور خاتمہ کے کلمات اس طور پر ہیں:

"خداوندا ہم کو اور سب ہمارے بھائی مسلمانوں کو توفیق نیکی کی دے.....اور اس رسالے کو مقبول کرتا کہ لوگ پڑھیں.....اور غلطی کو مجھ سے معاف کر کے اصلاح فرماویں۔ آمین۔ یارب العالمین۔ تمام شدہ۔

یہ مخطوطہ ایک سو پانچ صفحوں پر محیط ہے اور ہر صفحہ پر اکیس سطریں ہیں۔

2۔ سید احمد شہید

یہ بزرگ سید محمد عرفان کے فرزند تھے اور رائے بریلی میں 6 صفر 1201ھ (29/نومبر 1786) کو پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے شاہ عبدالقادر دہلوی سے تعلیم پائی اور شاہ عبدالعزیز کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ہر طرح جدوجہد کرتے رہے۔ آخر 24/ ذی قعدہ 1246ھ (6/مئی 1831) کو سکھوں کے مقابلے میں جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ

میں شہید ہوئے۔

اردو نثر میں ان کے دو رسالے ہیں: رسالہ حقیقت الصلوٰۃ اور تفسیر سورہ الحمد2۔ ان کا زمانہ تالیف متعین نہیں ہے البتہ اس بارے میں شبہ نہیں ہے کہ یہ دونوں اکبر شاہ ثانی کے عہد میں وجود میں آئے تھے۔ ان کے خاتمہ الطبع کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"الحمد اللہ کہ تفسیر الحمد کی ہندی زبان میں جو حضرت رئیس المومنین امام العارفین سید المسلمین، مقدوۃ السالکین، پیر و مرشد حضرت سید احمد صاحب نفع پہنچائے اللہ ہم کو اور ہم سب مسلمان بھائیوں کو ان کی بقا سے اور زائد کرے فیض اور ارشاد ان کا۔ آپ اپنی زبان سے فیض ہدایت ترجمان سے فرما کے جامع علوم ظاہری اور باطنی جناب مولانا عبدالحئی صاحب دام فیضہٗ سے تحریر کروائی اور حقیقت صلوٰۃ کی جو نماز بیخ گانہ ہے اور کئی فائدوں کے ساتھ جسے ایک فاضل کامل نے حضرت پیر و مرشد کے مریدوں میں سے حضرت کی زبان اقدس سے سن کے ہندی زبان میں لکھا ہے۔ اہتمام سے عاصی نبیر خاں اور وارث علی کے جناب مولوی محمد علی صاحب کی تصحیح سے مولوی بدر علی صاحب کے چھاپے خانے میں خاص و عام کے فائدے کے لیے چھاپا ہوئی تھی۔

اب اگر عالی ہمت کسی مقام پر عبارت محاورے کی مخالف پاویں تو زبان طعنے کی دراز نہ کریں۔"

تفسیر سورۂ فاتحہ میں ذیل کی عبارت سے ان دونوں کی طباعت کی تاریخ معلوم ہوتی ہے:

"مقصود چھاپنے سے محض خیر خواہی جماعت مسلمین کی اور بہتری خواص و عام مومنین کی ہے، نہ آرائش الفاظ کی، لہٰذا جو قلمی مولوی صاحب ممدوح کا تھا اگرچہ بعض مقام پر برخلاف محاورہ ہووے بہ مہینہ جمادی الآخرہ کی بائیسویں تاریخ 1237ھ (1822) علی ہاجرہ والصلوٰۃ والسلام طبع ہوا۔"

اب اِن کتابوں کی زبان کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔ تفسیر سورہ الحمد کے آغاز کی عبارت یہ ہے:

"اس سورت میں اللہ نے دعا کی طرح بتلائی ہے اور اللہ کے بتلائے برابر سب کا بتلایا نہیں ہوتا، اس واسطے یہ سورت بڑی بزرگی رکھتی ہے اور دعا میں دستور یوں ہے۔ ہر

کوئی جانے ہے کہ باوجودیکہ سب آدمی محتاج بے مقدور ہیں، پر سوال کرنے میں جو آدمی سخی کریم، باہمت اور بامقدور ہے اسی سے مانگتے ہیں۔ جتنا تفاوت آدمیوں میں اوصاف سے ہوتا ہے اتنا ہی سوال کرنے میں فرق پڑتا ہے جس میں تفاوت نہ ہو اس سے نہیں مانگتے اور جو تفاوت ہو پر خُرشروئی بھی ہو تو اس سے بھی سوا مانگنے میں پرہیز کرتے ہیں اور جو خُرشرو بھی نہ ہو، بہت خلیق ہو، پر دینے کے پیچھے اِترادے، جتلادے، منت رکھے اس سے بھی مانگنا اچھے آدمیوں کو سخت بھاری ہوتا ہے اور جو بے مقدور ہو تو اس سے مانگنا ہی نہیں ہوسکتا۔ اور جتنے یہ اوصاف پُرکمال ہوں اتنا مانگنا اس سے خوب ہوتا ہے، یہاں تک کہ مانگنا عزت ہو جاتا ہے۔ جب کوئی بڑا ہی کریم، باہمت، پرلے درجے کا سخی ہو کہ وہ اپنی خوبیوں کے سبب مانگنے والے کا ہر طرح سے پاس کرے اور اس سے مانگنا عزت ہو جاتی ہے اور سوال کرنے میں آدمی اول وہ صفتیں اور خوبیاں بیان کرتا ہے کہ جس سے سوال کرے وہ بھی مان لے اور اقرار کرے کہ ہاں میں ایسا ہی ہوں۔"

اور رسالہ حقیقت الصلوٰۃ کے شروع کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"الٰہی شکر تیرے احسان کا کہ تو نے ہمارے دل کو روشن اور زبان کو گویا کیا اور ایسے نبیؐ مقبول کو خلق اللہ کی ہدایت کے واسطے بھیجا کہ جس کی ادنیٰ شفاعت سے دونوں جہان کی نعمت پاویں اور اس کی ہدایت سے عرفان کی لذت اٹھاویں، پھر درود وسلام اُس نبیؐ مختار، اوس کی آلِ اطہار اور اصحاب کبار پر کہ جس نے بشر کو ضلالت و گمراہی سے باز رکھا اور علما کو زیورِ علم و دانش سے آراستہ کیا۔"

اِس رسالے کے سبب تالیف کا بیان مولّف نے اِس طرح کیا ہے:

"حضوری بغیر تاثیر دل کے میسر نہیں، اور تاثیر دل کی بدوں دانستِ معانی الفاظ کے حاصل نہیں۔ اس واسطے جو کچھ نماز میں ہے معنی اس کے ہندی زبان میں محاورے کے موافق کہے ہیں کہ اکثر غریب لوگ کہ جو اِن معنوں سے مطلق بے خبر ہیں سمجھ کے حضورِ دل سے نماز گزاریں اور بہت سی حلاوت پاویں اور ایک فائدہ اور ہے کہ اگر

معانی الفاظ کے جانیں تو سب برے کاموں سے جن سے نقصان ایمان کا ہے بچیں
اور معلوم کریں کہ جو اقرار اپنے رب کے سامنے کیا ہے اُس پر قائم رہیں۔"

اِس مقام پر اِس دلچسپ حقیقت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ حقیقت الصلوٰۃ میں سورۃ الحمد کا جو ترجمہ نقل ہوا ہے وہ شاہ عبدالقادر کا ہے۔ ظاہراً خود اپنے کیے ہوئے ترجمہ کو اس میں نقل نہ کر سکنے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ سورہ فاتحہ کا ترجمہ سید صاحب نے بعد میں کیا ہو یا بصورتِ دیگر رسالہ حقیقت الصلوٰۃ کی تالیف کے وقت وہ ترجمہ اُن کے سامنے موجود نہ رہا ہو۔ زیادہ امکان پہلی صورت کا معلوم ہوتا ہے۔

3۔ اسماعیل شہید

مولانا شیخ محمد اسماعیل ابن شاہ عبدالغنی ابن شاہ ولی اللہ دہلوی کی زبانِ اردو میں زندۂ جاوید تصنیف "تقویۃ الایمان" کے نام سے معروف ہے۔ کتاب میں اس کے زمانۂ تالیف کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں ہے البتہ خارجی شہادتوں کی مدد سے عرشی صاحب نے وسط 1235ھ اور یکم شوال 1236ھ کے درمیان (1820-21ء) اس کا معروضِ وجود میں آنا لکھا ہے [3]۔ خود مصنف نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے:

"کتنی آیتیں اور حدیثیں کہ جن میں بیان توحید کا اور اتباع سنت کا ہے اور برائی شرک وبدعت کی اِس رسالہ میں جمع کیں اور اِن آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ اس کے حاصل معنی کا بیان زبان ہندی سلیس میں کر دیا تا کہ عوام اور خواص اس سے فائدہ برابر لیویں۔ جن کو اللہ توفیق دیوے وہ سیدھی راہ پر ہو جاویں اور بتانے والے کو وسیلہ نجات کا ہووے۔ آمین یا الٰہ العالمین اور اس رسالے کا نام "تقویۃ الایمان" رکھا اور اس میں دو باب ٹھہرائے۔ پہلے باب میں بیان توحید کا اور برائی شرک کی، دوسرے باب میں اتباع سنت کا اور برائی بدعت کی۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صرف پہلا باب مکمل کر سکا چنانچہ اس کے خاتمہ کی عبارت اس طرح ہے:

"سوائے مالک ہمارے اپنے ایسے پیغمبر رحیم وکریم پر ہزاروں درود وسلام بھیج اور
اُنھوں نے جیسا ہم جاہلوں کو دین کے سکھانے میں حد سے زیادہ کوشش کی سو تو ہی اس

کوشش کی قدر دانی کر کہ ہم تو ایک عاجز بندے ہیں، محض بے مقدور اور جیسا تو نے اپنے فضل سے ہم کو شرک و توحید کے معنی خوب سمجھائے اور لا إلٰہ إلا اللہ کا مضمون خوب تعلیم کیا اور مشرک لوگوں میں سے نکال کر موحد پاک مسلمان بنایا اسی طرح اپنے فضل سے بدعت و سنت کے معنی خوب سمجھا اور محمد رسول اللہ ﷺ کا مضمون خوب تعلیم کر اور بدعتی، بدمذہبوں میں سے نکال کر سنّی پاک متبع سنت کا کر۔ آمین یا رَبّ العالمین فقط. و آخر دعوانا اَنِ الحمدلله رَبّ العالمین۔"4

4۔ محمد سلطان

اِن کے حالات تو معلوم نہیں ہو سکے البتہ انھوں نے شاہ اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان کے دوسرے حصے کو اردو زبان میں لکھا تھا۔ ان کا بیان یہ ہے:

"معلوم کیا جانا چاہیے کہ ایک فاضل، جلیل، متشرع، دیندار نے شرک اور بدعت کی برائی کے بیان میں ایک رسالہ "تقویۃ الایمان" نام لکھا اور اس میں صرف آیتیں اور حدیثیں جمع کیں اور اس کے دو باب ٹھہرائے۔ ایک باب میں توحید کی خوبیاں اور شرک کی برائیاں ہندی زبان میں بیان کیں اور دوسرے باب میں اتباع سنت کی خوبیاں اور بدعت کی برائیاں اور تفصیل بعضے بدعات کی آیت اور حدیث سے ذکر کی اور ارادہ ہندی ترجمہ کا کیا مگر فرصت نہ پائی اور راہ خدا میں جان دی۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔ اب سن بارہ سو پچاس ھ (1834) میں اللہ تعالیٰ نے اس خاکسار گنہگار ہیچمداں محمد سلطان کے دل میں ارادہ اس کے ترجمے کا ڈالا۔ سو اس دوسرے باب کا ترجمہ ہندی بولی میں شروع کیا اور "تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان" اس کا نام رکھا۔ اتمام کو پہنچانا اور قبول کرنا اُس کے اختیار ہے۔"5

اِس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اِس دوسرے باب کے مطالب شاہ اسماعیل شہید کے جمع کیے ہوئے ہیں البتہ اِس کی زبان اور بیان مولوی محمد سلطان صاحب کا ہے۔ اس حصہ کے مطالب کی تفصیل اس طرح ہے:

فہرست اس باب کی سات فصلوں اور سات رسموں کی

فصل پہلی	سنت مضبوط پکڑنا	فصل دوسری	ایمان کی حقیقت
فصل تیسری	ایمان بالقدر	فصل چوتھی	صحابہ اور اہل بیت کے مناقب
فصل پانچویں	قبروں کی بدعت	فصل چھٹی	تقلید کی بدعت
فصل ساتویں	رسموں کا رد		
پہلی رسم	سماع الغنا والمعارف	دوسری رسم	نسب پر فخر کرنا
تیسری رسم	بہت زیادہ تعظیم کرنی	چوتھی رسم	زیادتی مہر کی اور بیجا خرچ کرنا
پانچویں رسم	رانڈ کو نکاح سے باز رکھنا	چھٹی رسم	نوحہ اور ماتم کی
ساتویں رسم	زینت بہت کرنی		

اِس کتاب کے خاتمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

''بہ سبب خوف طول ہونے کے کتاب کے مولف رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قدر پر کفایت کی۔ اس خاکسار بیچد ان مترجم نے بھی اسی لحاظ سے راہ اختصار کی اختیار کی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ثُم الحمدُللّٰہ وَالصّلوٰۃ وَالسّلام عَلیٰ رَسولہ محمّد وَآلہٖ وَاَصحابہ وَاَزواجہٖ وَعشرتہٖ وَعَلیٰ کُل من اتخذ سَبیاہ وَجَعَلَ القُرآن دلیلہ کہ یہ ترجمہ اتمام کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے کرم سے قبول کرے اور اس گنہگار کو اور سب بھائی مسلمانوں کو توفیق دے کہ عقیدہ توحید کا خوب درست کریں اور جمیع انواع شرک سے بچیں اور سنت رسول کریم کو اختیار کریں اور بدعات سے اجتناب رکھیں اور تقدیر پر ایمان مضبوط کر کے ایمان اپنا ٹھیک کریں۔ توکل اللہ پر کریں اور حضرتؐ کے اصحاب اور اہل بیت بلکہ جمیع متوسلوں سے محبت رکھیں اور اُن کے رویہ کو اختیار کریں اور بدعات قبور اور بدعات تقلید اور بدعات رسوم سے توبہ کریں اور راگ باجا سننا اور اپنے نسب پر فخر کرنا اور شادیوں میں بیجا خرچ کرنا اور بہت سی زینت دنیا کے امور میں کرنا ترک کر کے پاک باطن اور صاف ظاہر نرے مسلمان ہو جائیں۔ اَللّٰھم آمین ثُمّ آمین وَآخر دعوانا اَنِ الحمدللّٰہ رَبِّ العالَمینَ والصّلوٰۃ وَالسّلام عَلیٰ رسولہٖ محمّد وآلہٖ وازواجہ

واصحابه اجمعین. کی

کتاب تذکیرالاخوان اور تقویۃ الایمان کی زبان میں نمایاں فرق ہے۔ کتنے ہی الفاظ جو پہلی کتاب میں آئے ہیں دوسری میں نہیں ہیں مثلاً کتنی یعنی کتنی ہی اور اسی ہی وغیرہ اسی طرح ہے: سند پکڑنا، راندنا، بازو ہونا، اور شیاطینوں وغیرہ۔

5۔ اکرام الدین

سید احمد شہید کی تحریک سے وابستہ علما میں مولوی حافظ اکرام الدین واعظ دہلوی کی شخصیت بھی اپنے زمانے میں ممتاز تھی۔ اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں بھی ان کو رسائی حاصل تھی چنانچہ بادشاہ کے ارشاد کی تعمیل میں انھوں نے اردو زبان میں طبِ نبوی سے متعلق ایک کتاب مرتب کی تھی[9]۔ کتاب کے آخر میں انھوں نے ایک نظم میں حقیقت حال کا بیان کیا ہے۔ کچھ شعر یہ ہیں:

اے مولف تو بس کر اب یہ بیاں — فرصتِ وقت اب مجھے ہے کہاں
اس کی تالیف کا سبب یہ ہے — خانہ زادانِ حضرتِ سلطان
لگے کہنے یہ ظلِ سبحانی — چاہتے ہیں کہ ہووے اردو زبان
طبِ نبویؐ کا حال سب بالکل — فایدہ تو اٹھاویں اس سے یہاں
سایۂ ایزدی ہے اکبر شاہ — ہے گنہ اُس کے عفو پر نازاں
سو بہ فرمانِ حضرتِ والا — کیا میں نے مرتب از دل و جاں
طبِ نبویؐ رکھا ہے اس کا نام — حق تعالیٰ کرے نہ اس کو نہاں
فضل سے اس کے ہو بہت مشہور — یاں تلک اس کو دیکھیں انس و جاں

جب زباں بند کر تو اے اکرامؔ
دین تیرے کو حق رکھے بہ اماں

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ حافظ اکرام الدین شاعر بھی تھے اور اپنے نام کی مناسبت سے اکرام تخلص کرتے تھے۔

کتاب کا آغاز ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے۔

"جاننا چاہیے بعد حمد و صلوٰۃ کے یہ بات کہ اللہ صاحب نے انسان کو پیدا کیا ہے اپنی

بندگی کے واسطے اور بندگی کرنا موقوف ہے بدن کی تندرستی پر اور تندرستی موقوف ہے بدن کی نگاہبانی پر اور نگاہبانی بدن کی کبھی ہوتی ہے دعا سے اور کبھی ہوتی ہے دوا سے اور کچھ ایک عمل کرنے سے اور کبھی کسی عمل کرنے سے مگر حکمائے جسمانی کہ جن کی حکمت نری تجربہ ہی پر موقوف ہے جیسے جالینوس وغیرہ ہیں۔ وہ لوگ امراضِ جسمانی کے واسطے نری دعا کو مفید نہیں جانتے بلکہ اہلِ اسلام پر طعن کرتے ہیں کہ یہ لوگ بیوقوف ہیں کہ دعا کے قائل ہوتے ہیں کیونکہ دعا جو ہے ایک منہ کی بات ہے، بدن میں جا کر کیا اثر کرے سو اس کا جواب یہ ہے کہ بات کی تاثیر کا انکار کرنا محض بیوقوفی ہے کیونکہ بات کے تاثیر کرنے کا ہر کوئی قائل ہے مثلاً کوئی کسی کو برا کہنے لگے اور برا کہنا بھی ایک منہ کی بات ہے مگر غور کرے تو ایسی بات ہے کہ اس نے بدن کو توڑ کر، دل میں جا کر غصہ کو پیدا کیا اور اسی طرح بھلی بات دل میں جا کر اثر کیا اور غصہ پیدا نہ کیا اور خوشی کو پیدا کیا تو اللہ صاحب کے ناموں میں اور دعاؤں میں تاثیر نہ جاننا اس کی حماقت پر دلیل ہے۔'' ق

کتاب طبِ نبوی کا اختتام ذیل کے جملوں پر کیا گیا ہے:

''غرض حاصل کلام یہ ہے کہ طبِ نبوی سے فائدہ اسی کو ہوویگا جو متقی و پرہیزگار ہووے اور درجہ یقین کا اس کو کما حقہ حاصل ہووے اور معالج بھی اُس بیمار کا تقویٰ اختیار کرے کیونکہ یہ خاصیت سوا طب نبوی کے دوسری طب میں نہیں ہے کہ حکیم پرہیز کرے اور بیمار کو شفا ہو جاوے۔ اگر کسی سے یہ بات کہے تو یکایک اس کی عقل میں نہیں آنے کی ہے بلکہ لگے گا اس کا انکار کرنے مگر جب غور کرے گا تو اسے معلوم ہووے کہ بیشک یہ خاصہ سوا طبِ نبوی کے دوسری طب میں نہیں کہ حکیم پرہیز کرے اور بیمار اچھا ہو جاوے۔''

اس کتاب میں اکثر بیماریوں اور دواؤں کے نام ہندوستانی آئے ہیں مثلاً جوت (= آنکھ کی روشنی) بغل گند بسِدھ وغیرہ۔ اِسی طرح کلا، بدقدم، لڑاک، تھتکار، وغیرہ الفاظ بھی ہیں کہ بعد میں متروک ہو گئے۔

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اس کتاب کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ پہلا نسخہ جس کی

کتابت عبدالصمد کاتب نے 1256ھ (1840) میں پینسٹھ اوراق پر کی ہے اس عبارت پر ختم ہوتا ہے:

''اور جس کے کان میں شور وغل ہوئے تو چاہیے اس کو کہ وہ درود شریف پڑھا کرے
اور بعد درود کے یہ کلمہ کہے ذَکَرَاللہ بِخَیْرٍ مَّن ذَکَرَ نی''

اور دوسرے نسخہ کے خاتمہ کے الفاظ یہ ہیں:

''اور وقت آخرت کے آسانی کر اور بخش گناہ تمام اگلے اور پچھلے اور ہدایت اچھی کر۔

جناب خلیل الرحمان داودی کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب 1851 (=1267ھ) میں سڑسٹھ صفحوں پر پہلی بار مطبع مصطفائی کانپور میں چھپی تھی6۔ پھر اسی مطبوعہ نسخہ سے مولوی مسیح الزماں کے اہتمام میں یہ کتاب باون صفحہ پر اُن کے مطبع مسیحائی واقع کانپور میں چھپ کر شائع ہوئی تھی7۔

مرزا قادر بخش صابر نے اکرام تخلص کے ایک شاعر کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''اکرام تخلص حکیم اکرم اللہ خاں خلف الصدق حکیم ہدایت اللہ خاں قدیم سے شاہجہاں
آباد میں متوطن اور مسجد جامع کے جوار میں ساکن ہے.....8''

نہیں کہا جاسکتا کہ یہی طبِ نبوی کے مصنف تھے اور صابر سے ان کے نام کے لکھنے میں سہو ہوا ہے یا یہ اُس سے مختلف شخص تھے۔

6۔ سیّد صالح محمدی

یہ بھی دہلی کے رہنے والے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے خانوادہ سے متعلق تھے۔ انھوں نے بچوں کی مذہبی تعلیم اور تربیت کے لیے ''تالیف الصبیان'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس کے شروع میں مولف نے اس کے بارے میں بہت سی مفید اطلاعات قلمبند کردی ہیں۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں اس کتاب کے جو قلمی نسخے موجود ہیں ان میں سے دو عبدالعزیز کاتب کے 1248ھ (1832-33) کے لکھے ہوئے ہیں9۔ ان میں سے ایک پر مؤلف کا نام ''سیّد صالح محمد'' اور دوسرے پر ''السیّد الصالح محمدی'' لکھا ہوا ہے

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے کتاب کا سال تالیف 1249ھ (1833-34) بتایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کی تالیف کا کام کم سے کم سال دو سال پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ اس کتاب پر شاہ محمد

اسحاق دہلوی نے نظر ثانی کی تھی، اور اب اس کے آغاز کی عبارت اس طرح نقل کی گئی ہے:

" اَلحمدللہ رَبِّ العَالَمِین وَالعَاقِبَتُ لِلمُتَّقِین.....:..10

"جان تو، جو نیک بخت کرے تجھ کو اللہ تعالیٰ بیچ دونوں جہان کے، کہ اس فقیر پُر تقصیر نے بیچ اس رسالے کے صفت ایمان کی اور عقیدے اور فرض اور واجب اور سنت اور مستحب اور مسائلِ ضروری نماز اور روزے اور حج اور زکوٰۃ کے کتابوں معتبر سے چن کر اور مختصر کر کر واسطے فائدہ اٹھانے خاص اور عام کے لکھے اور ترجمہ کیے اور واسطے آسان ہونے اور جلد سمجھنے عورتوں اور مَردوں اَن پڑھ کے نظم نہ کیا یعنی بیتوں میں نہ لکھا اور پر ایک مقدمے اور پانچ باب اور ایک خاتمہ کے منقسم کیا جاتا ہے اور ہر ایک باب میں کئی کئی فصلیں اور ہر ایک فصل میں کتنے کتنے مسئلے ہیں اور نام اس کا اتالیق الصبیان رکھا گیا اور بعد تمام ہونے کے اس ضعیف نحیف نے واسطے دور ہونے شک کے جو بعض مسئلوں میں رکھتا تھا اور خوف آخرت کے سے کہ یہ مقدمہ دینی ہے، شاید کہیں غلطی یا کہ زیادتی نہ ہوئی ہو، اول سے آخر تک اس رسالے کو چنے ہوئے فاضلوں اور پیشوا عالموں مولوی محمد اسحاق صاحب یعنی نواسے شاہ عبدالعزیز صاحب کے کو سلامت رکھے اللہ ان کو جو ساتھ علم اور حلم اور اخلاق کے تعریف کیے گئے ہیں، سنایا اور انھوں نے اول سے آخر تک خیال دل سے سُن کر جس جگہ شک اور غلطی تھی اصلاح فرمائی اور بہت پسند کیا اور آفریں فرمائی، بلکہ کئی سطریں عبارت عربیہ کی مقدمے اس کے میں ہاتھ مبارک سے دستخط فرمائیں اور ان کو اس عاجز نے تبرکا اور تیمنا اور دستاویز مضبوط سمجھ کر داخل اس رسالے کے کیا۔"

اس کتاب کے خاتمہ میں مولف سید صالح محمدی نے قارئین سے درخواست کی ہے کہ:

"امید نظر کرنے والوں اور پڑھنے والوں اس کے سے یہ ہے کہ جس جگہ اس ضعیف نحیف خاکسار گنہگار سے خطا یا بھول ہوئی ہو اس کو اصلاح فرمادیں اور دلیری کو معاف کریں اور ساتھ دعائے خاتمہ بخیر کے یاد کریں اور یہ گناہ اس عاصی پُر معاصی اور والدین اس کے سے درگذرے اور رحمت اپنی میں داخل کرے۔"

زبان اِس کتاب کی پرانی ہے۔ جملوں کی ساخت کے علاوہ اس میں بہت الفاظ بھی پرانے آئے ہیں۔ عربی کا اثر بھی اس پر غالب ہے۔

7۔ نصر اللہ

حکیم مولوی نصر اللہ خاں دہلی کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد حکیم ثناء اللہ خاں فراق اپنے وقت کے باکمال شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے والد کے تخلص کی مناسبت سے نصر اللہ خاں نے اپنا تخلص وصال مقرر کیا تھا۔ انھوں نے اردو نثر میں جو کتابیں لکھی تھیں ان میں واقعات کربلا سے متعلق ایک کتاب ''دہ مخزن'' بھی تھی جو خاصی مقبول ہوئی۔ اس کے ابواب کی تفصیل اس طرح ہے۔

11

مخزن پہلا:	ذکر رسول کریم صلعم
مخزن دوسرا:	ذکر نکاح حضرت فاطمہؓ و علی و پیدائش حسنین
مخزن تیسرا:	مناقب اہل بیت
مخزن چوتھا:	وصال حضرت نبی کریم صلعم و رحلت حضرت فاطمہؓ
مخزن پانچواں:	ذکر وصال حضرت علیؓ و حسنؓ
مخزن چھٹا:	فضائل حضرت حسین و ذکر یزید و حال مسلم بن عقیل
مخزن ساتواں:	حضرت حسینؓ کی مکہ سے روانگی، کربلا پہنچنا اور جنگ کا پیش آنا
مخزن آٹھواں:	شہادت عُرو دیگر اقربائے حسینؓ
مخزن نواں:	حضرت حسینؓ کی شہادت و احوال اہل بیت
مخزن دسواں:	حال قاتلان اہل بیت و شان امام

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں بھی موجود ہے۔ اس کے تعارف میں امتیاز علی خاں عرشی نے لکھا ہے کہ:

''یہ کتاب 1250ھ (=1834-35) میں تالیف کی گئی ہے کتاب میں جا بجا اپنے اشعار بھی درج کیے ہیں۔''12

اِس سلسلے میں خود مولف کا بیان قابلِ توجہ ہے جو اِس طرح ہے:

''جب یہ کتاب تالیف کی جاتی تھی سالِ ہجری بارہ سو اور پچاس تھے اور جب کہ ختم ہوئی بارہ سو اکاون (1835-36) تھے یعنی بیچ آخر سال اولیٰ کے اس کتاب کی تالیف اور ترتیب ہوئی اور بیچ ابتدائے سال ثانی میں یہ کتاب ختم ہوئی اور صرف دو مہینے کی مدت میں اس کی تالیف ہوئی۔''

کتاب دہ مخزن کا سبب تالیف مولف نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

''اس خاکپائے محبان اہل عبا نے اور قطرۂ دریائے اہل صفا نے یہ ارادہ کیا کہ ایک کتاب مختصر بیچ ذکر مناقب اہلِ بیت نبویؐ کے اور بیان شہادت اولاد مُرتضوی کے اس ترتیب سے تالیف کی جاوے کہ احوال سب مسلسل ہووے اور بیان میں بہ اعتبار تقدیم وتاخیر کے نہ کچھ خلل ہووے اور احوال آلِ عبا کی اصل وفرع کا اس میں تھوڑا تھوڑا سب ہو تو قصہ پر قصہ شہادت عظمیٰ کا ساتھ انتظام کے مرتب ہو۔''13

زبان اس کتاب کی بھی اس زمانے کے طریقہ کے مطابق عموماً صاف اور سلیس ہے البتہ قافیہ کا اکثر التزام کیا گیا ہے۔ ہندوستانی اصل کے لفظوں کا استعمال بھی کیا گیا ہے مثلاً سُدھ، پینگی، پیپلا وغیرہ۔ اسی طرح بعض متروک لفظ بھی اس زمانے میں مستعمل تھے چنانچہ تئیں، کسو اور اُمرائی، ناصبری وغیرہ۔

اس مقام پر یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لکھنے والے عموماً اپنی بات کی زیادہ سے زیادہ صراحت کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کوشش میں اکثر ایک ہی بات کو مکرر اور مختلف لفظوں میں لکھتے تھے اس سے کلام میں طوالت کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔

نصراللہ خاںؒ وصال کے بارے میں حکیم قطب الدین باطنؔ اور امتیاز علی خاں عرشیؔ وغیرہ کا دعویٰ ہے کہ:

''(یہ) کئی رسالوں کے مولف بھی ہیں۔''

لیکن افسوس ہے کہ دہ مخزن کے سوا کسی اور رسالے کا ان حضرات نے نام نہیں لکھا ہے۔

(س) تذکرے

احمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں جب سلطنت پر ادبار آیا، اہلِ علم و دانش کو اپنے تہذیبی، معاشرتی اور علمی معاملات و روایات کو کاغذ کی تحویل میں دے کر محفوظ کر دینے کا خیال ہوا اور اردو میں تذکرہ نویسی کا آغاز ہوا۔ اُس زمانے میں نثری تحریروں کے لیے معمولاً فارسی کا استعمال کیا جاتا تھا چنانچہ عالمگیر ثانی اور پھر شاہ عالم ثانی کے بھی زمانے میں جتنے تذکرے لکھے گئے تقریباً سب فارسی ہی میں تھے۔ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں البتہ علی ابراہیم خاں خلیل کے ایک تذکرے کا بہ یک وقت دو شخصوں نے اپنے اپنے انداز سے ترجمہ کیا تھا اور اس طرح اردو میں تذکرہ نویسی کی ابتدا ہوئی تھی لیکن کلکتہ کے ان ترجموں کا براہِ راست کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا چنانچہ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں بھی تذکرہ نویسی کے لیے فارسی ہی کا استعمال ہوتا رہا۔

1۔ تذکرۂ سَرور

اس تذکرہ کے مصنف نے بہت اختصار کے ساتھ اس کی تالیف کے مقصود کا بیان کیا ہے۔

"عاصی میر محمد خاں المتخلص بہ سَرور بہ سمع بلند فہمان نکتہ طراز و فصاحت نشان بلاغت پردازی رساند کہ از ابتدائے شباب ذوقِ شعر گوئی رشتہ در دل متمکن بود..... بہ خاطر فاتر خطور کرد کہ اشعار رشحۂ شعرائے ماضی و حال جمع نمودن بہ طور تذکرہ تالیف

نماید و معنی نکتہ و دقیقہ منظور دارد تا مطالعہ کنندگاں را طوالت رنج نیفزاید۔"1

مولف نے اپنے زمانۂ شباب میں اس کام کو شروع کر دیا تھا۔ مقصود اس سے شعرائے ماضی و حال کے کلام کو جمع کرنا تھا۔ شاعروں کے حالات کی فراہمی بس اسی حد تک کرنی تھی کہ اس کی وجہ سے اس مجموعہ کو تذکرہ کہا جا سکے چنانچہ اس مجموعے میں ایسے متعدد شاعروں کے اشعار بھی درج ہیں جن کے نام سے بھی مولف کو واقفیت نہیں تھی مثلاً: الفت، اکبر، احسن، احمد، امید، آشنا وغیرہ

اصل کام جو مقصود تھا شعروں کو جمع کرنا تھا چنانچہ بہ کثرت شاعروں کے بارے میں اس قسم کی عبارت درج ہے:

"اظہر تخلص، میر غلام علی، سید نے بودہ، از احوالش اطلاع بہ مولف نیست۔ شعر او کہ مسموع گشتہ ثبت می گردد۔"2

اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

"قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ اس میں شاعروں کی صحیح تعداد ایک ہزار پانچ ہے۔ سوانح سے زیادہ انتخاب اشعار پر زور دیا گیا ہے۔ بعض شعرا کے کئی کئی سو اشعار دیے گئے ہیں مثلاً مصحفی کے سات سو انیس شعر ہیں۔ تاریخی اور تنقیدی اشارے بھی کہیں کہیں ملتے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو پچھلے تذکروں سے مختلف ہو۔ گلشن بیخار مولفہ شیفتہ اور دوسرے تذکرے اس سے مستفید ہیں۔ اس میں بعض شعرا کے کچھ ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو اُن کے کلیات یا دواین میں نہیں ہیں۔ ترتیب بہ لحاظ حروف تہجی ہے لیکن مطبوعہ نسخے میں باقاعدہ ترتیب نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے ازسرِ نو ترتیب دے کر شائع کیا جائے۔" 3

اس تذکرے کی تاریخ سب سے پہلے میر نظام الدین خاں ممنون نے کہی تھی۔

جو تاریخ پوچھی تو ممنون نے کہا یہ ہے معیار نقد سخن

1215ھ

لیکن غالب علی خاں سید نے اس کے لیے تاریخی نام تجویز کیا۔

عمدہ منتخبہ اس کی وہیں سید نے لکھی تاریخ، وہی نام بھی اس کا رکھا

1216ھ

خیال کیا جاسکتا ہے کہ تذکرہ کی تالیف کا کام 1215ھ(=1801) میں شروع ہوا تھا۔ ایک برس میں مکمل ہوا۔ لیکن مولف نے اسی پر قناعت نہیں کی اور وہ اس میں تادیر تصحیح اور اضافے کا کام کرتا رہا، چنانچہ مطبوعہ تذکرے کے آخر میں تحریر ہے:

''الحمدللہ کہ بہ فضل ایزد متعال ایں نسخہ نہم محرم الحرام 1224ھ موافق سنہ جلوس مبارک حضرت بادشاہ جمجاہ گیتی پناہ فریدوں سپاہ..... ظل اللہ محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ.....صورت اختتام پذیرفت، در صنعت توشیح ابیاتے چند بہ گفتن آمد کہ اگر از ہر مصرعش سر حرف بگیرند ایں بیت جلوۂ ظہوری دہد ؎

اعظم الدولہ بہادر کے　　اِذن سے ان کا تذکرہ لکھا

اس کے بعد مذکورہ قطعہ لکھا جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

ہوئے واضح اسم تب ممدوح کا　　اس پہ عاشق نے کیا ہے اختتام

اس کے بعد ہے:

تمت تمام شد تذکرۃ الشعرا تالیف نواب اعظم الدولہ بہادر بہ تاریخ بست و ششم شہر رمضان المبارک بہ ساعت نجستہ و یوم مبارک تحریر یافت ''

اس تحریر کی روشنی میں یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ 1224ھ(=1809) میں بہ عہد اکبر شاہ ثانی مصنف نے اپنے تذکرے کو قطعی صورت دے دی تھی۔ اقتباسِ بالا سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اب تذکرہ کا وہ نام بھی نہیں رہ گیا تھا جو کئی برس پہلے غالب علی خاں سید نے تجویز کیا تھا یعنی عمدۂ منتخبہ چنانچہ اس نام سے اس کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔

میر محمد خاں سَرور اپنا تذکرہ مکمل کرکے اسے رواج دے چکے تھے لیکن اپنے مسودے میں موقع بہ موقع اضافے بھی کرتے رہے تھے چنانچہ مسرور کا حال اس طرح لکھا ہے:

''مسرور تخلص شیخ پیر بخش، وطنش قصبہ کاکوری من مضافات صوبہ اودھ نشو ونما در دارالامارت لکھنو یافتہ از شاگردان رشید غلام ہمدانی مصحفی است، مصلح اشعار بعض اشخاص آں جا است۔ از حسن اتفاق در سنہ ہست و سہ جلوسی قبلہ عالم ظل الٰہی جہاں میرزا محمد اکبر شاہ غازی اللہ ملکہ وسلطنتہ، این ہم مثل مرزا محمد مخدوم بخش ذکا ہنگام

مراتب مرشد زادہ عالیان مرتبہ ملازمی حاصل نمودہ دار و دار الخلافہ گشت۔ وقت
ملاقات خلیق و مودب و ذہین و قابل بہ امتحان آمد و کلام موزونش دلچسپ و سرور افزا۔
و دو دیوان اشعار مرتب نمودہ۔ از شیریں بیانی اوست۔"[4]

اس میں "از حسن اتفاق" سے آخر تک کی عبارت 1244ھ (=1828) میں یا اس کے بعد کسی وقت لکھی گئی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ تذکرے کے متن میں بہت بعد تک مصنف نے اضافے کیے ہیں۔

2۔ طبقاتِ سخن

یہ شیخ غلام محی الدین متخلص بہ عشق و جتلا میرٹھی کا تالیف کردہ تذکرہ ہے۔ اس کا پورا نام اس نے "جواہر تاریخ موسوم بہ طبقاتِ سخن" مقرر کیا تھا۔ اس نام کے جزو ثانی سے 1222 کے عدد برآمد ہوتے ہیں اور یہی اس کا سالِ تالیف ہے۔ مصنف نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس تذکرے میں

"عہد محمد شاہ بادشاہ سے لیکر تا زمانِ جلوس سنہ احد محمد اکبر شاہ خلد اللہ سلطنتہ مطابق سنہ یک ہزار و دو صد و بست و دو ہجری"

کے شاعروں کا احوال قلمبند کیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تذکرے کے دو حصے ہیں:

طبقۂ اول۔ اشعار ہندی شعرائے زمان ماضی و حال،

طبقۂ دوم۔ اشعار فارسی بہ ضمنِ خاتمہ و بعضے احوال

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ مولف کی توجہ اشعار کی طرف زیادہ ہے اور احوال کی حیثیت ثانوی ہے چنانچہ اکثر شاعروں کے حالات مختصر لکھے ہیں البتہ معروف شعرا کا ذکر خاصی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس نے صرف غزلوں کے شعر درج نہیں کیے ہیں بلکہ دوسری مختلف اصناف کی بھی اپنے تذکرے میں نمائندگی کی ہے۔

تذکرے کی ابتدا حمد و نعت سے کی ہے۔ اس کے بعد فنِ شعر کی اہمیت، شعر گوئی کی ابتدا اور نثر کے مقابلے میں نظم کی اہمیت وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ بحثیں دلچسپ بھی ہیں اور قابلِ توجہ بھی۔ شعرا کے حالات حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھے ہیں لیکن کہیں تخلص کے حرف اول کا خیال کیا ہے،

کہیں نام کے پہلے یا دو.....مجزوکی رعایت کی ہے۔

اس تذکرے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ مصنف نے حسب موقع نثر کے اقتباس بھی درج کر دیے ہیں اس طرح اس نے اردو نثر کی بعض اصناف کے نمونے بھی محفوظ کر دیے ہیں مثال کے طور پر ٹیکا رام تسلی کے ذکر میں لکھا ہے:

"دو نقل پارہ بہ زبان اردو بہ نظر در آمدہ، دریں جا بہ تحریری آید۔ نقل کی ہے کہ نادر شاہ جب شاہجہاں آباد میں داخل ہوا تو اس کی فوج میں سے کتنے مغل شہر کی سیر کو آئے۔ ایک ان میں بھوکا تھا۔ اتفاقاً کسی صابن گر کی دوکان میں صابن کے بڑے بڑے ڈلے نظر آئے۔ کہنے لگا:

ازیں چکیدی ہائے پنیر یکے زود بمن دہ کہ بسیار گرسنہ ام

صابن گر بولا: آغا صاحب یہ صابن ہے پنیر نہیں

تب جھنجھلا کر مغل نے کہا کہ: قرم ساق غلامی گوئی، بیار

جب اس نے دیکھا کہ مغل کا اندھا مانے گا نہیں ایک ڈلا صابن کا حوالے کیا۔ اس نے ایک بڑا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں ڈال لیا۔ سارے ہونٹ پھٹ گئے۔ زبان تڑک گئی۔ تب گھبرا کر کہنے لگا: اے وائے دہنم سوختہ شد

سب بازاری ہنسنے لگے اور ان سے کہا مرزا صاحب اس پنیر کا مزہ تو خوب چکھا۔ بڑا شرمندہ ہو کر گردن نیچی کیے ہوئے چلا گیا۔

ایک مغل تازہ ولایت ہندوستان میں آیا تھا۔ اتفاقاً کہیں سبزی منڈی میں جا نکلا۔ وہاں ایک کنجڑنی نوکری میں جامنیں بیچتی تھی۔ مغل نے پوچھا۔

اے کنجڑی ایں میوہ چہ نام دارد؟

بولی۔ مرزا جی ان کو جامنیں کہتے ہیں۔

مغل کے پاس پیسہ نہ تھا جو لے کر کھاتے۔ صورت ان کی یاد رکھی۔ پھرتے پھرتے کسی باغ میں آ نکلا۔ ایک جامن کے درخت کے نیچے کئی ایک جامنیں پڑی تھیں اور دو چار بھونرے بھی۔ یہ لگا اُن کو چن چن کے کھانے۔ ساتھ ہی لگا بھونروں کو چبانے۔ جب

منہ میں لگے کچر کچر کرنے تو مغل نے بولا: تم ہمیں کر دیا ہیں، میں کالا کالا ایک بھی نہ چھوڑوں گا۔"

شاہ عالم ثانی کے آخر زمانے میں شمالی ہند کے بیشتر مراکز پر اردو میں نقلوں کے لکھے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا بلکہ کلکتہ میں تو نقلوں کے چند مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے تھے۔ اس اعتبار سے جتلا کی ان نقلوں کی اہمیت ہے۔ افسانوی ادب کے سلسلے میں نقلوں کے مطالعہ اور تجزیے کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے۔

جتلا نے اپنے تذکرے میں اردو میں مراسلت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے مرزا پور کے حسین علی نامی ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو اردو میں خط لکھتا تھا۔ جتلا نے اس کے خطوں کا اردو ہی میں جواب دیا تھا۔ نمونہ یہ ہے:

سواد خط حسین علی۔

واقف موافقات سخن کے کاشف مکاشفات اس فن کے، باریکیوں کے اشعار کے شناسا، میاں صاحب تخلص بہ عشق و جتلا، ایک روز تحت اقتضائے وقت کے اتفاق مخزن محبت و وفاق شاہ آفاق کا بیچ غریب خانہ اس منزل شناس مطارحات آشنا و بیگانہ کے پڑا تھا اور ہر قسم کے اشعار آبدار زبان معنی ترجمان شاہ اس کے گوہر نشان ہوئے۔ نتائج خیال بینظیر مرزا جلال الدین اسیر کے سے ذکر ایک بیت کا درمیان آیا جو معنی جانے اس کے تلاش سے نہیں، حاضران صحبت کے غور اس کے میں غواص فکر کیے ہوئے لیکن مطلع صاف نہ دیکھا اور بیت وہ یہ ہے۔

بوئے گل و روے ماہ دارد　　آئینہ ہزار آہ دارد

آخرش رائے سب کی اس پر آئی کہ آگے اسی موشگاف زلف معشوقان سخن کے بھیجئے، امید کہ شاد کاری غور کی سے بیچ کا کل معنی کا کھولنا کر کے یاران صحبت کو سرو بخشیں اور مجھ کو بند فکر کے سے آزاد کریں۔ زیادہ ہمبستر معشوقۂ مراد کے ہو کر سب کو آرزومند ملاقات جانیں اور سلام

جواب از جانب جتلا۔

عاشق معشوق حسین کے میاں حسین علی سلمہ، گلدستہ گلزار کرم کا یعنی رنگین نامہ اس وقت کہ چشم انتظار کسی شاہراہ آرزو پر نرگس وار چار تھی، ہاتھ قاصد صبا رفتار کے اوتر نا اشفاق کا کر کے

آنکھوں کو نور اور دماغ کو.....وسرور بخشا۔ اگر چہ تقریر معنی مطلع اسیر کی جانی فکر سے نہیں لیکن واسطے تسکین خاطر نزہت آفریں کے صورت نمائے تحریر گر ہوں کہ آئینہ صاف طینتی سے وہ لطافت رکھتا ہے کہ جس وقت محاذی روئے معشوق کے ہو، تماشائے صفائی بہار چہرہ کی سی کہ بوئے گل اور روے ماہ دونوں وہاں موجود ہیں اور اوس دونوں کی یہ ضمیر آئینہ تاثیر برودت کی سی رنگ کلفت پکڑے نہ وہ شفاقی اور صافی اس کو موجود رہتی ہے قائم نہ رہے بلکہ دامان حسن آئینہ کا گرد آلود کدورت ہو، یہی تلاش کی۔ ایک شعر نتائج طبع اپنے سے یہ ناقص لکھتا ہے شعر

گشت زاں نرگسِ خواب آلودہ دید آئینۂ آب آلودہ

معنی اس کے یوں کہ جب تک چشم معشوق مائل بہ بیدار تھی آئینہ بھی گلچین بہار تماشا تھا وقتیکہ وہ درخواب آے، یہ بیکار پڑا، اس واسطے چشم پُر آب ہے۔ صاحب بندہ، اگر معنی دونوں بیت دقت پسند تمھاری کے آویں، مجھ کو ممنون اشفاق جانیں۔ زیادہ دعا''

یہ دونوں خط شاہ عالم ثانی کے آخری دنوں کے ہیں۔ اردو میں اتنے قدیم خط تا حال کسی اور مأخذ سے دستیاب نہیں ہوئے ہیں اس لیے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اردو میں خطوط نویسی کی تاریخ ان خطوں کی روشنی میں درست کی جانی چاہیے۔

3۔ تذکرۂ بے جگر

اس کے مصنف کا نام خیراتی لال، تخلص بے جگر، قوم کایستھ اور وطن سکندر آباد ضلع بلند شہر (یوپی) ہے۔ اس تذکرے کے بعض مقاموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ 1237ھ (=1822) میں زیر تالیف تھا، مثلاً:

> لالہ امولک رائے کایستھ بھٹناگر از رودسالے قدیم سکندر آباد۔ پدرش والا قدرش سپت رائے برادر خالہ زادۂ من است.....ناگاہ 1237ھ .....آں قرۃ العین سعادت ودیعت حیات بہ قاضی اجل سپرد.....تاریخ وفات او لالہ ہرگوپال تفتہ ایں چنیں یافتہ.....''

اور مہر چند فرخ آبادی کے بارے میں تحریر کیا ہے:

> ''تولد ارجمندش.....درسنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و دو ہجری بروز یکشنبہ در کورۂ

جہان آباد رفتہ و نمونہ رو.....عمر شریفش بہ پنجاہ و پنج سال رسیدہ۔"

اپنے تذکرے کے آغاز میں مصنف نے اتنا کہا ہے کہ:

"بندہ خیراتی لعل بے جگر مولف این تذکرۃ الشعرا شخصے است کہ در میدانِ سخن باوصفِ بیجگری علمِ بوالہوسی می.....می خواست کہ در گروہ نادرالافکارانِ سخندان داخل نمایہ.....بنابر آں چند شعر از کلام شکستہ بستۂ خود کہ فی الحقیقت ہر یکے راز آنہا پارۂ جگری تواند گفت دریں صحیفۂ سخن نسبت ارقام پذیرفت۔"

خیال ہے کہ اس نے اس تذکرے میں اپنے حالات ضرور لکھے ہوں گے لیکن اس کا جو واحد نسخہ دستیاب ہے اس میں اس کا احوال بالکل موجود نہیں ہے۔ تذکرے کے مندرجات کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے لکھا ہے:

"تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں میری گنتی کے مطابق 386 شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی اور خواتین بھی۔ ان میں متعدد شعرا ایسے ہیں جن کے بارے میں مولف کی معلومات بہت محدود ہیں۔ بعض جگہ صرف تخلص اور نام دے کر ایک دو شعر نمونے کے طور پر نقل کر دیے ہیں اور صاف لکھ دیا ہے کہ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ شعرا کے تراجم بہ لحاظ حروفِ تہجی درج کیے ہیں۔ ہر تخلص کو ذو معنیین بنا کر ابتدائی سطریں رعایت لفظی کے اہتمام کے ساتھ لکھی گئی ہیں.....ممتاز شعرا میں سے اکثر کے کئی کئی سو اشعار درج کیے ہیں۔ انتخابِ کلام کی اسی طوالت نے اس تذکرے کو ضخیم بنا دیا ہے۔"[5]

ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس تذکرے کے متن کا بخوبی جائزہ لینے کے بعد تحریر کیا ہے کہ:

"زیرِ نظر نسخہ کی کتابت 1241ھ (=1826) میں ہوئی ہے اور اضافہ و ترمیم کا سلسلہ کم از کم 1242 ہجری یا اس کے بعد کے قریبی زمانے تک جاری رہا ہے۔ بیجگر نے اس تذکرے کو زیادہ سے زیادہ جامع اور مفید بنانے کے لیے اپنے پیشرو تذکرہ نگاروں کے سرمایۂ معلومات سے ضرورت کے مطابق پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ سب سے زیادہ مدد مصحفی کے تذکرۂ ہندی اور جتلا میرٹھی کے طبقاتِ سخن سے لی ہیں.....

(بیجگر کی) کوشش یہ رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو انضباط سنین کے ساتھ ہر شاعر کی زندگی کے سارے اہم واقعات کا احاطہ کرلیا جائے اور اس کی شخصیت کے تمام اہم پہلو اجاگر کردیے جائیں.....وہ سوانح نگاری کے معاملے میں اپنے تمام معاصر اور پیشرو تذکرہ نگاروں سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔"5

بیجگر معمولی درجے کا شاعر ہے۔اس کی ایک غزل کے دو شعر درج ذیل ہیں ۔

ہاتھ سے قاتل کے کل اک نوجواں مارا گیا　　بیجگر شاید نہ ہو، دیکھو کہاں مارا گیا
بسکہ جیتے جی وہ خوں پیتا تھا اپنا رات دن　　ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا وہ جہاں مارا گیا

4۔تذکرۂ آزردہ

مفتی صدرالدین خاں نام، آزردہ تخلص، مولوی لطف اللہ کشمیری کے فرزند تھے۔ان کا سالِ ولادت لفظ "چراغ" سے (1204ھ (=1790) اور سالِ وفات "چراغ دو جہاں بود" (1285ھ=1868) سے برآمد ہوتا ہے۔دہلی میں صدرالصدور تھے اور انگریزی حکومت میں بھی معزز اور موقر تھے۔فارسی، اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور نوعمری میں اردو کے شاعروں کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔اس کے دیباچے میں ہے:

"می گوید بندۂ مسکین محمد صدرالدین کہ ایں تذکرہ ایست مختصر، در حالِ ریختہ گویانِ ہند واشعارِ منتخب آنہا کہ اصرار بعضے از دوستان ناگزیر لختے ایں کج زبان، ژولیدہ بیان را از اشغال عالیہ در تحریر ایں مقالہ باز داشتہ، التزام آں گرفتہ کہ حالِ مشاہیر ریختہ گویان ہند و اساتذۂ قرار دادۂ عصر بالکلیہ چہ از احیاء و چہ اموات با اشعارے کہ باسلیقۂ ایں پیچداں راست نمایند دریں اوراق درج کند۔"6

تذکرۂ آزردہ کا حوالہ سب سے پہلے شیفتہ کے تذکرے میں ملتا ہے۔سودا کے حال میں لکھا ہے کہ:

"ما قال شرف الاصل فخر الاماثل قدوۃ المحققین مولانا محمد صدرالدین ادام اللہ تعالیٰ ظلالہ علی مفارق المستفیضین وحرسہ عن آفات یوم الدین المتخلص بہ آزردہ در تذکرۂ خود کہ بہ ایجاز و اختصار تمام در حالِ ارباب نظم ریختہ نوشتہ است تحت ترجمہ میر تقی المتخلص

بہ میر.....''8

آزردہ اور پھر شیفتہ کی تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تذکرۂ آزردہ ''بہ ایجاز و اختصار تمام'' لکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل کا تعلق شاعروں کے احوال سے ہے۔ دوسرے جُو یعنی شاعروں کے کلام کی فراہمی کا الگ ذکر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مصنف نے اس پر محنت کی تھی۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اس تذکرے کے تعارف میں لکھا ہے:

''یہ تذکرہ بہت رواروی میں مرتب ہوا تھا۔ زمانہ تصنیف بھی ان (آزردہ) کی نسبتاً نا تجربہ کاری کا زمانہ ہے..... اس کا ترتیب تالیف میں مصحفی کے تذکرۂ ہندی اور قاسم کے مجموعۂ نغز پر انحصار کیا ہے..... جہاں ان دونوں تذکروں میں مزید معلومات موجود تھیں انھیں نظر ی کر دیا ہے.... بہت شاذ صورتوں میں انتخاب اشعار بھی ان دونوں مآخذ کے علاوہ کسی اور جگہ سے ہے..... تذکرے سے کسی خاص تنقیدی شعور کا بھی پتا نہیں چلتا۔''9

بیشتر امور میں کہ جن کی اس اقتباس میں نشاندہی کی گئی ہے تذکرۂ آزردہ منفرد نہیں ہے۔ تنقیدی شعور کا جیسا کہ اُس زمانے میں معیار و مزاج تھا، اس کے مطابق اس تذکرے میں بھی اظہار ہوا ہے۔ شیفتہ نے سودا کے ذکر میں جو بیان تذکرۂ آزردہ سے نقل کیا ہے، اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے۔

شیفتہ کے تذکرے میں اس کے حوالے کی موجودگی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ تذکرۂ آزردہ 1250ھ (=1834) سے پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ سید انشا کے حال میں اس تذکرہ میں لکھا ہے:

''دریں ایام مسموع شد کہ جنونش در گرفتہ۔''

نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خبر مولف (= آزردہ) نے کب سنی تھی۔ بہر نوع اس بنا پر کہ شاید یہ اطلاع جلدی سے جلدی مسموع ہو گئی تھی خیال کیا گیا ہے کہ آزردہ نے اپنا تذکرہ 1229ھ (= 1814) کے بعد کسی وقت لکھا ہوگا۔

اس تذکرے میں مرزا ابوظفر ظفر کو ہر جگہ ولی عہد لکھا ہے۔ محمد حسین آزاد کے مختلف بیانوں

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرزا سلیم اور مرزا جہانگیر وغیرہ کی وفات کے بعد ولی عہد مقرر ہوئے تھے۔ برکت علی خاں برکت خیرابادی (متوفی 1244ھ) اور خواجہ حسن کمھاری (متوفی 1241ھ) کے لیے اس تذکرے میں ایسے الفاظ آئے ہیں جن سے ان دونوں کے زندہ ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ اس کو مصنف نے 1244ھ (=1829) میں یا اس کے بعد کسی وقت قطعی صورت دی ہوگی۔ ایسی صورت میں یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ یہ آزردہ کی ناتجربہ کاری" کے زمانے کی تالیف ہے۔ تذکرہ کا متن بھی مولف کی ناتجربہ کاری کا مظہر نہیں ہے۔

مفتی صدرالدین خاں آزردہ نے اپنے تذکرے میں غزل کے شعروں کے علاوہ رباعی اور قطعے بھی نقل کیے ہیں اور حسب موقع شاعروں کے احوال میں ان کے قصیدوں، خمسوں وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تذکرہ قدر کے لائق ہے۔

5- گلشنِ بے خار

نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ وحسرتی نے اپنے کسی روحانی دوست کی فرمائش سے یہ تذکرہ لکھا تھا چنانچہ خود کہتے ہیں:

"ہمانا بہ امتثال امر یکے از احبائے روحانی کہ آرزوے جان وجانِ آرزو است، دل بیشتر از زبان بہ تسلیم کشاد ایں بار ننگ وعار بر سر گردنِ من نہاد۔"

وہ جانِ آرزو کون تھا؟ یہ بات شیفتہ نے نہیں بتائی اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تذکرے کے لیے تحریک کرنے کے پسِ پشت مقصود کیا تھا۔ شیفتہ نے اس بارے میں جو لکھا ہے وہ یہ ہے:

"مدّ نگاہ ازیں تالیف ومطمع نظر ازیں تصنیف فرد اورد ن اشعار دل آراست، نہ شمار اسامی شعرا، از آنکہ سامعہ فریب بیتے بہ نظر نہ رسید عام تر از مجاہیل ومعارف داحیا واموات نامشق دریں سفینہ چوں ابیاتش درج نہ گردید، لہٰذا از مشاہیر کم کسے است کہ شعرے لایق نہ داشتہ باشد، ناگزیر ایراد ہمہ شاں لازم آمدہ۔"

شیفتہ نے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اس مقصد کے لیے دواوین اساتذۂ سلف وخلف کے علاوہ "تذکرہ وسفاین وہر آنچہ بہ خاطر بود" کا مطالعہ کیا تھا لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ انھوں نے دہلوی تذکروں میں قدرت اللہ قاسم کے مجموعۂ نغز کو بھی نہیں دیکھا تھا جو شاہ عالم ثانی کے آخری

وقت میں مکمل ہو چکا تھا چنانچہ خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

"قاسم تخلص حکیم میر قدرت اللہ خاں از مردم مشہور دہلی است.....تذکرہ حال فکر ریختہ نگاشتہ است و بہ ملاحظہ نہ رسیدہ"

باوجود اس کے انھوں نے اپنے تذکرہ کو خود "کارنامہ" قرار دیتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"درایراد تراجم شعرا بہ ترتیب حروف ہجا حرف اول دثانی از تخلص ودر اشعار حرف آخر معتبر گشت..... وابتدائے ایں کارنامہ درابتدائے سال ہزار ودوصد وچہل وہشت از ہجرت بودہ وانتہا وانتہائے ہزار ودوصد وپنجاہ.....وامروز اشہب تیز گام عمر رواں بست وشش مرحلہ طے کردہ..... چوں ایں گلشن ولاویز وحدیقہ عشرت انگیز برنگ باغ بہشت از خس وخاشاک پاک است گلشن بیخار نام کردہ شدہ.....وانا محمد المدعو بہ مصطفیٰ ختم الذی بالحسنی وجعل آخر امری خیرا من الاولی التخلص بہ شیفتہ در ورریختہ وبہ حسرتی در فارسی۔"10

اس اقتباس میں اپنے تذکرے کو "برنگ باغ بہشت از خس وخاشاک پاک" کہنا اور اپنے نام کے دونوں اجزا کو الگ الگ کر کے اپنا تعارف کرانا خودستائی کی نہایت غیر مستحسن بلکہ مذموم صورت ہے۔ اللہ ہر صاحب ایمان کے قلم کو ایسی تحریروں سے محفوظ رکھے۔

شیفتہ کی دل پسندی میں بھی مصلحت کو دخل ہے مثلاً لکھتے ہیں:

"عزیز تخلص شیوناتھ از رباخواران دہلی است۔"

اسلام میں سود ہی نہیں شراب بھی حرام ہے لیکن شیفتہ نے ایک ایسے شخص کو جو اسلام کا پابند نہیں ہے "رباخوار" کہنا ضروری سمجھا اور اپنے قریب ترین ایک شخص کو جو بادہ ومینا کو نظر کے سامنے سے ہٹنے نہ دیتا تھا انھوں نے "از بادہ خواران دہلی" نہیں کہا۔ اسی تفریق وامتیاز کو دیکھ کر حکیم میر قطب الدین خاں باطن نے لکھا ہے:

"گلشن بے خار تالیف نواب مصطفیٰ خاں متخلص بہ شیفتہ جو اول سے آخر تک دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہیں نوابی پر فریفتہ۔ سب کو حقارت سے یاد کیا۔ اپنی اوقات کو برباد کیا بجز سات شخصوں کے.....مرزا نوشہ متخلص بہ اسد وغالب، آشنائے مومن

خاں متخلص بہ صاحب، مولوی محمد صدرالدین خاں متخلص بہ آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں
متخلص بہ شیفتہ مولف گلشن بے خار، رمجو آشنائے صاحب گلشن بے خار متخلص بہ
نزاکت، غلام علی خاں متخلص بہ وحشت، مومن خاں متخلص بہ مومن۔"11

واقعی بات ہے کہ یہ تذکرہ شیفتہ نے چوبیس چھبیس برس کی عمر میں لکھا تھا۔ کچھ اس نئی عمر کا غرور اور کچھ نواب زادگی کا فتور، اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"لنا طبع باہر روش چناں مناسب افتادہ کہ بہر شیوہ سخن ی کنم کہ ہمانا طرز خاص من است وایں سخن اگر مجموعہ نظم ونثری بنی مسلم ی داری۔"

شیفتہ کا دعویٰ ہے کہ اس تذکرے سے انھیں "شمار اسامی شعرا" مقصود نہیں ہے لیکن ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس کے تجزیے کے بعد کہا ہے کہ:

"قرب زمانی ومکانی، ذاتی تعلقات اور دوسرے ذرائع ووسائل کی موجودگی میں صرف چند تعارفی جملوں پر اکتفا کرتے ہوئے اشعار نقل کر دینا ان کی سہل انگاری کا ایک بین ثبوت ہے۔"12

اس تذکرے کے تفصیلی مطالعے کے بعد ڈاکٹر حنیف نقوی نے صحیح لکھا ہے کہ:

"شیفتہ کے اندر ایک اچھے تذکرہ نگار کی صلاحیتیں ضرور موجود تھیں لیکن یہ عصری معیار وسیلان کے تابع رہیں اور روایات کی زنجیریں توڑ کر مقررہ حدود سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بحیثیت مجموعی وہ گلشن بے خار میں کوئی ایسی بات پیدا نہ کر پائے جسے ان کا امتیازی کارنامہ قرار دیا جا سکے۔"13

شیفتہ کا تذکرہ گلشن بے خار پہلی مرتبہ مطبع لیتھوگرافک دہلی اخبار میں مولوی محمد باقر سپرنٹنڈنٹ کے اہتمام سے 1253ھ/ 1837 میں چھپا تھا۔ اس پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ کوئی چالیس بیالیس سال پہلے راقم نے حلیم انٹر کالج کانپور کی لائبریری میں دیکھا تھا۔ اب سُنا کہ وہ ضائع ہو گیا۔ افسوس ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ طباعت کے وقت تک بھی شیفتہ اس کے متن میں اضافے کرتے رہے تھے چنانچہ ذیل کے اقتباسوں سے ظاہر ہے۔

"رنگین تخلص، سعادت یار خاں..... بعد پایان آمدن ایں تذکرہ عمرش بسر آمد وکان

ذالک فی شہر جمادی الثانی سنہ ہزار و دو صد و پنجاہ و یک ہشتاد سال زندگانی کرد.....

دیدہ شد۔"

اور:

"ناسخ تخلص شیخ امام بخش.....مدتے از ترتیب و تہیش ایں رسالہ پدید آمد کہ

دیوانے دیگر از افکار و قاوش فراہم آمدہ و بہم در شہر رسید.....نگارش یافتہ"

اس تذکرے کا دوسرا ایڈیشن اسی مطبع سے 1259ھ (=1843) میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق کے سلسلۂ حالات میں قاضی عبدالودود صاحب مرحوم نے اطلاع دی تھی کہ پہلے ایڈیشن میں ان کے صرف اکتالیس شعر لکھے تھے۔ آخری شعر یہ تھا:

موذیوں کو حق نہ دے آنکھیں کہ نالادیں بلا عین حکمت تھی کہ معدوم البصر عقرب بنے

اس کے بعد ذیل کی وضاحت کے ساتھ ایک سو اکسٹھ شعر مزید لکھے گئے:

"یہاں تک اشعار تذکرۂ سابق میں سے نقل کیے گئے اور باقی مہتمم مطبع نے بہت کوشش سے بہم پہنچا کر لکھے ہیں۔"

مہتمم مطبع سے مولوی محمد باقر مراد ہیں۔ ان اضافہ کردہ شعروں میں دو شعر مکرر لکھے گئے یعنی وہ سابقہ اندراج میں بھی شامل تھے۔ پانچ شعر ایسے ہیں جو دیوان ذوق مرتبۂ ظہیر دویران وغیرہ میں شامل نہیں ہیں۔

بعد میں یہ تذکرہ جو مطبع نولکشور سے چھپا تو اضافے سے متعلق مذکورہ نثری عبارت حذف کر دی گئی۔

(ع) مطبعے

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد بنگال میں چھاپے خانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر اندرونِ ملک جیسے جیسے انگریزوں کو تسلط حاصل ہوتا گیا مختلف مراکز پر بتدریج مطبعے قائم کیے جانے لگے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بیشتر مرکزوں پر چھاپہ خانہ لگانے کے معاملہ میں پہل کرنے کا سہرا انگریزوں ہی کے سر ہے۔

شاہجہاں آباد (دہلی) میں اکبر شاہ ثانی کے عہد میں چھاپہ خانہ پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ کرنل پیو، ڈاکٹر رین کن اور اور جان ٹیلر نے بعض ہندوستانیوں کے تعاون سے ایک مطبع قائم کیا جس میں ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار دہلی گزٹ کے نام سے چھپتا تھا[1]۔ یہ مطبع 1833 (=1248-49ھ) میں قائم کیا گیا تھا اور یہ مطبع دہلی گزٹ کے نام سے معروف ہوا تھا۔

1836 (1252ھ) میں مولوی محمد باقر نے بھی اپنا مطبع قائم کیا جسے عام طور سے مطبع دہلی اردو اخبار کہتے ہیں۔ راقم نے اس مطبع میں چھپا ہوا گلشن بے خار دیکھا ہے اس کے سرورق کی پوری عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے:

"گلشنِ بے خار تذکرہ اشعار زباں اردو من مؤلفات

نواب مصطفےٰ خان بہادر متخلص بہ شیفتہ خلف الصدق عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ

خان بہادر مظفر جنگ

در مطبع لیتھوگریفک دہلی اخبار باہتمام مولوی محمد باقر سپرنٹنڈنٹ مطبوع شد

کاتب 1253 ہجری نبویؐ پریس مین

سید مراد علی 1837 عیسوی رام پرشاد"

جناب محمد عتیق صدیقی نے اس مطبع سے شائع ہونے والے اخبار کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ:

"اس کا پہلا نام 'اخبار دہلی' تھا جو 10 مئی 1840 (1256ھ) کو تبدیل ہو کر دہلی اردو اخبار ہو گیا اور پھر 12 جولائی 1857 (1273ھ) کو اس کا نام سرے سے بدل کر اخبار الظفر ہو گیا۔ اس نام سے اخبار کے صرف دس شمارے نکلے۔"[2]

اس مطبع کا نام بھی اخبار کے نام کے ساتھ بدل کر "مطبع دہلی اردو اخبار" ہو گیا تھا۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق نے 1271ھ (=1854) میں وفات پائی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

[3] "اردو اخبار اُن دنوں دہلی میں جاری تھا۔"

اخبار اور مطبع کے نام کے سلسلے میں آزاد کی اس تحریر پر اعتماد کیا جانا چاہیے۔

حواشی

1	مجموعہ نغز	حصہ 1	ص18 تا19
2	ایضاً	ایضاً	ص344
3	خمخانۂ جاوید	جلد4	ص552
4	آب حیات		ص425
5	مجموعہ نغز	حصہ 1	ص54 تا55
6	عمدہ منتخبہ		ص15 تا16
7	گلشن بے خار		ص18
8	خوش معرکۂ زیبا	جلد1	ص136
9	طبقات شعرائے ہند		ص357
10	دہلی کا یادگار مشاعرہ		ص44 تا46
11	مجموعہ نغز	حصہ 1	ص263

12 گلشن بے خار ص44

13 ایضاً ص160

14 دہلی کا یادگار مشاعرہ ص45

15 خم خانۂ جاوید جلد 4 ص304۔ کریم الدین کا کہنا ہے کہ ''تخمیناً 1827 میں فوت ہوا۔'' (طبقات ص:238)

16 مجموعہ نغز حصہ 1 ص328۔ لالا سری رام نے ان کے تخلص رنگین اور شائق بھی لکھے ہیں۔

17 عمدہ منتخبہ ص338

18 مجموعہ نغز حصہ 1 ص291

19 طبقات شعرائے ہند ص330

20 مجموعہ نغز حصہ 1 ص366

21 ایضاً حصہ 1 ص346

22 عمدہ منتخبہ ص380

23 مجموعہ نغز حصہ 2 ص31

24 ایضاً حصہ 2 ص92 تا 93

25 ایضاً دیباچہ ص لو

26 ایضاً ایضاً ص لہ

27 طبقات شعرائے ہند ص319

28 مجموعہ نغز حصہ 2 ص49

29 تذکرۂ ہندی ص157

30 عمدہ منتخبہ ص459

31 گلشن بے خار ص149

32 مجموعہ نغز حصہ 1 ص385 تا 386

33 عمدہ منتخبہ ص427

34	گلشن بے خار		ص134 تا 135
35	طبقات شعرائے ہند		ص376
36	مجموعہ نغز	حصہ 2	ص151
37	ایضاً	حصہ 1	ص31
38	عمدہ منتخبہ		ص57
39	مجموعہ نغز	حصہ 2	ص272
40	مجالسِ رنگین		ص16 تا 17
41	آب حیات		ص400
42	گلشن بے خار		ص230
43	آب حیات		ص436 تا 438
44	ایضاً		ص392 تا 394
45	دیوان ذوق مرتبہ آزاد		ص83
46	عمدہ منتخبہ		ص411
47	مجموعہ نغز	حصہ 1	ص372
48	آب حیات		ص425
49	عمدہ منتخبہ		ص148
50	آب حیات		ص472
51	ایضاً		ص426
52	ایضاً		ص461 تا 462
53	ایضاً		ص464 تا 465
54	آب حیات		ص421 تا 422
55	تذکرہ سرور		ص271 تا 272
56	آب حیات		ص422

57	مجموعہ نغز	حصہ 2	ص385
58	آب حیات		ص429
59	دیوان ذوق (آزاد)		ص133
60	ایضاً		ص98 تا 99
61	ایضاً		ص108
62	آب حیات		ص451 تا 452
63	مجموعہ نغز	حصہ 2	ص201 تا 202
64	تذکرہ سرور		ص682 تا 683
65	آب حیات		ص427 تا 429
66	دیوان ذوق	مرتبہ آزاد	ص11 تا 12
67	سعادت یار خاں رنگین		ص371
68	آب حیات		ص432
69	گلشن بے خار		ص183 تا 184
70	آب حیات		ص431 تا 432
71	غالب نامہ جنوری 1985		ص52
72	ایضاً		ص51
73	تذکرۂ سرور		ص116
74	گلستان بے خزاں		ص171 تا 173
75	صبح گلشن		ص430 تا 431
76	آب حیات		ص481 تا 482
77	گلشن بے خار		ص139
78	عود ہندی		ص260
79	بیاض غالب		ص297

80	غالب کا الحاقی کلام مشمولہ اردو جنوری تا مارچ 1969		ص355 تا363
81	نسخۂ حمیدیہ (بھوپال)		ص5 تا6
82	نسخۂ شیرانی اور دوسرے مقالات		ص5 تا6
83	معاصر پٹنہ	حصہ 12	ص47
84	تذکرہ ہندی		ص55
85	ایضاً		ص47
86	ایضاً		ص238
87	مجموعۂ نغز	حصہ 2	ص212
88	گلشن بے خار		ص187 تا188
89	آب حیات		ص404 تا408
90	گلستانِ بے خزاں		ص223 تا225
91	تذکرہ سرور		ص651
92	گلشن بے خار		ص195 تا197
93	آب حیات		ص408
94	ایضاً		ص408 تا409
95	نگار لکھنو مومن نمبر		ص12

قصیدہ

1	آب حیات	ص453
2	دیوان ذوق، مرتبہ تنویر علوی	ص273
3	آب حیات	ص420
4	ایضاً	ص439 تا440
5	دیوانِ ذوق مرتبۂ آزاد	ص306
6	آب حیات	ص409

7	نسخہ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں		ص22
8	یادگار غالب		ص90
9	آب حیات		ص493
10	دیوان غالب مطبوعہ 1841		ص95
11	آب حیات		ص499

ہجو و ہزل

1	گلستان سخن	جلد1	ص280 تا 282
2	آب حیات		ص494 تا 497
3	گلستان سخن	جلد1	ص427
4	گلشن بے خار		ص145 تا 146
5	ایضاً		ص161
6	آب حیات		ص454

مثنوی

1	گلستان سخن	جلد2	ص385
2	مجموعہ نغز		ص382
3	ایضاً	حصہ2	ص222
4	مخطوطات پنجاب لائبریری لاہور		ص78
5	سخن شعرا		ص462
6	مجموعہ نغز	جلد1	ص294 تا 295
7	ہماری زبان علی گڑھ یکم نومبر 1960		ص8 تا 9
8	ایضاً 22 جولائی 1960		ص7
9	آب حیات		ص460
10	علی گڑھ اردو مخطوطات		ص240

11	ہماری زبان 15 اگست 1960		ص6
12	دیوان ذوق مرتبہ آزاد		ص15
13	یادگار غالب		ص97
14	گلشن بے خار		ص123
15	اردو مثنوی شمالی ہند میں		ص400
16	ایضاً		ص407
17	علی گڑھ اردو مخطوطات		ص426 تا 427
18	طبقات شعرائے ہند		ص433 تا 434
19	گلزار ابراہیم مطبوعہ کانپور 1904		ص2
20	علی گڑھ اردو مخطوطات		ص154
21	ایضاً		ص183
22	گلشن بے خار		ص16

نامۂ منظوم

1	آب حیات		ص453 تا 454
2	دیوان ذوق مرتبۂ آزاد		ص259 تا 260

مرثیہ وغیرہ

1	دیوان ذوق مرتبہ آزاد		ص30
2	ایضاً		ص148
3	گلشن بے خار		ص181 تا 182
4	تذکرۂ ہندی		ص223 تا 224
5	ایضاً		ص24
6	تذکرۂ ہندی		ص28
7	خوش معرکہ زیبا	جلد ا	ص397

رباعیات دمستزاد

1	اردو رباعیات	حاشیہ	ص320
2	آب حیات		ص400
3	کاشف الحقائق		ص551
4	دیوان ذوق (مرتبہ آزاد)		ص256
5	اردو رباعیات		ص327

قطعات

1	دیوان ذوق آزاد	ص257
2	کاشف الحقائق	ص540

تضمین

1	آب حیات	ص430
2	ایضاً	ص471
3	ایضاً	ص447
4	ایضاً	ص472

تاریخ گوئی

1	آب حیات	حاشیہ	ص396
2	آب حیات		ص454
3	ایضاً		ص440
4	ایضاً		ص469 تا470
5	گلشن بے خار		ص65
6	آب حیات		ص411
7	ایضاً		ص412

معمہ

1	آب حیات		ص412
2	صہبائی، ایک مختصر تعارف		ص43
3	ایضاً		ص55
4	ایضاً		ص56 تا 57
5	ایضاً		ص81

پہیلیاں، گیت (ٹھمری وغیرہ)

1	آب حیات		ص474
2	ایضاً		ص412 تا 413
3	سعادت یار خاں رنگین		ص346 تا 347
4	آبِ حیات		ص454
5	ایضاً		ص472 تا 474
6	ایضاً		ص474
7	انتخاب دواوین		ص370

مذہبی نثر

1	مخطوطاتِ اردو، رامپور		ص65 تا 67
2	اردو نثر میں علما کا حصہ		ص112 تا 123
3	مخطوطات اردو، رامپور		ص75 تا 76
4	علما کا حصہ		ص182 تا 185
5	اردو مخطوطات علی گڑھ		ص111
6	یادنامۂ داؤدی		ص216
7	ایضاً		ص184
8	گلستانِ سخن	جلد ۱	ص273

9	اردو مخطوطات علی گڑھ	ص31 تا 32
10	اردو نثر میں علما کا حصہ	ص269 تا 273
11	ایضاً	ص273 تا 279
12	مخطوطات اردو، رامپور	ص342

تذکرے

1	تذکرۂ سرور	ص1 تا 2
2	ایضاً	ص23
3	اردو شعرا کے تذکرے	ص218 تا 220
4	تذکرۂ سرور	ص660
5	ایضاً	ص 272 تا 273
6	شعرائے اردو کے تذکرے	ص 672 تا 674
7	گلشن بے خار	ص100
8	تحریر، دہلی جلد 4 نمبر 4	ص13 تا 150
9	گلستان بے خزاں	ص4
10	شعرائے اردو کے تذکرے	ص829
11	ایضاً	ص857

مطبعے

1	ہندوستانی پریس	ص142 تا 143
2	صوبہ شمالی و غربی کے اخبارات حاشیہ	ص110
3	دیوان ذوق مرتبۂ آزاد	ص18

3-آگرہ، گوالیار

(الف) غزل 295

(1)

1-نظیر شیخ ولی محمد 295
2-ظاہر میر محمدی 300
3-باطن میر طب الدین 301
4-بخشی شیخ حسین بخش 303
5-عاشق شیخ نبی بخش 303

(2)

6-راجا بلوان سنگھ 307
7-اسیر میر گلزار علی 310
8-انصاف عبدالرحمٰن خاں 311
9-افصح آغا حیدر علی خاں 312
10-جولاں الف شاہ 313
11-غافل بختاور سنگھ 314
12-مرزا آغا مرزا 315

(3)

13-سلیمان مرزا سلیمان شکوہ 317
14-جوان مرزا نعیم بیگ 319
15-خالق عبدالخالق 320
16-مسرور شیخ پیر بخش 320

(4)

17-بزاز شیخ حسین بخش 323
18-مہر مرزا حاتم علی بیگ 323
19-صفدر میر صفدر علی 325
20-غمگین مرسید علی 326
21-موج خدا بخش 327
22-لہر بیدار بخش 329
23-محو حسین علی خاں 329
(ب) ہزل و ریختی 331
1-نظیر ولی محمد 331
2-ذلیل نوبہار 332
(ج) خمسے وغیرہ 333
1-نظیر شیخ ولی محمد 333
2-باطن میر قطب الدین 336
(د) رباعی 337
1-نظیر شیخ ولی محمد 337

2-مرزا سلیمان شکوہ	338
(ہ) مثنوی	339
1-نظیر شیخ ولی محمد	339
2-ذوالفقار علی	344
3-سید نجیب اللہ شاہ	346
(و) تاریخ و معمہ	347
1-اعظم میر اعظم علی	347
2-امیر گلزار علی	348
3-باطن میر قطب الدین	348
4-رہا، غلام محمد خاں	350
(ز) ضلع جگت وغیرہ	351
1-ہدایت شیخ ہدایت علی	352
(ح) نثر (خطوط و تراجم)	353
1-شوق شیخ الٰہی بخش	353
2-سدا سکھ لال	355
(ط) مطبعے اور اخبار	357
حواشی	358

(الف) غزل

(1)

حکیم میر قطب الدین باطن نے شہر اکبرآباد (آگرہ) کو کہیں "حیدِ دہلی" اور کہیں "فخرِ دہلی" لکھا ہے، سلطنت مغلیہ کے ابتدائی زمانے کا خیال کریں یا محمد شاہی دور میں اردو شاعری کے ارتقائی معاملات پر نظر کریں تو ان کے اس ادعا میں کم و بیش صحت کا عنصر معلوم ہوتا ہے۔

1۔ نظیر

انیسویں صدی عیسوی کے اوائل (تیرہویں صدی ہجری کے ربع اول) میں اس شہر کے شعری ماحول پر نظیر اکبرآبادی اور ان کے بعد ان کے تلامذہ عملاً چھائے ہوئے تھے، دہلوی تذکرہ نویس نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے نظیر کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> "نظیر تخلص، شیخ ولی محمد اکبرآبادی، خانہ در جوار روضۂ تاج گنج کہ بیرون شہر مذکور است دارد.... گویند کہ نظیر در حلم و خلق و انکسار بے نظیر روزگار است، بہ تعلیم صبیان بسری برد، کم مدت است کہ از ایں خاکداں بہ روضۂ رضواں رفت، اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیان جاریست و نظر بہ آں ابیات در اعداد شعرا نہ شایدش شمرد، لہٰذا بہ رعایت ابیات منتخب قطع نظر کردہ شد"۔1

اس اقتباس میں لفظ گویند اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ شیفتہ ذاتی طور پر نظیر سے واقف نہیں تھے، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہے، جو لوگوں کی زبان سے سن لیا تھا، اور سنی سنائی بات کے بارے میں بحثیں کرنا فضول ہے، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نظیر کے بہ کثرت اشعار سودا بیچنے والوں اور بنجاروں وغیرہ کی زبان پر جاری تھے، ساتھ ہی ان کے یہاں ایسے اشعار بھی موجود تھے جو خاص پسند ہو سکتے تھے، شیفتہ نے ان کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ بلاشبہ اچھے ہیں، اور جو شاعر ایسے شعر کہہ لیتا ہو اُسے کامیاب غزل گویوں میں شمار کرنے میں ہرگز کوئی قباحت نہیں ہے، شیفتہ نے بھی نظیر کے ذکر کو اپنے تذکرے میں نہ صرف جگہ دی ہے بلکہ ان کی بعض خوبیوں کی وجہ سے انھیں بے تکلف "بے نظیرِ روزگار" بھی قرار دیا ہے، نظیر کے جو اشعار انھوں نے نقل کیے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

سمجھوں کو ہے، ہمیں خونابِ دل پلانا تھا — فلک ہمیں پہ تجھے کیا یہ زہر کھانا تھا
ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد — وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا
سرچشمۂ بقا سے ہرگز نہ آب لاؤ — حضرتِ خضر کہیں سے جا کر شراب لاؤ
عشق پھر رنگ وہ لایا ہے کہ جی جانے ہے — دل کا یہ رنگ بنایا ہے کہ جی جانے ہے
میں دست و گریباں ہوں دمِ بازپسیں سے — ہمدم اُسے لانا ہے تو لا جلد کہیں سے
کچھ نہ دیکھا ہم نے جز بیداد تیرے ہاتھ سے — اے مرے بیداد گر فریاد تیرے ہاتھ سے

یہ آخری مطلع جس غزل کا ہے اُسے محسن نے بھی اپنے تذکرے میں نقل کیا ہے، محسن، نظیر کا مداح معلوم ہوتا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"شاعر نامی میر ولی محمد مرحوم نظیر، صاحب دیوان، مشاہیر شعرائے اکبر آباد میں سے ہے، ان کا جوگی نامہ و کوڑی نامہ وغیرہ جو فصاحت و بلاغت سے مملو ہے، وہ تمام عالم میں مشہور ہے"۔[2]

محسن کے اس تذکرے میں نظیر کی ایک اور غزل کے بھی شعر نقل ہوئے ہیں، ان میں سے دو یہ ہیں:

جب لے چلا وہ دل مرے پہلو سے کھینچ کر — دل سے مرے صدا یہی نکلی کہ ہائے دل

اب تو تری جفا سے یہ مانگوں ہوں میں دعا ظالم خدا کرے کہ کہیں تو لگائے دل

نظیر نے اپنے زمانے میں مروج بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی تھی، باطن کا بیان ہے کہ:

''غزل، مستزاد، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، معشر، رباعی، قطعہ بند،
ترکیب بند، ترجیع بند، تضمین، واسوخت، بحر طویل وغیرہ ہر ایک کو متعدد تحریر فرمایا''۔3

اور انھوں نے نظیر کی غزلوں کے کوئی تین سو منتخب اشعار سے اپنے تذکرے کو مزین کیا ہے، چنانچہ نظیر کے قادر الکلام اور باکمال استاد ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، یہاں بحر طویل میں ان کے کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

مصرع اول

ایک دن باغ میں جاکر چشم حیرت زدہ واکر
جامۂ صبر قبا کر طائرِ ہوش اڑا کر
شوق کو راہنما کر مرغِ نظارہ اُڑا کر
دیکھی رنگت جو چمن کی خوبیِ نسرین و سمن کی
شکل غنچوں کے دہن کی تازگی لالہ کے تن کی
تازگی گل کے بدن کی کشتِ سبزے کی ہری تھی
نہر بھی لہر بھری تھی ہر خیاباں میں تری تھی
ڈالی ہر گل کی ہری تھی خوش نسیمِ سحری تھی
سرو و شمشاد و صنوبر سنبل و سوسن و عرعر
نخل میوے سے رہے بھر نفس باد معنبر
در و دیوار معطر کہیں قمری تھی مطوق
کہیں انگور معلق نالے بلبل کے مدقق
کہیں غوغائی کی بق بق اس قدر شاد ہوا دل
مثل غنچہ کے گیا کھل غم ہوا کشتہ و بسمل

شادی خاطر سے گئی مل خوبی ہوگئی حاصل
روح بالیدہ ہو آئی شانِ قدرت دی دکھائی
جان سے جان میں آئی باغ کیا تھا گویا
اللہ نے اس باغ میں جنت کو اُتارا

مصرع ثانی

ناگہاں صحن چمن میں مجمع سرو سمن میں
جیسے ہو روح بدن میں جیسے ہو شمع لگن میں
جیسے خورشید کرن میں ماہ پروین دپرن میں
دیکھا اک دلبر رعنا طرح دار جفا کار
دل آزار نمو دار نگہ ہمسر شمشیر
مژہ ترکش پر تیر سر و زلف گرہ گیر
دل خلق کی زنجیر جبیں نور کی تصویر
وہ رخ شمس کی تنویر زباں شہد بیاں بشر
نظر روح کی اکثر دہن غنچۂ خاموش
سمن برگ برد دوش سخن بحر گوہر جوش
بدن سر و قبا پوش چھڑی گل کی ہم آغوش
دار خم فراموش ہر اک آن ستم کوش
عجب حسن دل آرا نہ کبھی مہر نے دیکھا
نہ کبھی ماہ نے دیکھا نہ کسی فہم میں آیا
تصور میں سمایا وہ نظر مجھ کو جو آیا
مجھے حسن اپنا دکھایا دل نے اک جوش اٹھایا
جی نے سب ہوش اڑایا

سر کو پاؤں پہ جھکایا　　اشک آنکھوں سے بہایا
اس نے جب یوں مجھے پایا　　یہ سخن ہنس کے سنایا
کہ تو ہے عاشق شیدا　　کہیں عاشق نہیں پیدا
ہووے تجھ پر یہ ہویدا　　کہ اگر ہم کو تو چاہے
یا محبت کو نباہے　　نہ کبھی غم سے کراہے
نہ کسی غیر کو چاہے　　نہ کبھی گل کی طرف دیکھ
نہ سنبل کی طرف دیکھ　　نہ بلبل کی طرف دیکھ
نہ بستاں پہ نظر کر　　نہ گلستاں میں گذر کر
چھوڑ دو سب کی مودت　　ہم سے رکھ دل کی محبت
اس میں ہم بھی تجھے چاہیں　　تجھ سے الفت کو نباہیں
ہیں یہی چاہ کی راہیں　　گر یہ مقدور تجھے ہو
اور یہ منظور تجھے ہو　　تو نظیر آج سے یا تو
چاہنے والا ہے ہمارا

نظیر کا یہ کلام ان کی مشاقی اور قادر الکلامی ہی کا مظہر نہیں ہے، بلکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں زبان و بیان پر اپنی حاکمانہ قدرت کا احساس و ادراک بھی تھا، اور انھوں نے ضرورت اور موقع کی مناسبت سے اس کا بخوبی اظہار بھی کیا تھا۔

نظیر اکبر آبادی کے تعارف میں مولوی کریم الدین نے اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا ہے کہ:

> ''لڑکوں پر بہت عاشق ہوتا تھا، اور رات دن اسی خیال میں رہتا تھا، شعر بھی اس لیے اس نے کہنے شروع کیے تھے،.....وہ صاحب دیوان ہے اور اشعار ہر ایک قسم کے اس نے تصنیف کیے ہیں، ایسے آدمی کم ہوتے ہیں، جیسا کہ نظیر پُر گو تھا، ایک جوگی نامہ اس کا بہت مشہور ہے، اور ایک بنجارہ نامہ.....ان اشعاروں میں حق شاعری بھرا ہے۔''[4]

مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرے میں بعض شاعروں کے ذکر میں بے تکے اضافے کیے ہیں، یہاں بھی لڑکوں کی عاشقی کی بات محض فضول ہے، کسی معاصر نے ایسا نہیں لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ نظیر لڑکوں کی تدریس پر بسر کرتے تھے، اس لیے انھیں اپنے شاگردوں کی تعداد میں اضافے کی فکر رہتی ہوگی، اسی سے کسی بدگمان نے وہ بات بنالی ہوگی، جو کریم الدین نے لکھی ہے۔

آگرے میں نظیر کے شاگردوں کی تعداد خاصی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ اس شہر کی محفلوں کی آبادی اور رونق میں ان کو بہت دخل رہا ہے، نظیر نے عوامی بول چال کی زبان کا استعمال کیا تھا اور عوامی زندگی سے متعلق موضوعات کو اختیار کیا تھا، وہیں سے انھوں نے تلمیحات وغیرہ بھی اخذ کی تھیں، یہی سب باتیں آگرے کی شاعری کے امتیازات میں شامل ہوگئیں۔

2-ظاہر

حکیم میر محمدی نام تھا، ظاہر تخلص کرتے تھے، اکبرآباد کے رہنے والے خاندانی طبیبوں میں سے تھے، ان کے والد حکیم میر واجد علی اپنے وقت کے معززین میں سے تھے، حکیم میر قطب الدین باطن نے جو ان کے خلف رشید تھے، اپنے تذکرے میں ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

> ''ابتداء سکونت بزرگان دہلی بہ عرب سرا..... مجاربات شاہ گردی میں جد امجد مغفور حضرت حکیم میر واجد علی صاحب جو خلفائے برترین مولانائے ممدوح (محمد فخر الدین) تھے، پریشان ہوکر جلد دہلی (آگرہ) میں داخل محلہ تاج گنج، جس کی صحت ممتاز گنج ہے، کثرہ عمرابن میں قیام پذیر..... مدت مدید نواب احمد بخش خاں مرحوم مخاطب بہ فخر الدولہ کو ان کی خدمت کی سعادت سے توقیر''۔[2]

حکیم میر محمدی ظاہر مولانا فخر الدین کے خلیفہ حضرت میر ضیاء الدین جے پوری کے مرید تھے، اور فن شعر میں وہ نظیر اکبرآبادی کے شاگرد تھے، ان بزرگوں کے فیض سے حکیم ظاہر کے کلام میں حمد و نعت کا اثر زیادہ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے، چنانچہ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

حمد میں لکھتا ہوں نام اس خالق غفار کا — نعت میں دم مارتا ہوں احمدؐ مختار کا
کیوں کر نہ کریں حور و ملائک اسے سجدہ — اللہ بمعنی ہے، بہ صورت ہے محمدؐ
ہے عرض روز حشر کو ظاہر کی یا علیؑ — لعلین آپ کی یہ گنہگار لے چلے

گو خلد بریں کی تو صبا اور ہی کچھ ہے　　پر یار کے کوچے کی ہوا اور ہی کچھ ہے

ظاہر اپنے وقت کے معروف شاعروں میں سے تھے، شیفتہ نے بھی اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا ہے اور یہ ایک شعر نقل کیا ہے۔

یہ تو سب جور و جفا ہو گئے خوگر ہم کو　　چاہیے اب ستم نو کوئی ایجاد کرو 6

قطب الدین باطن کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنا دیوان مختصر بڑی لطافت و فصاحت سے جمع بصد تدبیر کیا، اس سے گمان ہوتا ہے کہ ظاہر بسیار گو نہیں تھے، کلام پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مضامین تازہ کی تلاش کرتے تھے، زبان صاف اور سلیس ہوتی تھی، غزلوں میں کبھی کبھی قطعے بھی شامل کر دیتے تھے، ایک قطعہ یہ ہے۔

چشم اور لب لعل اس کے ظاہر　　بولے کہ جو دل کو پائیں گے ہم
آنکھوں نے کہا کریں گے ہم قتل　　لب بولے کہ پھر چلائیں گے ہم

میر محمدی ظاہر نے 6 رصفر 1259ھ (1843) کو اپنے وطن آگرے میں وفات پائی تھی۔

3- باطن

خود اپنے تعارف میں انھوں نے جو لکھا ہے مختصراً اس طرح ہے:

> باطن تخلص، حکیم میر قطب الدین نام، راقم آثم مولف گلستان بے خزاں پابند سلسلۂ شاگردی میاں نظیر صاحب اور خواہان فیض صحبت بہ دل و جاں، ان کی تعلیم کے استفادے سے حرف شناس سخن ہو جائے گا، ..... پدر بزرگوار سید محمدی متخلص بہ ظاہر"۔7

اپنے باپ کے تخلص ظاہر کی رعایت سے بیٹے نے اپنے لیے تخلص باطن پسند کیا، محسن اور ان کی تقلید میں نساخ نے بھی ان کو "شاگرد گلزار علی اسیر" لکھا ہے 8۔ امیر چونکہ نظیر کے بیٹے اور شاگرد تھے، ان کے تعلق سے باطن کا خود کو "پابند سلسلۂ شاگردی نظیر" کہنا صحیح ہے، باطن نے اپنے کلام کا جو انتخاب اپنے تذکرے میں درج کیا ہے یہاں اس میں سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

ہوش کیوں کھوے گئے دیکھ کے جلوہ کیے　　اَرنی پھر کے تو اے حضرت موسیٰ کہیے
خدا کی حمد ہے، وصف بُتاں ہے　　بس اک دو کام کو منھ میں زباں ہے

وہاں انکار ہے، یاں شوق دید یار جانی ہے　　اِدھر سے رَب اَرنی ہے اُدھر لَن ترانی ہے
ہر اک جانب ظہور نور روئے یار جانی ہے　　کہاں، ارنی، کہاں موسیٰ، کہاں کی لن ترانی ہے
ہوا سے بھی ہے ہلکا جسم، ایسی ناتوانی ہے　　اڑے کیا رنگ، کیا آواز ہو، سب لن ترانی ہے
بنایا تو نے حکمت سے اسے موتی، اُسے انسان　　گہر اور آدمی دونوں کی اصل اک بوند پانی ہے
میں آتش سے مقابل ہو کے کرتا گفتگو تو یہ　　مجھے اے باطن عاجز طبیعت آزمانی ہے

اس مقطع سے ظاہر ہے کہ باطن خواجہ آتش کا احترام کرتے تھے، اور ان کی غزل پر غزل کہنے کو معمولا گستاخی خیال کرتے تھے، البتہ اپنے زور طبیعت کو آزمانے کے لیے انھوں نے یہ غزل کہی تھی اور خوب کہی تھی۔

میر قطب الدین باطن قادر الکلام اور پُر گو شاعر تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے چار دیوان مرتب کیے تھے۔ مشکل ردیفوں اور تنگ قافیوں میں وہ کامیابی کے ساتھ غزلیں کہہ لیتے تھے۔ چنانچہ ذیل کے اشعار سے بھی ظاہر ہے۔

زندۂ جاوید ہیں تیرے شہیداں سب کے سب　　پی گئے شمشیر سے یہ آب حیواں سب کے سب
تو نہ بد وضع ہے اے جان، نہ بد فعل میں ہوں　　ایک دن آن کے رہ جا مرے گھر رات کی رات
تمھارا حسن ہر عالم میں اک دھر قیامت ہے　　جو اتنے تھے تو فتنے تھے، ہوئے آفت جواں ہو کر
روندا قدم سے خاک میں یکسر ملا دیا　　پائی صبا نے کون سی تقصیر نقش پا
جو کچھ دیکھا سو دیکھا، کیا بیاں معراج کی شب کا　　تقرب عرش اعظم پر محمد کو ملا رب کا

میر باطن تضمین بھی خوب کرتے تھے، ایک مثال اس کی یہ ہے۔

جس جا ترا قدم ہے مدینہ کی راہ میں　　خطِ جبینِ ماست ہم آغوش نقش پا

حکیم میر محمدی ظاہر اور ان کے بیٹے باطن دونوں کے کلام پر مذہب کا اثر غالب معلوم ہوتا ہے، ابتذال اور عامیانہ پن سے دونوں بچتے تھے، دونوں کی زبان صاف اور شستہ اور دونوں کا طرز بیان واضح اور غیر مبہم تھا۔

4-بخشی

ان کا نام شیخ حسین بخش تھا، شروع میں بخشی تخلص تھا، پھر عاصی ہو گیا، میر قطب الدین باطن نے ان کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

''اصل ان کی خاک پنجاب، مولد و منشا فخر دہلی، والد ماجد (میر محمدی ظاہر) کے ساتھ دوستی کمال رکھتے تھے، اور مشاعرے میں باہم اتفاق خیال..... آئینۂ سخن ان کا مصقلۂ اصلاح حضرت ہادی شعرا مرحوم سے مصفا ہوا''۔9

خویشگی کے تذکرے میں ان کے حال میں یہ بھی مذکور ہے کہ:

''بہ پیشۂ بزازی دکاکین جنس خوش قماش معانی بہ چار سو بازار آوردہ و کشادہ و بہ ہزار فکر و تلاش نقود مضامین برائے العین مبصران فن سخن نہادہ''۔10

بخشی مشاق شاعر تھا اور سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہنے پر بخوبی قادر تھا، اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

چوسا پیکاں کو لب زخم جگر نے ایسا
نہ رہی نام کو ظالم کی ذرا تیر میں آب

دھوؤں اس پائے نگاریں کا ذرا رنگ میں ڈال
تو مصور ہو ترے چہرۂ تصویر میں آب

مرا آکے اٹکا ہے آنکھوں میں دم
بھلا اب تو منھ تک دکھا ایک دم

کہا میں نے یکساں ہے مجھ کو یہ اب
نہ جینے کی شادی نہ مرنے کا غم

واں گردن سیمیں ہوئی گوہر کے حوالے
یاں حلق گنہ گار ہے خنجر کے حوالے

کیا نذر کروں تیری میں اے کاکل مشکیں
دل تھا سو ہوا زلف معنبر کے حوالے

5-عاشق:

یہ بھی نظیر کے معروف شاگردوں میں سے تھے، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے مختصراً ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''عاشق تخلص، شیخ نبی بخش اکبر آبادی خلف شیخ محمد صلاح، از شاگردان نظیر اکبر آبادی است''۔11

اور سعادت خاں ناصر نے ان کو "خوش تقریر" بتایا ہے 12، بہ طور مجموعی ان کی شاعری کا مزاج روایتی معلوم ہوتا ہے۔ کوئی کوئی شعر معاملات میں بہت اچھا نکل گیا ہے، مثلاً

اب یاد کیے سے چبھتے ہیں — سو خار ندامت سینے میں
اس گل کو جو وقت رخصت — چھاتی سے لگانا بھول گئے

میر قطب الدین باطن ان سے ذاتی طور پر واقف تھے اس لیے انھوں نے ان کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے، لکھا ہے:

"عاشق تخلص، شیخ نبی بخش نام، کہین پور شیخ محمد صلاح مرحوم، پنجابی الاصل، مولد و منشا جد دہلی، شاگرد رشید ہادی شعرا (نظیر) شاہد سخن کے عاشق و جلا، مرد لطیف، ظریف و حریف، بذلہ سنج ... استعداد فارسی معقول، علم عربی سے آگاہ، صدہا کتب تحت خامہ گذریں، بخط عربی و فارسی لکھیں، ظفریاب خاں راسخ بریلوی سے سوال و جواب بہ نظم و نثر اکثر بہ وجہ احسن رہا، عرصہ قلیل ہوا کہ بہ مکان مقبرہ میر محمدی بیدار خفتہ بستر عدم پکڑا ... تہذیب طالب علمان مدرسہ سرکار بھرتپور ان کے اختیار تھی، سن بارہ سو تریسٹھ ہجری میں ترک روزگار کر کے حرمین شریفین کو گئے، اشعار ان کے سننے کے لائق ہیں"۔13

حرمین شریفین کے مبارک سفر کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اطراف ملک میں مختلف مقامات کی سیر کی تھی۔ وہاں کے اساتذہ کی صحبتیں اٹھائی تھیں۔ خود اپنے کلام سے نومشقوں کو متاثر کیا تھا۔ ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رعایت لفظی کے دلدادہ تھے اور مشکل زمینوں میں بڑے شوق سے غزلیں کہتے تھے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

اشک لخت دل سے دامن خوشنما ہو جائے گا — لعل گل اور سوتیا کا حاشیہ ہو جائے گا
کان تک پہنچے گی گر اس گل کے جانے کی خبر — اے صبا سنتے ہی دم میرا ہوا ہو جائے گا
منہ نہیں کرنے کے ہرگز قند مصری کی طرف — لون کا بھی ہند میں گر آسرا ہو جائے گا
لال دکھلاؤں جو خون دل سے مژگاں تو سہی — رشک شاخ گل کروں خار مغیلاں تو سہی
آہ سوزاں کے دھوئیں سے سرو اور سنبل لگاؤں — لخت دل سے کر دوں صحرا کو گلستاں تو سہی
جاناں جانا ہو تو بہت کہتے ہو پر جانا نہ جان — تم گئے اور میں نہ دیدوں جان جاناں تو سہی

یوں جنوں سے اضطراب رگ ہے نشتر کے تلے
مضطرب ہو صید وحشی جیسے خنجر کے تلے

دام میں لے کر ہمیں صیاد پچھتایا بہت
استخواں آئے نظر جب بال اوپر کے تلے

بام سے سیر زمیں کا قصد اگر وہ مہ کرے
ہے یقیں ساتوں طبق ہو جائیں اوپر کے تلے

شہر آگرہ اگرچہ اس زمانے میں پایۂ تخت نہیں تھا، بوجوہ مختلف مقاموں سے ہر طبقے کے لوگ یہاں آ کر اقامت اختیار کرتے رہتے تھے، چنانچہ بخشی اور عاشق وغیرہ پنجاب کے خطے سے یہاں آئے تھے، خود باطن اور ان کے اسلاف بھی دہلی سے یہاں منتقل ہوئے تھے، اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ یہاں کی بول چال میں مختلف بولیوں کی آمیزش ہو گئی تھی، ایسے میں اپنے کلام کو معیاری بنانے کے لیے یہاں کے شاعروں میں سے بعض نے اہل دہلی اور کچھ نے اہل لکھنؤ سے رجوع کیا تھا۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کا رجحان خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں کے شاعر شعر گوئی پر محنت کرتے تھے۔ اور شعوری طور پر زبان و بیان کو نکھارنے سنوارنے کی کوشش کر رہے تھے۔

(2)

بنارس کے راجا چیت سنگھ نے گوالیار میں 1225ھ (1810) میں وفات پائی تھی، پھر ان کے فرزند اور جانشیں راجا 14 بلوان سنگھ نے "حکام عہد کی تجویز سے سرزمین آگرہ میں اقامت اختیار کی، یہ باپ بیٹے انگریزوں کے پسندیدہ نہیں تھے، ان کے خیالات وجذبات بھی ان کے موافق نہیں ہوسکتے تھے۔ باوجودیکہ آگرے میں انگریزوں کا عمل تھا، راجا بلوان سنگھ کی سرپرستی میں انگریز پرستی کے معاملات پروان نہیں چڑھ سکتے تھے البتہ راجا کے ساتھ پورب کے علاقوں کے رہنے والے بھی آکر بس گئے تھے، ان کے اثر سے وہاں کے معاشرت اور بول چال بھی یہاں اپنا اثر کم وبیش دکھانے لگی تھی۔

6- راجا

راجا بلوان سنگھ نے جب آنکھیں کھولیں، اس وقت آگرے میں نظیر اکبرآبادی کا دور دورہ تھا، انھوں نے ان سے درس لیا۔ پھر جب اس لائق ہوئے تو نظیر کے بیٹے اسیر سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ باطن نے ان کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

"راجا تخلص، مہاراجا بلونت سنگھ (بلوان سنگھ) نام، زینت افزائے جدِ دہلی..... علم درسی میں ہادی شعرا مرحوم سے بہرہ دافی اٹھایا، اور بہ لگر سخن سید گلزار علی متخلص بہ اسیر پسر ہادی شعرا سے استفادہ پایا، اور سن بارہ سو پینتالیس ہجری میں بزم مشاعرہ بہ بارگاہ

فلک اشتباہ مہاراجا صاحب ترتیب پائی، دیوان ضخیم نے ترتیب پائی اور طبع ہو کر سب
کی طبع میں اپنی محبت جتائی"۔15

لالا سری رام نے ان کے آخر وقت تک کے حالات قلمبند کیے ہیں، ان میں لائق توجہ باتیں
درج ذیل ہیں:

"چالیس برس تک آگرے میں رہے، نظیر اور پھر حاتم علی مہر کے شاگرد ہوئے، تلاش
مضامین تازہ کا شوق تھا، ساتھ ہی زبان کی صفائی پر بھی نظر تھی، صاحب دیوان تھے،
دیوان "گل ریاض" 1270ھ (1854) میں عظیم الاخبار پریس آگرہ میں چھپا تھا،
ایک کتاب "چتر چندر کا" بھی ان سے یادگار ہے، ان کی قادر الکلامی اور مشاقی بھی
قابل داد تھی"۔16

راجا نے غزل کے علاوہ مثلث، مسدس، ترجیع بند وغیرہ بھی کہے تھے، ان کے دیوان کا ایک
قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ ہے جو 447 صفحوں پر محیط ہے اور ضخیم کہلانے کا مستحق
ہے17۔ اس کے ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں۔ اس کی ترتیب اور کتابت دونوں عمل 1253ھ
(1837) میں مکمل ہوئے تھے، نسخہ مطلا ہے اور غالباً خود راجا کے لیے تیار کیا گیا ہوگا۔ اس کا آغاز
اس شعر سے ہوتا ہے۔

یک ذرۂ وصف ہو نہ سکے تیری ذات کا ہر مو اگر زباں بنے کائنات کا

اور اس کے آخری شعر یہ ہیں۔

تو بیٹھ کے بالیں پہ مری دیکھ طلسمات راجا میں کہوں کیا دل بریاں کی حقیقت

اور۔

ہر آہ جگر سوز کہ از سینہ بر آید دودے ست کز و بوئے کباب جگر آید

اس مخطوطے کا ترقیمہ حسب ذیل ہے:

"دیوان ہذا من تصنیف راجہ صاحب مہاراج راجہ بلوان سنگھ بہادر، بتاریخ بست و ہفتم
شوال المکرم 1253ھ بقلم بے ربط رقم غلام رسول"۔

اس نسخے پر اصلاحیں موجود ہیں، بعض مصرعے اور اشعار بدلے بھی گئے ہیں، اس لیے اس

پر "نسخۂ مصنف" ہونے کا گمان کیا گیا ہے، اس دیوان کی تکمیل کی تاریخ حاتم علی مہر نے کہی ہے اس طرح۔

ایسے دیوان کی تاریخ تو مہر　　لکھ دے باغ گل معنی بہ ہے

1253ھ

حاتم علی مہر سے راجا کے تلمذ کا ذکر محسن نے بھی کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"راجا، مہاراجا بلوان سنگھ بہادر خلف الرشید راجا اجیت (چیت) سنگھ والی بنارس مقیم اکبرآباد صاحب دیوان شاگرد مرزا حاتم علی مہر"۔18

راجا نے 1292ھ (1875) کے قریب انتقال کیا تھا، ان کے چند شعر نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔

ہلال کرتا ہے کس کو ہلال شام کے وقت　　فلک پہ خون ہے کچھ لال لال شام کے وقت
نصیب اعدا، نہ ہو سایۂ پری سر پر　　چمن میں پھرتے ہو تم کھولے بال شام کے وقت
مطیع خوبوں کی خلق پائی، خدا کی قدرت، خدا کی قدرت　　صنم بھی کرنے لگے خدائی، خدا کی قدرت خدا کی قدرت
جنھیں تھا وعوائے میرزائی، خدا کی قدرت، خدا کی قدرت　　نصیب ہے سب برہنہ پائی، خدا کی قدرت خدا کی قدرت
ہیں بے خبر ایسے کہ خبر ہم نہیں رکھتے　　دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
جس جا پہ گرے تھک کے وہی گھر ہے ہمارا　　دیوانے ہیں، سودائی ہیں، گھر ہم نہیں رکھتے
بت اگر سنگ دل ہے اے راجا　　کرلے باتوں میں اس کو تو پانی

مشکل اور طویل ردیفوں اور تنگ قافیوں میں غزلیں کہہ کر راجا نے اپنی قوت مشقی اور قادر الکلامی کا اچھا ثبوت پیش کر دیا ہے، ان کے دیوان میں بعض شعر ان کے حسب حال بھی ہیں۔

راجا کے مشاعروں میں آگرے ہی کے نہیں دوسرے شہروں کے شاعر بھی آکر شریک ہوتے تھے، باطن نے اس بارے میں لکھا ہے کہ:

"شعرائے اطراف صادر وارد بھی آتے، نقاد سخن زر مضامین محک امتحاں پر۔ دار العیار مشاعرہ میں دکھاتے تو اس مشاعرے کا شہرہ ہر بلاد مثل لکھنؤ اور شاہجہاں آباد"۔19

راجا کے ان مشاعروں میں جو کلام پیش کیا جاتا تھا اس کے اثرات دور رس ہوتے تھے۔

ذیل میں ان مشاعروں کے بعض شرکاء کا مختصراً تعارف کرایا جاتا ہے۔

7-اسیر:

میر گلزار علی نام تھا، نظیر اکبر آبادی کے فرزند اور شاگرد بھی تھے، ان کا احوال باطن نے اس طور پر قلمبند کیا ہے:

"اسیر تخلص، میر گلزار علی، جناب خلیفہ صاحب والا احتشام، گلبرگ تر ہادی شعرا نخل طبع نے بہ آبیاری توجہ والد ماجد (نظیر) شادابی پائی.... شرارۂ بیان نے خس و خاشاک اعدا کو پھونکا، ترشح ابر رحمت خیالات نے نو بادہ ہائے نخلستان کلمات کو عروج نشو و نما دلایا.... کن شریف جناب خلیفہ صاحب کا تخمیناً قریب چہل و پنج سال کے ہے، اور عرصہ بست و پنج سال سے کم و بیش فکر شعر فرماتے ہیں اور مضامین نادر زبان پر لاتے ہیں"۔ 20

نظیر اکبر آبادی اس خطے میں استاد وقت تھے، ان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے گلزار علی "خلیفہ صاحب" کر کے معروف ہو گئے تھے، لکھنوی تذکرہ نویس محسن نے بھی ان کے ذکر میں لکھا ہے:

"خلیفہ میر گلزار علی اسیر، بیٹے اور شاگرد میر ولی محمد نظیر کے، جو استاد اکبر آبادی مشہور ہیں، صاحب دیوان"۔ 21

گلزار علی اسیر کی شاعری کے بارے میں سرزا قادر بخش صابر گورگانی نے اس طرح رائے دی ہے:

"موزونی کو موروثی جان کر فکر سخن کی طرف بہت متوجہ ہوئے، لیکن باپ کے مرتبہ کو اب تک نہیں پہنچا"۔ 22

نظیر کی قدرت کلام واقعی غیر معمولی تھی، وہ کورے برتن، کوڑی وغیرہ موضوعات سے متعلق بھی نہایت سبق آموز مضامین بڑی روانی کے ساتھ نظم کر سکتے تھے، اسیر کو بھی عوامی بول چال اور محاورات وغیرہ پر گرفت حاصل تھی، ان کے بعض شعر تو محاورات اور ضرب الامثال وغیرہ کو نظم کرنے کے لیے ہی کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً

ساقی کا کیا بیٹھا ہے کڑوا پیالہ پیجئے کیوں

اہل اکبر آباد کے عام روش کے مطابق خلیفہ گلزار علی بھی لمبی ردیفوں اور مشکل قافیوں میں

پوری روانی کے ساتھ غزلیں کہہ لیتے تھے، مثلاً۔

مل ڈال خون عاشق دلگیر پاؤں میں — منہدی لگا نہ اے بت بے پیر پاؤں میں
دل اس بت کافر کا اگر ہاتھ میں آیا — سمجھیں گے کہ اللہ کا گھر ہاتھ میں آیا
ہو تن سے جدا منزل مقصود کو پہنچے — بے منت پا منزل مقصود کو پہنچے
کیوں قناعت نہ کروں چشم گہر بار پہ میں — کشتی دُر مجھے لبریز خدا نے دی ہے
کڑوے ہونے میں بھی شیریں دہنوں کے مزا ہے — ان کو تلخی شکر آمیز خدا نے دی ہے

خلیفہ اسیر کو معنی آفرینی اور مضامین تازہ کی تلاش کا بھی بہت شوق معلوم ہوتا ہے، ساتھ ہی ان کے شعروں میں بندش الفاظ کا لطف بھی داد طلب ہے، چنانچہ اشعار ذیل میں بھی ہے۔

دنیا میں انسان کی اور آنسو کی قدر برابر ہے — خاک میں ملنے جاتے ہیں آنکھوں سے گرتے جاتے ہیں
دل ترا، سینہ ترا، سر ترا، سامان ترا — پاس عاشق کے جو ہے مری جان ترا
قسمت مری کھلی، مرے بخت رسا کھلے — سب عقدے کھل گئے جو وہ بند قبا کھلے
باغباں، صیاد و گلچیں، خار اور خوف خزاں — ہیں ہزار اندوہ و مشت استخوان عندلیب

خلیفہ گلزار علی اسیر چونکہ راجا بلوان سنگھ کے استاد تھے ان کے طرز شاعری کا اثر اس حلقے میں زیادہ رہا تھا۔

8- انصاف:

ان کا عبدالرحمٰن خاں نام تھا، اور یہ راجا بلوان سنگھ کے ملازموں میں تھے، باطن نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے تلمذ تک پتہ نہیں دیا ہے، لکھا ہے:

''انصاف تخلص، عبدالرحمٰن خاں نام، مرد جوان و صالح و خوش کلام، ساکن فخر دہلی، بہ سرکار مہاراجہ کاشی ممتاز ہیں، ہمارے بھی بندہ نواز ہیں، اور مدام محافل مشاعرات میں غزلیات سے سامعین کو سرور فرماتے ہیں''۔23

سید محسن علی محسن نے ان کی ملازمت وغیرہ کا تو ذکر کیا ہے، لیکن تلمذ کی طرف اس نے بھی اشارہ نہیں کیا ہے، اس نے لکھا ہے:

''انصاف عبدالرحمٰن خاں، داروغہ اصطبل مہاراج بلوان سنگھ بہادر ولد سالار بخش

باشندۂ اکبرآباد"۔24

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کے تذکرے سے البتہ پتہ چلتا ہے کہ عبدالرحمٰن خاں انصاف مرزا حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے۔25 انصاف اپنے زمانے کے آگرہ کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشاق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ سنگلاخ زمینوں میں غزلیں خوب کہہ لیتے تھے۔ مضمون آفرینی کا ان کو بھی شوق تھا۔ زبان ان کی عوام کی بول چال کے مطابق تھی۔ نمونہ کے طور پر چند شعر درج ذیل ہیں۔

بیٹھے ہوئے ہیں رزق مقدر کے دھیان میں — انصاف سے ہمارے توکل کو دیکھنا

حسد کی آگ سے غیروں کا دل کباب ہوا — ہمارے ساتھ جو کی اس نے بادہ خواری رات

وہ چھیڑ کر یہی کہتے ہیں مجھ سے اے انصاف — کہو گذرتی ہے اب کس طرح تمھاری رات

کبھی رہا غم دوری کبھی وصال کا غم — رہی نہ چین سے اک دن بھی عشق یار میں روح

یار جانی، محرم اسرار دل، صاحب جمال — خط لکھا اس بے مروت کو کئی القاب سے

دشمن جاں ہوگیا انصاف جس دم دل سا دوست — پھر بھلا رکھیے توقع کیا کسی احباب سے

9-افصح:

راجا کے مشاعروں میں باہر سے آکر جو شعرا شریک ہوتے تھے یہ افصح بھی انھیں میں سے ایک تھے، اسی لیے باطن ان کے احوال سے بخوبی واقف نہیں تھے، انھوں نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے:

"افصح تخلص، آغا حیدر علی خاں نام، لکھنؤ ان کی سکونت کا مقام، اکثر اوقات محفل مشاعرہ مہاراجا صاحب میں تشریف لاتے، حال ترتیب دیوان معلوم نہیں ہوا"۔26

اور انھوں نے ان کے صرف یہ دو شعر نقل کیے ہیں۔

درگذر بہر خدا اب تو مرے عصیاں سے — بشریت ہے، خطا ہوتی بھی ہے انساں سے

نہ خریدار کا حصہ ہوں، نہ حق بائع کا — میں وہ دانا ہوں جو گرجائے کف میراں سے

ان شعروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر پر مذہب غالب تھا، اور مختلف قسم کی صنعتوں کے استعمال کا انھیں شوق تھا، بطور مجموعی زبان ان کی صاف اور بامحاورہ تھی۔

10-جولاں

ان کا بھی وہی معاملہ ہے، محسن نے ان کے بارے میں اتنا لکھا ہے:

''تارک دنیا، نام نامعلوم، تخلص جولاں، باشندۂ لکھنؤ، وارد اکبرآباد، شاگرد آتش''-27

اور قطب الدین باطن نے ان کے بارے میں جو معلومات قلمبند کی ہیں وہ یہ ہیں:

''جولاں تخلص، الف شاہ نام، بندے کے حال پر نظر شفقت تمام، عمر قریب شصت سال، لباس کیروالال لال، غریب الوطن، سن بارہ سو چونسٹھ ہجری میں فخر دہلی میں تشریف لائے، اکثر مشاعرے میں تشریف لاتے ہیں .... شاگرد خواجہ حیدر علی آتش''-28

مرزا قادر بخش صابر کی بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ:

''جولاں تخلص، درویش وارستہ مزاج، آزاد منش، الف شاہ نام..... حسب ونسب اور وطن کا حال پوچھا تو یہ شعر اپنا پڑھا۔

کیا بتائیں کہ کہاں ہے مسکن کوئے قتل میں رہا کرتے ہیں

خارج سے دریافت ہوا کہ رؤسائے بریلی سے ہے، اول الف خاں نام تھا، بعد ترک وتجرید کے الف شاہ کے ساتھ ساتھ مشہور ہوگیا، مدت سے اکبرآباد میں مقیم ہے''-29

عبدالغفور خاں نساخ نے بھی ان کو ''باشندۂ بریلی'' مقیم اکبرآباد بتایا ہے30۔ لیکن لالا سری رام نے بغیر کسی حوالے کے لکھ دیا ہے:

''وطن بدایوں تھا، لیکن بریلی میں اکثر رہتے تھے، پھر پھرا کر آگرہ میں آتے تھے، وہیں مرے''-31

خواجہ آتش کی شاگردی اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ لکھنؤ بھی گئے تھے، جہاں گشت قسم کے درویش معلوم ہوتے ہیں، راجا بلوان سنگھ کے ایک مشاعرے میں انھوں نے یہ غزل پڑھی تھی۔

نہ دیکھنے گئی پھر لاش کو مزار میں روح لحد پہ بیٹھی رہی تیرے انتظار میں روح

ان کا کلام عموماً صوفیانہ اور درویشانہ ہوتا تھا، فن شعر کے ضابطوں کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے

تھے، چند شعر نمونہ کے طور پر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

کیا تحریر فرط شوق میں جب نام احمدؐ کا — تو کاغذ سبز بختی سے بنا تختہ زبرجد کا
سیر جہاں مضائقہ جولاں نہیں، مگر — لغزش نہ ہونے پائے توکل کو دیکھنا
اٹھایا ہے گلی سے اس پری رو کی اگر مجھ کو — تو لے چل وحشت دل اب جدھر چاہے اُدھر مجھ کو
گیسو سے سیہ بڑھ کے شب تار نہیں ہے — آنکھوں سے جھڑی نرگس بیمار نہیں ہے
ہر اک کو تمنا ہے ترے وصل کی اے جاں — کس کس کو تری خواہش دیدار نہیں ہے
ترک الفت میں بھی منہ تجھ سے نہ موڑا میں نے — آنا جانا ترے کوچے کا نہ چھوڑا میں نے
سینکڑوں رنج اٹھائے ہیں بتوں سے جولاں — عشق کے نام سے اب کان مروڑا میں نے

11- غافل:

باہر سے آکر آگرے کے مشاعروں میں شرکت کرنے والوں میں یہ بھی تھے، یہ اپنے وقت کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرے میں ان کے نام کو بھی جگہ دی ہے، لکھا ہے:

"غافل تخلص، بختاور سنگھ، شاعریست از سراوآباد"۔32

ان کا یہ شعر اکثر زبانوں پر جاری رہا ہے، چنانچہ شیفتہ، کریم الدین اور نساخ وغیرہ نے اپنے اپنے تذکروں میں اسے نقل کیا ہے۔

بیمار عشق کی نہ دوا ہو طبیب سے — مر جائے یا جیے کوئی اپنے نصیب سے

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے بھی جو اصلاً آگرے ہی کے رہنے والے تھے ایک شعر میں اس قسم کا مضمون اس طرح باندھا ہے۔

لو ہم مریض عشق کے تمار دار ہیں — اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

میر قطب الدین باطن نے غافل کے تعارف میں لکھا ہے:

"غافل تخلص، راجا بختاور سنگھ نام، سراوآبادی، عرصۂ دراز تک جد دہلی میں قیام پذیر، بارہا بہ محفل مشاعرہ عیار اجا تشریف لاتے، غزلیات طرح وغیرہ کی سامعین کے روبرو توقیر، اکثر شائقین کو ان سے مشورہ تھا۔ عاصی پر نظر عنایت تھی۔ ایام قریب گذرے کہ

اس جہاں سے گذرے، مرد تجرد پیشہ آب دنان سے گذرے، غالباً دولت کیمیا کی
بدولت بے اندیشہ تھے، شعر گوئی میں صاحب فکر و حاکم پیشہ تھے"۔33

ان کے کچھ شعر یہ ہیں۔

صاف کرتا رہا مجھ پہ وہ تلوار کے ہاتھ — اٹھ کے پکڑے نہ کسی نے مرے خونخوار کے ہاتھ
چھپ گیا پنجۂ خورشید تہِ دامن ابر — دیکھ مہندی رچے اس شوخ ستم گار کے ہاتھ
چمن کوچۂ جاناں سے یہ کیا آتی ہے — ناز کرتی ہوئی جو باد صبا آتی ہے
تار گیسو میں الجھتا ہے سر شام سے دل — رات کیا آتی ہے اک سر پہ بلا آتی ہے
مجھ سا ہوگا نہ کوئی اہل وفا اے غافل — کہ مری خاک سے بھی بوئے وفا آتی ہے
قتل کرتا بھی ہے اور کہتا ہے فریاد نہ کر — یہ ستم ہے ہم پہ نیا اور ستم ایجاد نہ کر

یہ آخری مطلع مدتوں چھوٹے بڑے کی زبانوں پر جاری رہا ہے۔

اس غافل کے کلام میں سلاست اور روانی ہے، یہ عموماً سامنے کی باتیں اور روایتی مضامین نظم کرتا تھا اور مشاعرے میں سامعین سے داد وصول کرتا تھا۔

12-مرزا

آغا میرزا نام، لکھنؤ کے رہنے والے قدیمی شاعروں میں سے تھے، شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"آغا مرزا، مرزا تخلص، شاگرد میر محمد تقی میر، جوان مہذب الاخلاق است ..... مولدش
لکھنؤ، و طبعش در گفتن شعر روانی تمام دارد و در استاد پرستی بے نظیر، دیدمش از ابتدائے
ملاقات بہ ایں فقیر بہ نظر بریک وضع دیدمش، عمرش قریب بہ چہل خواہد بود"۔34

یہ مشکل زمینوں میں کامیاب غزلیں کہہ لیتے تھے، ابتدائی زمانے کے ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

بہار رخ اس کی ہے دیدن کے قابل — گل حسن اس کا ہے چیدن کے قابل
کھنچے ہے جو معشوق عاشق سے اپنے — بغل میں وہی ہے کشیدن کے قابل
پہچانے تا نہ کوئی کہ یہ کس کی لاش ہے — سر تن سے لے گیا مرا قاتل اتار کے

آزر بنا دے لاکھ صنم سِل تراش کے　　اس بت کے ایک ہو نہ مقابل تراش کے
سوزن جو اس مژہ کی یاد آ گئی تو ہو دم　　چاکِ جگر کو اپنے ہم بھی رفو کریں گے
بے ذکر یار مرزا جینے کا لطف کیا ہے　　جب تک کہ تن میں دم ہے، یہ گفتگو کریں گے

راجا بلوان سنگھ کے آگرے میں قیام کے زمانے میں مرزا بھی اس شہر میں آ گئے تھے۔ چنانچہ باطن نے اپنے تذکرے میں ان کے احوال میں تحریر کیا ہے کہ:

"مرزا قتلص، آغا مرزا نام، نژاد ان کی مازندران، بیچ لکھنؤ کے تولد ہوئے، خلف الصدق مرزا محمد اسماعیل سوداگری پیشہ، شاگرد مرشد شعرا (=میر) 1250ھ (1824) میں تقریباً وارد جد دہلی ہوئے، تا قیام مدام بہ مشاعرہ مہاراجا صاحب تشریف لا کر کلام طرح اور طبع زاد سامعین کے روبرو پڑھا... لکن ان کی بطرز استاد، مرد شائستہ ذی استعداد۔ گاہ گاہ غریب خانہ پر بھی تشریف لاتے، 1256ھ میں انتقال کیا... اول کلام پائدار، دوم مدعا طول لفظوں میں اختصار"۔35

آغا مرزا کی ایک طرحی غزل کے دو شعر یہ ہیں ۔

شراب سرخ میں پانی ملا کے پی ٹھنڈا　　کہہ اصطلاحاً اسی کو شراب نیم برشت
نہ سمجھو خام کہ مرزا بڑا جلے تن ہے　　لکھے گا اور غزل در جواب نیم برشت

طرحی مشاعروں کا مقصد عموماً یہی ہوتا ہے کہ شاعروں کی استعداد اور قوت مشق کا امتحان ہو جائے، مرزا بقول خود "بڑے جلے تن" تھے، وہ مشکل ردیف اور تنگ قافیے میں دو غزلے لکھ کر اپنی "چستی" کا ثبوت پیش کر دیتے تھے۔ ان کے معاصر شعرا کا کلام بھی اس حقیقت کا مظہر ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ مرزا کے چند شعر اور بھی نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں ۔

بالیں سے جب وہ بھر گیا غش سے کھلی تب آنکھ　　مجھ نارسا کے طالع خوابیدہ دیکھنا
کھلا یہ جام حباب سے لب یار کرے ہے شراب حیا　　واں نہیں ہے گزک کی خاطر کرے ہے ہاتھی کباب حیا
اپنا گھر چھوڑ کے مرزا کوئی کیا جائے کہیں　　جس کے گھر آئے وہی، اس کی بلا جائے کہیں

(3)

13-سلیمان

لکھنؤ میں غازی الدین حیدر نے انگریزوں کی مدد سے تاج شاہی زیب سر کیا تو انھیں دہلی کے شاہی خاندان سے برابری کا بھی حوصلہ پیدا ہوا، اس کے لیے انھوں نے اپنے ولی عہد نصیرالدین حیدر کی شادی شہزادہ سلیمان شکوہ کی بیٹی کے ساتھ کردی، شاہزادہ نے رنجیدہ ہوکر لکھنؤ کی سکونت ترک کردی، پہلے کاس گنج گئے، پھر وہاں سے آگرہ پہنچے، یہیں اقامت اختیار کی اور پھر اسی شہر میں 29/ذیقعدہ 1253ھ (فروری 1837) کو وفات پائی، لوح مزار پر یہ مصرع لکھوایا گیا۔

بگوکردبرشاہ رحمت خدا 36

1253

شاہزادہ سلیمان شکوہ کو آگرے میں وہ فارغ البالی حاصل نہیں رہ گئی تھی، جو لکھنؤ میں تھی، پھر بھی بحد امکان رسموں کو نباہتے تھے، اس شہر کے اہل سخن ان کی نوازشات سے کم وبیش فیض اٹھاتے رہے، مرزا قادر بخش صابر نے لکھا ہے:

"مدت تک لکھنؤ اور بیشتر مستقر الخلافت آگرے میں تشریف فرما رہے، جو کہ فکر شعر

خاندان تیموریہ کا ذاتی ہے، شعر گوئی کی طرف بیشتر متوجہ رہے"۔37

شاہزادہ کے قیام آگرہ کا ذکر باطن نے اس طرح کیا ہے:

"سلیمان تخلص، مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم، فرزند حضرت فردوس آشیانی شاہ عالم بادشاہ، چندے جلوہ فرمائے لکھنؤ رہے، اور اکثر شعرا مثل قلندر بخش جرأت وغیرہ ذلہ ربائے خوان نعمت..... رونق بخش فخر دہلی ہوئے، اور یہیں انتقال فرمایا..... یہ اپنے وقت کے سلیمان ہیں، دیوضمون ان سے پشت دست بدعاں ہیں"۔38

ان کے چند شعر یہ ہیں۔

اے سلیماں عشق کی آتش سے میرے دل کے بیچ
آگ کا شعلہ سا اک بھڑکا، بھڑک کر رہ گیا

جان دی راہ محبت میں الٰہی صد شکر
بات جو ہم نے کہی تھی وہ نباہی صد شکر

مجھ پہ غصہ ہو وہ موتیوں کے ہار کو توڑ
بولے، لے اب تو کہیں آنسوؤں کے تار کو توڑ

قسم دے کر نہ پوچھو ہم سے دیکھو رات کی باتیں
کہیں گے تو خفا ہو گے ابھی ہم تم سے ڈرتے ہیں

ساقیا ہے یہ جام کا عالم
جیسے ماہ تمام کا عالم

اب خدا پھر ہمیں نہ دکھلائے
شب ہجراں کی شام کا عالم

تجھ پہ ہے ان دنوں میں نام خدا
کچھ عجب دھوم دھام کا عالم

سلیمان شکوہ کہنہ مشق، قادر الکلام شاعر تھے، دلی کے شاہی خاندان کے فرد تھے۔ ان کی زبان دہاں کی نکسالی تھی۔ کبھی کبھی شاہ عالم کے عہد کے محاورے بھی زبان سے نکل جاتے تھے۔ تو قدامت کا لطف آجاتا تھا۔ ان کی غزلوں کا دیوان تو مرتب ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی زندگی میں وہ شائع نہ ہو سکا، لالا سری رام کا بیان ہے کہ:

"آپ کا قلمی دیوان مولف تذکرہ (سری رام) کے کتب خانے میں محفوظ ہے"۔39

ان کے دیوان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سنگلاخ زمینوں میں روانی کے ساتھ غزلیں کہہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی غزلوں میں قطعے بھی شامل کر دیتے تھے۔ ایک قطعہ یہ ہے۔

ہاتھ جب چھاتی پہ رکھا اس کی میں نے کہا
بوجھ میرے ہاتھ میں، یہ جنت ہے یا طاق ہے

تب کہا اس نے یہ ہنس کر راہ شوخی سے مجھے
اک ہی اللہ، اپنے کام میں تو طاق ہے

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کی بول چال کے علاوہ قلعہ معلی کے آداب، رسوم اور تفریحی مشاغل وغیرہ کا بھی یہ اپنے شعروں میں بڑے لطف کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اس اعتبار سے بھی ان کا دیوان قابل مطالعہ ہے۔

شاہزادہ سلیمان شکوہ کے ملازمین اور متوسلین میں بھی بیشتر لوگ شاعری کے فنِ شریف سے دلچسپی لیتے تھے۔ جو لوگ ان کے ساتھ آگرے آگئے تھے ان میں سے بعض کا احوال اپنے تذکرے میں باطن نے قلمبند کیا ہے۔ یہاں چند کا حال لکھا جاتا ہے:

14 - جوان

یہ اس زمانے کے کہنہ مشق شاعر اور شیخ مصحفی کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے، مصحفی نے ان کا ذکر تفصیل سے قلمبند کیا ہے:

> ''مرزا نعیم بیگ، جوان تخلص اصلش شاہجہاں آباد، اقامت در کوچہ چیلہ ہا جوانِ وجیہہ خوش قامت خوش تقریر و عظیم الشان و خندہ روئے، ملازم خاص الخاص مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہ، چوں از آغاز شباب طبع موزوں داشت، بہ سبب ہم محلگی در شاہجہاں آباد گاہے گاہے کہ اتفاق ملاقاتش می افتاد، بسیار بہ تپاک و نیازمندی پیش می آمد، از یک دو سال کہ دریں شہر فقیر باریاب مجلس حضور پُر نور شدہ، اور بر ہماں طریقہ راسخ الاعتقادی معترف یافتہ، اگرچہ چنداں بہ گفتن شعر سروکار نیست لما چوں در موزوناں شمردہ می شود لہٰذا پیش ازیں روزہائے کہ در حضور مشاعرہ بود بہ موجب ارشاد والا بہ سرانجام غزلہائے طرحی وغیرہ سعی بلیغ بہ کار بُردہ، بہ واسطۂ معرفت سابق آنہا بہ نظر اصلاح مولف می گزارند، غرض کے از ابتدا تا انتہا معتقد ایں خاکسار ارادت مقدار است، خیالش بسیار رفاستے دارد''۔ 40

ابتدائی زمانے کے اِس جوان کے چند شعر یہ ہیں۔

پہلو میں دل اپنے کو بھی غمخوار نہ پایا
یہ خوبیِ قسمت کہ کوئی یار نہ پایا

جائیں تھے اشک تو کل دیدۂ گریاں سے لپٹ
آج کیا ہے کہ جدا ہوتے ہیں مژگاں سے لپٹ

یہ ان دنوں جو ہم سے اتنی رکھائیاں ہیں
شاید کسی نے باتیں کچھ کچھ بھائیاں ہیں

غزل جواں کی پڑھی جائے جب کہ محفل میں　　زبان اہل فراست سے مرحبا نکلے

میر قطب الدین باطن نے ان کا ذکر بہت اختصار سے کیا ہے، انھوں نے بس اتنا لکھا ہے کہ:

''جوان تخلص، مرزا نعیم بیگ نام، ذلہ ربائے خوان مرزا سلیمان شکوہ، جوش طبیعت سے اس سن میں مضامین کا انبوہ''۔41

مضامین کے انبوہ کے ذکر کے باوجود باطن نے ان کا کوئی نیا شعر نہیں نقل کیا ہے، ان کا ایک دلچسپ شعر یہ ہے۔

یہ خال اس طرح کے پنگے اس کی ناف کے اوپر　　رشیدا نے دیے ہوں جیسے نقطے قاف کے اوپر

شاعر کو مختلف صنعتوں، تلمیحوں وغیرہ کے نظم کرنے کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے، زبان اس کی قدیمانہ ہے، بیان میں تعقید وغیرہ سے بھی کچھ زیادہ اجتناب نہیں برتا ہے۔

15-خالق

یہ خالق بھی شاہزادہ سلیمان شکوہ کے ملازموں میں سے تھے لیکن شاعر کی حیثیت سے غیر معروف تھے، باطن نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں جو اطلاع فراہم کی ہیں یہ ہیں:

''عبدالخالق نام، جد دہلی میں مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم کی سرکار کے ملازم، جوان، جسیم، چیچک رو، اکثر بہ محفل مشاعرات مہارایہ صاحب تشریف لانا قائم، ہنگام گفتگو زبان میں لکنت، وقت بیان کلام میں متانت''۔42

اور اس لکنت کی وجہ سے خالق مشاعروں میں کامیابی سے شعر نہ پڑھ سکتے ہوں گے، اسی لیے غیر معروف رہ گئے ہوں گے، خود باطن نے بھی ان کا ایک شعر لکھا ہے۔

میں نے رنگین نہ کیا اس کا تڑپ کر دامن　　سر جلاد پہ احساں نہ ہوا تھا سو ہوا

کچھ شک نہیں کہ اچھا شعر ہے، زبان صاف ہے، مضمون میں ندرت ہے۔

16-مسرور

مسرور شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے، انھوں نے ان کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے:

''شیخ پیر بخش مسرور تخلص ولد حکیم حیات اللہ متوطن قصبہ کاکوری، نواسۂ حکیم خیر اللہ جوانیست، موزوں طبع، ہمیشہ پیش جد مادری خود در لکھنؤ پرورش یافتہ وفن طب آموختہ، از ابتدائے سن بلوغ طبعش بہ اشعار اساتذہ بیشتر میل می نمود دراں ایام خود ہم چیزے موزوں می کرد، کلام منظوم خود را بجائے خود نگاہ می داشت در پے ایں بود کہ کدام استاد را بہ نظر بگذرانم تا از حسن وقبح آں واقف شدم، آخر حسب اتفاق در 1220ھ رجوع بہ فقیر آوردہ، حالا کہ مشق او بہ دوازدہ سال رسیدہ، وضع موزونیش در بستہ احیائے دل مُردگاں می کند دریں فن از معاصرین خویش پائے کمی نمی آرد بلکہ شیریں گفتار یش نمک بر جراحت عشق بازاں می باشد، عمرش تا امروز سی و یک سالہ خواہد بود''۔43

مسرور کے والد بھی شاعر تھے اور وہ عموماً فارسی میں کہتے تھے، مصحفی نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''حکیم حیات اللہ خاں قلاش تخلص متوطن قصبہ کاکوری پدر شیخ پیر بخش مسرور کہ باوجود مہارت در فن طبابت اکثر بہ تجارت اشتغال می داشت، عمرش بہ چہل سال رسیدہ بود کہ ناگاہ بہ مرض سل مبتلا شدہ سنگ مجبوری بر سینہ نہادہ در گذشت خیال شعر فارسی اکثر نمود، بہ شاگردی شاہ طول زبان اقراری کشاد''۔44

پیر بخش مسرور کی ابتدائی عمر کی شاعری کا نمونہ یہ ہے۔

لڑکوں کی فوج ساتھ ہے اور حال غیر ہے — وحشی مزاج ہوں میں مجھے اس میں سیر ہے
اللہ رے رعب حسن کہ قاتل کے سامنے — اٹھا نہیں ہے ہاتھ کسی داد خواہ کا
یہ فیض مصحفی ہے کہ مسرور ان دنوں — ہر سمت غلغلہ ہے تری واہ واہ کا
ہر دم بسر کروں ہوں سر شاخ نخل پر — مدت ہوئی ہے مجھ کو کہ بے آشیاں ہوں میں

کچھ مدت کے بعد مسرور نے شاہزادہ سلیمان شکوہ کی خدمت میں رسائی حاصل کر لی، اور پھر وہ آگرے کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے، باطن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

''مسرور.....از حاشیہ نویسان بساط مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم..... ہنگام جلوہ افروزی مرزا سلیمان شکوہ بہادر بہ فخر دہلی مدام شریک مشاعرہ مہاراجہ صاحب بہادر ہوتے، طبع

نہایت موزوں، بندہ پرلوازش کمال فرماتے"۔45

اور محسن نے ان کو صاحب دیوان اور شاگرد نامی غلام ہمدانی مصحفی بتایا ہے۔46

پیر بخش مسرور کہنہ مشق اور باکمال شاعروں میں تھے، مشکل زمینوں میں غزلیں کہنے کا انھیں شوق تھا، اور طرحی مشاعروں میں خصوصیت سے داد حاصل کرتے تھے، ان کے چند شعر یہ ہیں۔

ہم لیے پھرتے ہیں اس امید پر سر ہاتھ میں
نیچے ۔۔ کا کبھی تو ۔۔ ستگر ہاتھ میں

کہتی ہے یہ ہر وقت مجھے آبلہ پائی
آ ۔۔ کو قدم دشت مغیلاں میں نہ اٹھے

اس مہر کو دیکھ اشک ہمارے نکل آئے
لو قہر ہوا، دن کو ستارے نکل آئے

کیا نشتر فصاد رگ جاں کے تلے ہے
ہر ایک کی انگشت جو دنداں کے تلے ہے

کہتے ہیں دُر گوش ترا دیکھ نجومی
یہ زور ستارہ مہ تاباں کے تلے ہے

گو اولتیاں آنکھوں سے ٹپکیں شب ہجراں
پر نالہ کی رخصت دل نالاں کو نہ دوں میں

(4)

17-بزاز

یہ آگرے کے کم معروف شاعروں میں سے تھے، میر باطن نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"بزاز تخلص، شیخ حسین بخش نام، کارگاہ جد دہلی میں لباس سخن ان کے قامت پر آراستہ

.....ان کی طبیعت کا بازار کاغذ میں دکان سخن یوں درست کرتا ہے 47

کہوں ہوں جس سے میں اس کو بلا لا، وہ یہ کہتا ہے مجھے ناحق ہو دوڑاتے، نہ آئیں گے، نہ جائیں گے

سعادت خاں ناصر نے بھی ان کا یہی شعر نقل کیا ہے لیکن تخلص شاید غلطی سے "بیزار" لکھ دیا ہے۔48

18-مہر

مرزا حاتم علی بیگ نام تھا، اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ان کو شہرت ملنے لگی تھی۔ راجا بلوان سنگھ کی سرکار میں انھیں رسائی حاصل ہو چکی تھی اور بہ گمان غالب راجا نے ان کی شاگردی قبول کر لی تھی۔ باطن نے اپنے تذکرے میں ان کا حال قدرے بعد میں لکھا ہے۔ اس طرح:

"مہر تخلص، مرزا حاتم علی نام بن مرزا فیض علی بیگ مغفور قزلباش، مولد و منشا فرخ آباد،

تلمذ شیخ امام بخش ناسخ مرحوم سے، عرصہ دراز سے جدہ دہلی میں رونق افروز اور اکثر

مشاعرات میں تشریف لاتے ہیں.....عاشق منش آزاد روش.....''۔49

مرزا حاتم علی مہر غزل میں ناسخ کے طرز کی اتباع کرتے تھے۔ آگرے کے ماحول کی مناسبت سے سنگلاخ زمینوں میں بھی غزلیں کہہ لیتے تھے۔ زبان کی صحت کا خیال رکھتے تھے۔ ان کے چند شعر یہ ہیں۔

جو بے نشانی کا ہم سے ہوا نشاں پیدا
تو اب مکاں سے ہے شکل لا مکاں پیدا

عبث خیال ہے افشائے راز کا مجھ سے
جلے گا دل، پہ نہ ہوگا کبھی دھواں پیدا

پیدا ہی کروں گا کسی تدبیر سے زنجیر
توڑوں گا در خانۂ زنجیر سے زنجیر

مضطر ہے نہایت مرا مضطر دل بیتاب
اب دیکھیے کیا لائے گا چکر دل بیتاب

(5)

آگرے سے متصل گوالیار کو بھی تہذیبی اور علمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی تھی۔ یہ شہر بھی مختلف زمانوں میں ہندوستان کا پایۂ تخت رہ چکا تھا۔ مہاراجا کاشی نے بھی یہیں آکر پناہ لی تھی۔ بعد میں اگرچہ راجا بلوان سنگھ نے آگرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آگرہ اور گوالیار کے مابین آمد و رفت کے سلسلے جاری تھے۔ دونوں مراکز کی شاعری کا انداز بھی کم و بیش یکساں تھا۔ گوالیار کے قابل ذکر شاعروں میں سے بعض کا تعارف یہاں مختصراً درج کیا جاتا ہے:

وہ زمانہ تھا جب اکیلے دوکیلے کے لیے سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ قافلے چلتے تھے۔ شاہ نصیر دہلی کے معروف، قادرالکلام استاد جہاں گشت تھے۔ دکن کی طرف جاتے ہوئے وہ گوالیار سے بھی گذرے۔ بعض شاگرد اور دوست بھی ساتھ تھے۔ ان کی خاطر سے یہاں مشاعرے ہوئے۔ یہاں کے نوجوانوں کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ ان میں سے کسی کسی نے وقتی طور پر شاہ صاحب کی شاگردی بھی اختیار کر لی۔

19-صفدر

اپنے استاد شاہ نصیر کے ساتھ ان کا بھی گوالیار میں گذر ہوا تھا۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''میر صفدر علی صفدر تخلص، شاگرد میاں نصیر کہ از شاہجہاں آباد بہ گوالیار رسیدہ، ہمراہ ایشاں آمدہ بود، جوان صلاحیت شعار و مہذب الاخلاق است''۔50

میر صفدر علی صفدر کے وطن اصلی کی نشاندہی شیفتہ نے کی ہے، اس طرح:

''صفدر تخلص، میر صفدر علی از سونی پت است''۔51

صفدر علی صفدر شاہ نصیر کے معروف شاگردوں میں سے تھے، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

برقع کو اٹھا منہ سے جو تم کرتے ہو باتیں — اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم

شجر سوختۂ شمع سے جب گل نکلے — چاہیے بیضۂ فانوس سے بلبل نکلے

کھول دیتے گرہ زلف، صبا کیوں نہ ہوئی — تیرے پاؤں سے لگے رہتے، حنا کیوں نہ ہوئی

یا الٰہی مرے ناخن ہیں جو یہ سینہ خراش — غنچۂ دل کے مرے عقدہ کشا کیوں نہ ہوئی

میر صفدر کو معنی آفرینی اور مضامین تازہ کی تلاش کا شوق معلوم ہوتا ہے، استاد کے فیض سے وہ سنگلاخ زمینوں میں بھی غزلیں خوب کہہ لیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ گوالیار میں بھی طویل ردیفوں اور مشکل قافیوں میں شعر گوئی کا رواج ہو گیا تھا۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دن تک جاری نہیں رہ سکی۔

20۔ غمگین

رہنے والے یہ بھی اصلاً دہلی ہی کے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ان کے تعارف میں تحریر کیا ہے کہ:

''غمگین تخلص، میر سید علی خلف الصدق میر سید محمد مغفور کہ برادر شاہ نظام الدین احمد قادری است کہ در عہد مربتہ بالاختیار نظم و نسق صوبہ چہاں آباد بادے بودہ''۔52

اور قطب الدین باطن نے ان کے بارے میں بعض تفصیلات قلمبند کی ہیں:

''غمگین تخلص، میر سید علی نام، جگر بند میر سید محمد مرحوم، دہلی ان کا مسکن، بہمہ صفت موصوف.... متین و ذہین، اب ان کا کون ہم فن، گوالیار مقام، وہیں قیام.... خاص گوالیار میں قبر ہے''۔53

ان کے کچھ شعر یہ ہیں۔

حمد ہے جس نے جو کلام کیا　　میں نے یوں حمد کو تمام کیا
نعت وہ ہے کہ حق تعالیٰ نے　　جس میں اپنا ظہور نام کیا
تو نے صیاد نیا ظلم یہ ایجاد کیا　　بال و پر توڑ قفس سے مجھے آزاد کیا
مہرباں کوئی مرا جز غم دلدار نہیں　　خس کا شعلے کے سوا اور خریدار نہیں

میر سید علی غمگین کی شخصیت گوالیار اور مضافات میں نہایت مقبول و محترم تھی، اس لیے ان کی شاعری کے اثرات بھی اس جوار میں خاصے مستحکم رہے تھے۔ زبان ان کی بہت صاف اور شستہ تھی۔

21-موج

گوالیار کے راجاؤں کو ہمیشہ سے فن موسیقی سے نہایت دلچسپی رہی ہے۔ ان کی سرپرستی میں اس فن کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا تھا۔ وہاں کے بعض کلاونت اپنی ضرورت اور شوق سے خود بھی کچھ کچھ موزوں کرتے رہے ہیں اور اپنے کمال فن کے اظہار کے لیے ملک کے مختلف مراکز کی سیر بھی کرتے رہے ہیں۔ آگرے سے قرب کی وجہ سے ان میں سے بعض نے وہاں سکونت بھی اختیار کر لی تھی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرے میں ایک بڑے کلاونت کا حال اس طرح لکھا ہے:

''موج تخلص، خدا بخش از سرایندگان مشہور است، خانہ در اکبر آباد و در فن خویش ساز و برگ خوشے داشتہ بہ دہلی گذار نیدہ، بارہا بہ شم آمدے، مرد خوش صحبتے ظریفے بودہ چند سال است کہ در لکھنؤ فوت کردہ، طبعے موزوں داشتہ، گاہے فکر شعری کرد''۔54

قطب الدین باطن ان کے احوال سے بہتر طور پر واقف تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ موج نے لکھنؤ میں نہیں، آگرے میں وفات پائی تھی، انھوں نے موج کی وفات کے سلسلے میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھا ہے:

''موج تخلص، خدا بخش نام، دریائے مزاج علم موسیقی میں،... ہم پیشہ ان کی ہر تال پر سُم کھاتے.... مرد ذی لیاقت، باوقار، دہلی اور لکھنؤ کے سوا ان کے پامال اور دیار وطن اصلی جد دہلی، ہنگام درود بخدمت جد امجد بہر استفادہ قدمبوس ہر روز ضرور تشریف لاتے، مباہات دینی و دنیوی و فیض ظاہری و باطنی سے بہرہ ور ہوتے.... بتاریخ نہم صفر

کو روز عرس میر ابوالعلا صاحب نورہ مرقدہ تھا، 1245 ہجری میں ہنگام سماع بہ فرمائش
جد بزرگوار موج مرحوم۔ نے یہ قطعہ کہ واقعی قطعۂ زیست ان کا تھا پڑھا۔ 55

دل غیر تو آشنا نہ دارد　　جز خاک درِ تو جا نہ دارد
کاشانۂ چشم و خانۂ دل　　بے نورِ رُخت ضیا نہ دارد

بہر حال بعد انفراغ حال وقال فاتحہ کا انجام ہوا، موج صاحب کے دل میں جب لہر آئی تو وہاں سے حسب ارشاد حضرت کنارا کر کے بہ روضۂ قلزم فیض مولوی بیدار صاحب کے قیام ہوا، صبح کو بظاہر عارضۂ ہیضہ میں مبتلا ہو کر دسویں تاریخ اسی جگہ روح ان کی طبل جسم سے باہر ہوئی۔ سہ پہر کے وقت لاش تاج گنج میں لائے اور درگاہ حضرت سید احمد بخاری میں دفن کیا۔ یہ سب قصہ ہے میری چشم دیدہ....''۔

خدا بخش موج گانے بجانے کے لیے شعر کہتے تھے۔ شاعر کی حیثیت سے خود کو نمایاں کرنا مقصود نہیں تھا اس لیے وہ سنگلاخ زمینوں میں معمولاً شعر نہیں کہتے تھے، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

صنم ہے، گلبدن ہے، مہ جبیں ہے　　بھلا کہیے تو کیا کیا کچھ نہیں ہے
مجھے قدموں پہ سر رکھنے دو صاحب　　تمھارا موج بندہ کمتریں ہے
چھپ گئے ابر میں پہلے ہی سے جا شمس وقمر　　اس نے چہرے سے نقاب اپنے اتارا ہی نہیں
بحر میں عشق کے اے موج تو زنہار نہ تیر　　یہ وہ دریا ہے کہیں جس کا کنارا ہی نہیں
جب خندہ ہائے گل بھی ہو بار گراں مجھے　　بلبل کا کیوں کہ خوش لگے شور وفغاں مجھے

قطعہ

دو آرزو ہیں موج کی یا شہِ کردگار　　حرمت کے ساتھ دنیا میں رکھیو یہاں مجھے
اور دوسری، جو حشر کے دن ہووے آشکار　　کوثر سے بھر کے دیجیو اک جام واں مجھے

موج کے بظاہر ان بعض شعروں میں معشوقان مجازی کے تذکرے ہیں۔ لیکن ذرا غور وتامل سے معلوم ہوگا کہ یہ سب عشق حقیقی کے معاملات پر مشتمل ہیں۔ ایسے ہی شعروں پر اہل دل پر وجد وحال طاری ہو جاتا ہے۔ زبان ان کی صاف اور رواں ہے۔ مضامین بھی سامنے کے ہیں اور طرز بیان تہ داری کے باوجود سریع الفہم ہے۔ موج حسب موقع اپنی غزلوں میں قطعے بھی شامل کر دیتے تھے۔

22-لہر

یہ موج کے بیٹے تھے۔انھوں نے باپ کے تخلص کی مناسبت سے اپنے تخلص کا انتخاب کیا تھا،شاعری کی حیثیت سے ان کو بھی شہرت نہیں ملی تھی۔صرف باطن نے اپنے تذکرے میں ان کا احوال لکھا ہے:

" لہر تخلص، بیدار بخش نام متوفی خلف شیخ خدا بخش موج کلاونت، مرد شائستہ، جوان خوش تقریر، ذی حوصلہ بالیاقت، بہ علم موسیقی یکتائے زمان، اکثر روزگار جلیل القدر سے حاصل تو قیر، عرصہ قریب ہوا کہ بہ سرکار مہاراجا گوالیار بہ مشاہرہ معقول ملازم ہوئے اور چند روز میں معزز ان اس علم سے سبقت لے جا کر قائم ہوئے، ہم فنوں نے از راہ بغض وحسد زہر کھلایا اور یہ علیل ہو کر سمت فخر دہلی روانہ ہوئے، شہر کے قریب ایک گاؤں میں جس کا گلویہ نام، ان کے دم نے نکل کر دشمنوں کا جی خوش کیا، سید احمد بخاری کے مزار میں مدفن قرار کیا، جہاں ان کے والد دفن ہیں، قبر کی جگہ پائی، جب 1260 ہجری تھے، حضرت استاد نظیر ان کو بھی دلپذیر....."۔56

شاعری سے مقصود ان کو بھی وہی تھا، باطن نے ان کا صرف ایک شعر لکھا ہے۔

اپنی وحشت کا نہ صحرا میں بھی ارماں نکلا　　پاؤں پھیلا نہ سکے، تنگ بیاباں نکلا

23-محو

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ان کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے:

"محو تخلص، حسین علی خاں اکبر آبادی، بہ خدمات انگریزی بسری برد"۔57

البتہ قطب الدین باطن نے ان کا تعارف قدرے تفصیل سے قلمبند کیا ہے:

"محو تخلص، منشی حسین علی خاں نام، مولد ومنشا جد دہلی، اصل کشمیر، برادر حقیقی قاضی واجد علی خاں،.... یہ صاحب بہ عہدۂ جلیل القدر انگریزی سرفراز، والد ماجد عاصی سے ازبس یکجہتی تھی اور نیاز، عرصۂ دراز تک بہ سرکار مہاراجا گوالیار مختار رہے، 1250ھ میں اس جہاں کو گوشۂ خاطر سے محو کیا، آدمی خوش فکر ہیں، ہادی شعرا (نظیر) مرحوم سے صلاح سخن کے ذکر میں معتمد علیہ.....ان کے کلام پر ایک عالم محو ہے"۔58

حسین علی خاں محو کے چند شعر یہ ہیں۔

موبسواس دل صد چاک میں ہے جلوۂ یار	مجھ کو شانے کی قسم زلف پریشاں کی قسم
آج آیا مجھے اس رشک قمر کا پُرزہ	میں بھی بھیجوں گا جواب اپنے جگر کا پرزہ
چہرہ ہے سرخ، حسن کی تم کو امنگ ہے	ہم زرد عشق میں ہوئے اپنا یہ رنگ ہے
سنگ پھینکے ہے مری قبر پہ گل کے بدلے	گالیاں دے ہے پس مرگ بھی قُل کے بدلے

محو قادر الکلام شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ روایتی اور سامنے کے مضامین اپنے وقت کی بول چال کی زبان میں بے تکلف نظم کرتے تھے۔ مختلف قسم کی صنعتوں کے صَرف کا ان کو شوق زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ باوجود اس کے طرز بیان میں پیچیدگی اور دقت پیدا نہیں ہوتی ہے۔

آگرہ میں اردو شاعری کے دونوں معروف مراکز دہلی اور لکھنؤ کے اثرات پہنچ رہے تھے۔ لیکن وہاں معتبر استاذوں میں سے چونکہ کسی کا بھی مستقل قیام نہیں تھا۔ عموماً اساتذہ کی تقلید کی جارہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے میں وہاں کوئی صاحب طرز شاعر پیدا نہیں ہوا، البتہ نام برآوردہ شاعروں میں تقریباً سبھی قادر الکلام تھے۔ یہاں کے شاعروں کی زبان عموماً صاف اور رواں تھی۔ لیکن زبان کو نکھارنے سنوارنے کی طرف توجہ کم تھی۔

(ب) ہزل وریختی

آگرے میں بطور مجموعی اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ہزل وغیرہ کے لیے ماحول سازگار نہیں رہ گیا تھا۔ اس میں وہاں کے سیاسی حالات کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ راجا بلوان سنگھ ہوں یا سلیمان شکوہ دونوں ہی اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس تھے۔ شاعروں کو بھی یہاں فارغ البالی نصیب نہیں تھی۔ اس کے باوجود محض ضمناً ظریفانہ کلام کے کچھ نمونے مل جاتے ہیں۔

1۔ نظیر:

نظیر اکبر آبادی عوام کے شاعر تھے اور عوام اپنے لیے ہنسی مذاق کے پہلو بہر حال نکال لیتے ہیں۔ نظیر کی شاعری کے موضوعات اور ان کے مخصوص طرز بیان سے تو بحثیں بہت کی گئی ہیں۔ لیکن ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں کی طرف تفصیل سے جیسی کہ چاہیے توجہ کم کی گئی ہے۔ عبدالباری آسی نے البتہ اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

> ''نظیر کی ظرافت اگرچہ ہزل اور بعض دفعہ فواحش تک پہنچ جاتی ہے، مگر اس کے الفاظ وخیالات اس کو بے مزہ اور پھیکا نہیں ہونے دیتے، اس کی ظرافت میں تصنع اور آورد کا نام نہیں ہے۔ طبیعت اس کو خود اکساتی اور ظرافت کی طرف لے آتی ہے''۔1

نظیر کی ظریفانہ شاعری کے جو نمونے آسی نے پیش کیے ہیں وہ ریختی کے دائرے میں

آجاتے ہیں۔

مرتی نہیں بہنا، یہ گذرتی نہیں ڈھڈ ھو — اور قہر خدا سے بھی یہ ڈرتی نہیں ڈھڈ ھو
لب اپنے ذرا بند یہ کرتی نہیں ڈھڈ ھو — کیا سخت خرابی ہے یہ مرتی نہیں ڈھڈ ھو
ایسا جو مرے پاس لگی جائے گی جھانپو — اک روز مجھے گھر سے نکلوائے گی جھانپو
سب کھا چکی اب مجھکو بھی کیا کھائے گی جھانپو — وہ کون سا دن ہوگا جو مر جائے گی جھانپو

نظیر اکبرآبادی کے کلام پر اگر توجہ کی جائے تو اس میں شائستہ مزاحیہ عنصر کی بھی کچھ کمی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہاں محض چند شعر نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

بالفرض اگر ہم ہوئے حوا کے شکم سے — آدم کے تئیں پوچھیے یہ کس کا جنا ہے
چھلکتی نکلی ہیں اشکوں کی شیشیاں یارب — ہمارے سینہ میں کس شیشہ گر کی بھٹی ہے
بیٹھے بٹھائے خلد میں ابلیس نے نظیر — کیا دم دیا ہے حضرت آدم کو دیکھیے
اب تو ذرا سنا گاؤں ہے بیٹی اسے نہ دے — لگتا تھا ورنہ چین کا داماد آگرہ

2-ذلیل

یہ کوئی غیر معروف شاعرہ تھی۔ تذکرہ بہارستان ناز میں اس کا صرف ایک شعر درج ہے۔ آسی نے البتہ اس کے حال میں کچھ اضافہ کیا ہے:

"ذلیل، نو بہار نام تھا، مرزا سلیمان شکوہ بہادر کی کنیز تھی، نہایت شوخ، تیز طبع تھی، شعر گوئی کا شوق تھا مگر تخلص کی رعایت کو ہمیشہ مدنظر رکھتی تھی، یعنی ریختی کے نحش شعر کہتی تھی، دو شعر جو صاف ہیں نقل کرتا ہوں۔ 2

میں فرشتے کی بھی سنتی نہیں، ناصح کیا ہے — اپنی کرتوت پہ جس دم کہ اتر آتی ہوں
تم سے اللہ رکھے اپنی اماں میں مرزا — ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا لیتے ہو

(ج) خمسے وغیرہ

1-نظیر:

اکثر ناقدین نے نظیر اکبر آبادی کو اردو میں نظم جدید کا بانی قرار دیا ہے اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ انھوں نے شعر گوئی کے لیے ایسی ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کو موضوع بنایا تھا جن کی طرف ثقہ اور معتبر شاعروں نے عموماً توجہ نہیں کی تھی، نظیر کے وقت میں بالخصوص آگرے میں کسی متعین موضوع یا کسی مخصوص عنوان سے متعلق شعر کہنے کا رواج نہیں تھا، انھوں نے اس باب میں پہل کی اور اس طرح کی کہ اسی کو اپنے لیے طرۂ امتیاز بنالیا، اردو اور اس سے پہلے فارسی میں بھی ترکیب بند اور ترجیع بند کا وجود تھا، نظیر نے اپنی نظم گوئی کے لیے انھیں اصناف کو اختیار کیا، ان دونوں صورتوں میں ہر بند مصرعوں کی تعداد برابر رکھی جاتی ہے، البتہ تعداد کے تعین کا اختیار شاعر کو ہوتا ہے اور اسی تعداد کی مناسبت سے ہر نظم کو موسوم کرتے ہیں، چنانچہ تین مصرع والی نظم مثلث، چار والی مربع، اور جس میں پانچ مصرع ہوں اسے مخمس کہتے ہیں، باطن کے بقول نظیر نے ''مستزاد مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، معشر، قطعہ بند، ترکیب بند، ترجیع بند، تضمین'' سبھی کچھ لکھے تھے [1]، لیکن زیادہ تر انھوں نے مخمس اور مسدس لکھے تھے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے بھی تحریر کیا ہے کہ:

''بیشتر خمسہ و مسدس کہتے تھے، کلیات ان کا نظر سے گذرا''۔ 2

مخمس یا مسدس وغیرہ میں شاعر اپنے یا کسی دوسرے شاعر کے ایک شعر پر یا پوری غزل کے ہر شعر پر تین یا چار زیادہ یا کم مصرعے اس طرح لگاتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مربوط و مسلسل اور ہم آہنگ ہوں، بعد کے زمانے میں قادر الکلامی کے اظہار کے لیے اساتذہ نے یہ قید بھی لگادی کہ ہر بند کے سب مصرعے الگ الگ مصرع آخر کے ساتھ مربوط و بامعنی ہوں۔

نظیر اکبر آبادی نے مختلف پیشہ وروں کی خاطر سے ترکیب بند اور ترجیع بند کی صورت میں کبھی مخمس اور کبھی مسدس وغیرہ لکھے تھے، چنانچہ ان کی نظمیں بنجارہ نامہ، کوڑی نامہ، کورے برتن اور مسافر نامہ وغیرہ مشہور ہیں، مصرع ترجیع سے نظیر کی نظموں میں کیفیت اور لطف کی صورت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، ترکیب بند کی شکل میں ان کی دو نظموں کے کچھ بند نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

پری کا سراپا

ہر جنبش میں سو جھنکاریں، ہر قدم پر سو جھمکے — وہ چنچل چال جوانی کی، اونچی ایڑی نیچے پنجے
کلغتوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہے
مذکور کروں کیا لب یارو، اس شوخ کے کیا کیا چنچل پن — کچھ ہاتھ ہلیں کچھ پاؤں ہلیں، پھڑکے بازو تھرکے سب تن
کالی وہ بلا، تالی وہ ستم ہنگلی کی نچاوٹ ویسی ہے
یہ شوخی پھرتی، بیتابی ایک آن کبھی مچلی نہ رہے — چنچل اچپل، مٹکے چٹکے، سو کھولے ڈھانکے ہنس ہنس کر
قہقہہ کی ہنساوٹ اور غضب ٹھٹھوں کی اُڑاوٹ ویسی ہے

روضہ تاج گنج

یارو یہ تاج گنج جو یاں آشکار ہے — مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے — روضہ جو اس مکاں میں دریا کنار ہے
نقشہ میں اپنے یہ بھی عجب خوش نگار ہے

روئے زمیں پہ یوں تو مکاں خوب ہیں یہاں — پر اس مکاں کی خوبیاں کیا کیا کروں بیاں
سنگِ سفید سے جو بنا ہے قمر نشاں — ایسا چمک رہا ہے تجلی سے یہ مکاں

جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے

گنبد میں اس کا زور بلندی سے بہرہ مند　　گرد اس کے گمذیاں بھی چمکتی ہوئی ہیں چند
اور وہ کلس جو ہے سر گنبد سے سر بلند　　ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند

ہر ماہ جس کے خم پہ مہِ نور نثار ہے

ترجیع بند کے نمونہ کے طور پر نظیر کی مشہور نظم ''اسرار قدرت'' کے ابتدائی صرف دو بند یہاں لکھے جاتے ہیں۔

جہاں میں کیا کیا خرد کے اپنی ہر اک بجاتا ہے شادیانے
کوئی حکیم اور کوئی مہندس، کوئی ہو پنڈت کتھا بکھانے
کوئی ہے عاقل، کوئی ہے فاضل، کوئی نجومی لگا کہانے
جو چاہو کوئی یہ بھید کھولے، یہ سب ہیں حیلے، یہ سب بہانے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

ہوا کے اوپر، یہ آسماں کا بچھو با خیمہ جو تن رہا ہے
نہ اس کی میخیں، نہ ہیں طنابیں، نہ اس کی چوبیں ادھر کھڑا ہے
ادھر ہے چاند اور ادھر سورج ، ادھر ستارا اُدھر ہوا ہے
کسی کو مطلق خبر نہیں ہے کہ کب بنا اور کاہے کا ہے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

نظیر کی ان نظموں میں بیان کے لطف کے ساتھ ساتھ فکر کی تیزی اور مشاہدے کی خوبی بھی داد طلب ہے۔ شاعر نے مقامی الفاظ و مصطلحات کا بھی سلیقے سے صَرف کیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے بعض لفظ خود بھی گڑھ لیے ہیں۔

نظیر نے ترکیب بند اور ترجیع بند لکھنے کے علاوہ اردو اور فارسی کے بعض شاعروں کے کلام کی تضمین بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم جوگی نامہ میں فارسی کے ایک مصرع کی تضمین کی گئی

ہے3، اس نظم کے آخری مصرعے یہ ہیں۔

پھرتا ہوں گلیوں میں دیوانہ سا ہر روز ضریر　　کیا لکھوں اب تو گذرتی ہے جو کچھ مجھ پہ نظیر

دل من داند و من دانم و داند دل من

نظیر اکبرآبادی نے شیخ سعدی کی مشہور نظم "کریما" کی بھی تضمین کی تھی۔ اس کے ہر شعر پر اردو میں مصرعے لگائے تھے۔ نظیر کی یہ تضمین بہ صورت مسدس ہے اور بارہا چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اور اس کا پہلا ایڈیشن 1269ھ (1853) میں مطبع چشمۂ فیض سیال کوٹ سے چھپا تھا۔

حکیم میر قطب الدین باطن نے بھی نظیر کے حال میں اطلاع دی ہے کہ:

"دیوان حافظ کی چند غزلیں زیور خمسہ سے مرصع ہوئی ہیں، باقی سب جواہر فکر سے مرصع ہوئی ہیں"۔4

اس میں شبہ نہیں کہ تضمین اور خمسہ وغیرہ کے لکھنے میں نظیر بے مثال تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو کے کسی بھی شاعر نے نظیر کی پوری طرح اتباع نہیں کی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کی شاعری نے جدید نسل کے ذہن اور طرز فکر و بیان کو بخوبی متاثر کیا ہے۔

2- باطن:

حکیم میر قطب الدین باطن نظیر کے بیٹے اسیر کے شاگرد تھے۔ لیکن نظیر سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی خمسے وغیرہ لکھے تھے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے حامد حسن قادری کی کتاب کے حوالے سے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"چار دیوان، اور مثنوی میر حسن کا خمسہ موسوم بہ اعجاز رقم ان سے یادگار ہیں"۔5

(د) رباعی

غزل کے بعد شعرائے اردو نے بطور مجموعی جس صنف سخن سے سب سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے وہ بظاہر رباعی ہی ہے۔ قدیم یا جدید معروف یا غیر معروف کسی بھی شاعر کے دیوان کو اٹھا کر دیکھو مشکل ہی سے کوئی ایسا ملے گا جس میں ایک دو بھی رباعیاں نہ ہوں۔

عشق ایک فطری جذبہ ہے جس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے، محمد تقی میر نے صحیح ہی کہا ہے

ع سارے عالم میں پھر رہا ہے عشق

فارسی اور اس کے توسط سے اردو شاعری میں بھی اسی جذبہ کو مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بیشتر شعراء کی رباعیوں کا موضوع براہ راست یا بالواسطہ یہی ہے۔

نظیر اکبر آبادی صوفی منش تھے۔ تعلیم اطفال پر بسر کرتے تھے۔ ان کی رباعیوں میں بھی اکثر میں عاشقانہ اور اخلاقی و اصلاحی مضامین نظم ہوئے ہیں، یہاں مثال کے طور پر ان کی کچھ رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔

محبوب نے پیرہن میں جب عطر ملا　　اور پان چبا کے اپنے گھر سے وہ چلا
ہم نے یہ کہا، نہ جاؤ باہر اے جاں　　ہے شام قریب، ہنس دیا کہہ کے بھلا
اس شوخ کو ہم نے جس گھڑی جا دیکھا

مکھڑے میں عجب حسن کا نقشہ دیکھا
اک آن دکھائی ہمیں ہنس کر ایسی
جس آن میں کیا کہیں کہ کیا کیا دیکھا

ہوں کیوں نہ بتوں کی ہم کو دل سے چاہیں ہیں ناز و ادائیں، ان کی کیا کیا راہیں
دل لینے کو سینے سے لپٹ کر کیا کیا ڈالی ہیں گلے میں پتلی پتلی بانہیں

کیا حال اب اس سے اپنے دل کا کہیے
منظور نہیں یہ بھی کہ بیجا کہیے
مشکل ہے مہینوں میں نہ جائے جو کہا
مل جائے جو اک دم میں تو کیا کیا کہیے

ان رباعیوں میں شاعر نے جس محبوب کے معاملات کا بیان کیا ہے وہ بدیہی طور پر گوشت پوست کا ہے اور اسی دنیائے آب وگل میں رہتا بستا ہے۔ اس کے تمام عمل اور معمول جانے پہچانے اور فطرت کے عین مطابق ہیں۔ بعض رباعیوں میں شاعر نے مکالماتی انداز بھی اختیار کیا ہے اور اس طرح اس کی رباعیاں زیادہ دلچسپ اور عام انسانی زندگی سے قریب تر ہوگئی ہیں۔

آگرے کے اس وقت کے بیشتر شاعروں نے رباعیوں میں بھی نظیر اکبر آبادی کی اتباع کی ہے۔

اس زمانے میں آگرے کے بعض شاعروں نے قطعے بھی کہے ہیں۔ مثال کے طور پر شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کا ایک قطعہ یہ ہے۔

کپڑے کیے ہیں گیروے بہتوں نے ہو فقیر آج کتنے ہوئے لہو میں لال سرخ ترے لباس سے
میرے سخن کی قدر کو جانے سلیمان وہ کوئی جو اسے دیکھے غور کر چشم گہر شناس سے

(ہ) مثنوی

مثنوی طویل اور مربوط نظم ہوتی ہے اور طویل نظم لکھنے کے لیے فرصت اور طمانیت دونوں کا میسر ہونا ضروری ہے۔ آگرے میں فرصت تو ضرور رہی ہوگی لیکن اطمینان وسکون کی صورت کم تھی۔ اس لیے وہاں طویل مثنویاں لکھنے کا موقع زیادہ نہیں تھا۔

1-نظیر:

میر قطب الدین باطن کے قول کے مطابق نظیر نے تقریباً سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ ان کا کلیات مثنوی کے نمونوں سے بھی خالی نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے کوئی طویل مثنوی نہیں لکھی تھی۔ البتہ ان کی مثنویوں میں موضوع اور فکر کے لحاظ سے تنوع موجود ہے۔

یہ بات معلوم ومشہور ہے کہ نظیر کو مناظر فطرت سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ اور وہ ہر منظر کے ایک ایک جزو کا بہت اہتمام اور تفصیل سے مشاہدہ اور پھر بیان کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی روش عام سے ہٹ کر لکھی ہے، پروفیسر گیان چند نے کہ جن کی طینت نہایت نکتہ چیں واقع ہوئی ہے اس کے تعارف میں لکھا ہے:

"پہلی مثنوی سیر دریا ہے، اس میں ایک سو شعر ہیں، اس میں کوئی قصہ یا واقعہ نہیں، محض

منظر نگاری ہے"۔1

اس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ نظیر نے اس میں دریا کی سیر کو جس کے واقعہ کے ہونے میں کسی بھی صاحب فہم وبصیرت کو کلام نہیں ہوسکتا پورے شرح وبسط کے ساتھ نظم کیا ہے، مثنوی کی ابتدا انھوں نے اس واقعہ سے کی ہے کہ دل میں دریا کی سیر کا خیال پیدا ہوا۔

یک زماں از بحر عشرت زائے دہر — آگئی دریائے خاطر میں یہ لہر
یعنی تک دریا کی جانب جایئے — دوگھڑی دھواں دل کو خوش کر آیئے
آ پڑا جب یہ ارادہ دھیان میں — جا پڑا دل شوق کے عمان میں
جی طلب کا سر بسر گھر ہوگیا — لجۂ خواہش سمندر ہوگیا
ہر طرف سے دل کے ہوکر دوبدو — جوش میں آیا محیط آرزو
آگئی کثرت میں فوج اشتیاق — سر سے گذری دل کے موج اشتیاق

بظاہر ذرا سی بات تھی جس کو شاعر کی فکر تیز نے مختلف مدارج میں تقسیم کر کے افسانہ بنا دیا ہے اور یہ مثنوی اسی افسانہ کے مختلف واقعات اور ان واقعات کے دوران سامنے آنے والے طرح طرح کے کرداروں کے بیان پر مشتمل ہے۔ کم نظر اپنی بے بصیرتی پر پردہ ڈالنے کے لیے نظیر پر معترض ہوتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ کسی منظر کا سامنے آنا بھی ایک واقعہ ہے چنانچہ محض منظر نگاری کی بات بجائے خود لایعنی محض ہے۔

کشتی دریا کی سیر کے لوازمات میں سے ہے۔ اس کے موجود ہونے اور پھر پانی میں رواں ہونے، کناروں کے ہرے بھرے درختوں کا نظر آنا وغیرہ مختلف النوع واقعات ہیں اور ان سب کا نہایت وضاحت صراحت اور سلیقہ سے، تسلسل کے ساتھ شاعر نے بیان کیا ہے ۔

کھینچ کر لنگر ہوس نے ناگہاں — زورق خاطر پہ باندھا بادباں
تند تر ہوکر تمنا کی ہوا — لے چلی کشتی طبیعت کی بہا
کیوں نہ وہ کشتی رواں ہر آن ہو — شوق جس کشتی کا کشتی بان ہو
کیوں نہ وہ کشتی طپش لیتی چلے — جس کو خواہش اور طلب کھیتی چلے
کیوں نہ وہ کشتی رواں ہو مثل باد — جس کی ہووے آرزو باد مراد

کیوں نہ وہ کشتی روانی میں ہو طاق　　جس کے پتوار ہوں بہ دست اشتیاق
کیوں نہ وہ کشتی رواں ہو تیر ساں　　جس کے قبضہ میں ہوس کی ہو کماں
کیوں نہ وہ کشتی ہو پَرّاں آب پر　　دے تمنا جس کو ہر دم بال و پر
الغرض غالب ہوئی جب دل کی چاہ　　سیل کی مانند لی دریا کی راہ
جب نظر آیا کنارا بحر کا　　اس کے پہلو سے لگا اس دشت تھا

اس کے بعد مختلف اجزا میں سے بعض یہ ہیں:

صفت دریا، صفت شیرینی آب، صفت خنکی آب، صفت موج، صفت حباب، صفت گرداب، صفت ماہی، صفت صدف و ریگ، صفت ساحل، صفت ذرّۂ ریگ۔

یہی افسانے کے اجزاء ہیں اور انھیں سے شاعر دل لگا رہا ہے، خیال کرنے کی بات ہے کہ ان میں سے ہر جز وحقیقی اور واقعی ہے، اور اسی دنیائے آب و گل سے متعلق بھی ہے، شاعر کہتا ہے۔

دل نے یوں چاہا کہ اب رہیے یہیں　　خلق میں کہلایئے صحرا نشیں
چھوڑیے دانش کی خوش اسلوبیاں　　دیکھیے دیوانہ پن کی خوبیاں
بے محابا شادمانی کیجیے　　بے تکلف زندگانی کیجیے

ان شعروں میں نظیر نے زندگی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے، اور اس کا پس منظر وہ ہے جس کا اس نے مفصل بیان کیا ہے، اس اعتبار سے بھی اس مثنوی کو "محض منظر نگاری" کہہ دینا بڑی زیادتی کی بات ہے، بے شک اس میں منظر نگاری کے بہت اچھے نمونے موجود ہیں، اور ان کے لیے شاعر کو نئی نئی تشبیہوں کے علاوہ مختلف قسم کی رعایتوں اور تلازموں سے کام لینا پڑا ہے۔ ان سے اس کے زور تخیل، خوبی مشاہدہ اور قوت فکر و بیان کا بھی ثبوت ملتا ہے، اسے اردو کی کامیاب لیکن مختصر مثنویوں میں شمار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی دوسری مثنوی حسن و عشق کے روایتی افسانے پر مشتمل ہے۔ اس کا قصہ بس اتنا ہے کہ ہیرو ایک دن شکار کے لیے نکلا۔ جنگل میں ایک جگہ اسے تیز خوشبو معلوم ہوئی جسے اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے بھی محسوس نہیں کیا۔ وہ خوشبو ہیرو کو مع اس کے گھوڑے کے اڑا کر دشتِ پریشاں میں لے گئی۔ پریاں اس کے حسن عالم فریب کی گرویدہ ہو گئیں۔ آخر ایک حسین

پری اس کے ساتھ شادی کر لیتی ہے۔

شاعر نے ہیرو کے مردانہ حُسن کا ایسی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اسے پڑھ کر ایک امرد بچہ پسر کو اس آئینہ سے یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں اسے امرد پرستی کے لئے تختۂ مشق تو نہیں بنالیا جائے گا۔ نظیر کی اس مثنوی میں ایک اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس کی ابتدا حسن کی تعریف سے کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خدا کو حسن مطلق قرار دے کر ہر زمانے میں اردو کے شاعروں نے اس کی مدح و توصیف کی ہے۔ یہ بھی ہوا ہے کہ مثنویوں میں محبوب کے سراپا کا بیان تفصیل سے کیا گیا ہے اور حسن سے متعلق بعض روایتیں بھی مشہور ہیں۔ لیکن اس مثنوی میں چونکہ انسانوں سے الگ ایک بستی کا قصہ سنایا گیا ہے۔ یہاں اظہار عشق اس غیر انسانی مخلوق کی طرف سے کیا جانا مناسب تر تھا جس نے ہیرو کو اغوا کر کے اپنی بستی میں منگا لیا تھا، نظیر اکبر آبادی نے اپنی اس مثنوی کو اس طرح شروع کیا ہے۔

عجب دلکشا عالم حسن ہے　　عجب دل فزا عالم حسن ہے

نظیر کی اس مثنوی میں مناظر کی کیفیت کے بیان کا انداز یہ ہے۔

معطر ہوا جب انھوں کا مشام　　تو ہنس کر کہا واہ رے یاں کی شام
یہ پھرتے تھے یوں بام پر شادماں　　پھرے جوں فلک پر مہ آسماں
کوئی دو گھڑی بعد پھر واں شتاب　　نمایاں افق سے ہوا ماہتاب
وہ تھا کوہ اس جا جو آئینہ رنگ　　تو کیا کیا چمکنے لگے اس کے سنگ
درختوں کے پتے سہانے لگے　　ہر اک شام پر جگمگانے لگے
ضیائیں اِدھر چاندنی رات میں　　نمائش اُدھر جوں طلسمات میں
چمکنا جو تھا بھا گیا چاند کا　　چکوریں بھی ناچے تھیں چاہت جتا
وہ سب دشت داں مہ کے دستور سے　　جھمکنے لگا ہر طرف نور سے

کوئی سوا تین سو شعر کی اس مثنوی میں شادی کا بیان بہت اختصار سے کیا گیا ہے، وجہ غالباً یہی ہو کہ یہ غیر جنس کے ساتھ معاملات کی بات تھی اور اس تقریب میں وہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تھا جو انسانوں کے یہاں معمول ہے۔

نظیر کی تیسری مثنوی میں کوئی بڑی بات ڈگر سے ہٹی ہوئی نہیں معلوم ہوتی ہے۔اس کی ابتدا ''توصیف عشق'' سے ہوتی ہے، کہتے ہیں۔

عجب عشق کا رتبہ وجاہ ہے　　عجب عشق کی رسم اور راہ ہے

اس مثنوی کا قصہ مختصراً اس طرح ہے کہ ہیرو اپنے باغ میں نصف شب تک داد عیش دیتا رہتا ہے۔ پھر اسے نیند آ گئی۔اس حال میں کوئی نازنین اس کا دل چرا کر لے گئی۔ جب وہ بیدار ہوا تو دل نہ ہونے کی وجہ سے اسے سخت بیقراری ہوئی۔ ہر چند تلاش کیا۔اُس حسینہ کا سراغ نہ مل سکا۔ ایک دن کسی نے ذکر کیا کہ ایک جنگل میں ایک شام کو کچھ پرندے آئے وہ سب لوٹ پوٹ کر پری زاد بن گئے۔ پھر انھوں نے اپنی محفل آراستہ کی۔ یہ سن کر ہیرو اس محفل کی جستجو میں نکل کھڑا ہوا اور بالآخر وہاں پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں صدر محفل کی محبوبہ اس پر مہربان ہو گئی۔اس نے ہیرو کی حسینہ کا حلیہ معلوم کیا۔ وہ ایک پری سے ملتا تھا۔اس کی توجہ سے ہیرو سے وہ پری ملی اور اس طرح دونوں کی مراد بر آئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے یہ مثنوی نظیر کو جلدی سے مکمل کرنی پڑی تھی۔ اس لیے انھوں نے اس کے قصے کو کوتاہ کر دیا ہے۔مثنوی کے شروع میں باغ کا ذکر آیا ہے۔اس موقع کے چند شعر نمونہ کے طور پر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

ادھر سرو کی سنبل آغوش میں　　ادھر ڈالیوں کی کُل آغوش میں
ادھر چاندنی جگمگاتی ہوئی　　ادھر نرگس آنکھیں لڑاتی ہوئی
وہ غنچوں کے لب مسکراتے ہوئے　　وہ گل شاخ پر کھل کھلا ہوئے

اس میں ہیرو کی محفل عشرت کا بیان بھی دلچسپ ہے۔اس بیان میں تصنع کا اثر کم سے کم ہے۔اس مقام کے کچھ شعر یہ ہیں۔

مے وساقی و مطرب خوشنوا　　سبھوں نے دیا حسن محفل بڑھا
صراحی گلابی جھکنے لگی　　مے ناب ہر دم جھلکنے لگی
وہ رقاصہ ہا شوخ اور اچپلی　　اور ان کی وہ چنچل نگہ چلبلی

دل کے غائب ہو جانے کے احساس نے ہیرو کو بے قرار کر دیا تھا۔اس کیفیت کو شاعر نے

ذیل کے شعروں میں نظم کیا ہے۔

خلل آ گیا اس کے احوال میں — پڑا کچھ عجب ڈھب کے جنجال میں
تپش دم بدم دل کے ہمراہ تھی — خلش ہر گھڑی ، ہر نفس آہ تھی
نہ لگتی تھی کچھ بات جی کو بھلی — وہی بے قراری، وہی بے کلی
تحیر میں آکر پڑا ایک بار — نہ دل کو تسلی نہ جی کو قرار
رکھے دل میں اس بھید کو یا کہے — عجب حال تھا کیا کرے، کیا کہے

یہ عشقیہ مثنوی کوئی دو سو شعروں پر مشتمل ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی سبھی مثنویوں کی زبان صاف، سلیس اور شگفتہ ہے، کہیں کہیں افعال امدادی اور حروف معنوی وغیرہ کے حذف سے قدامت کا انداز نمایاں ہو جاتا ہے، بعض لفظوں کا تلفظ بھی ویسا ہی ہے، مثلاً وہاں بجائے وہاں اور بھاں بجائے یہاں وغیرہ، تینوں مثنویوں میں جذبات اور مناظر وغیرہ کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ فکر اور خیال کی رسائی اور تیزی بھی داد طلب ہے۔ بیان مربوط اور دلچسپ ہے۔ بعض مواقع پر طول کلامی بھی اپنا الگ لطف دکھا جاتی ہے، کچھ شک نہیں کہ نظیر نے اردو کو یہ اچھی مثنویاں دے دی ہیں۔

2- ذوالفقار علی

ذوالفقار علی نامی یہ کوئی گمنام شیعہ عالم تھے۔ شروع میں دہلی میں رہتے تھے، وہاں شاہ عبدالعزیز دہلوی سے مباحثے کرتے رہے، پھر آگرے میں سکونت پذیر ہو گئے، یہیں انھوں نے ایک مثنوی ''خلاصۂ حدیث'' کے نام سے اردو میں لکھی تھی، اس میں ہے۔

خلاصہ حدیث اس کا رکھا ہے نام — سبھی سال ہجری ہیں اس میں تمام
1248

مثنوی کے اس نام سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا سال تصنیف 1248ھ (33-1832) ہے، اس مثنوی میں ایک جگہ مصنف کا نام اس طرح آیا ہے ع

جو ہے ذوالفقار علی اس کا نام

اتنا ہی نہیں بلکہ مصنف نے ایک موقع پر اس مثنوی میں خود اپنا تعارف بھی اس طرح کرایا ہے۔

نبیرہ ابوالقاسم رضویم نواسہ ابو الفضل وفیضی منم

کہ تھے سب یہ ارکان دولت قدیم کوئی پنج ہزاری کوئی تھا ندیم

ان شعروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کی زبان فارسی اور اردو کا آمیختہ ہے۔ یہ صورت کیوں پیدا ہوگئی ہے فی الوقت اس بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے، شاید اردو پر شاعر کو پوری طرح قدرت نہ رہی ہو، واللہ اعلم۔

مثنوی کا سبب تالیف بھی مصنف نے فارسی نثر میں ہی لکھا ہے، اس میں مذکور ہے کہ:

"1225ھ میں سنّی مولویوں نے تعزیہ داری کا امتناع کیا لیکن میں اور دو اور شخص تعزیہ داری کرتے تھے، 1248ھ میں سلیمان شکوہ آگرہ پہنچے تو دونوں نے مرزا مہدی بہادر (مرشدزادۂ شاں) سے کہا کہ اس کی تردید اردو میں ضروری ہے، یہ نسخہ صاحب عالم، کی نظر سے گذرا اور میں عواطف شاہی سے سرفراز ہوا"۔

یعنی جو مسئلہ تین برس پہلے پیدا ہوا تھا، یہ مثنوی شاہزادہ سلیمان شکوہ کی آمد کے بعد اسی سے متعلق لکھی گئی تھی اور مرزا مہدی کی وساطت سے ان کی خدمت میں پہنچائی گئی۔

اسی مثنوی کے مخطوطے کے ایک ورق پر یہ مصرع تحریر ہے

ع سلخ شہر شوال کی ہے پدید

پھر یہ عنوان قائم کیا گیا ہے:

"سوال عبدالعزیز"

اور اس کے تحت ایک بحث لکھی ہے جس کا آغاز اس شعر سے کیا ہے۔

اسی ذکر میں مجھ سے عبد العزیز مباحث تھا دہلی میں وہ بے تمیز

مخطوطہ پچاسی اوراق پر محیط ہے۔ ہر صفحہ پر بارہ سطریں ہیں، ترقیمہ کے اندراج یہ ہیں:

"کاتب سید مظہر علی، 13 ربیع الثانی 1244 فصلی، بپاس خاطر بابو نندلال"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر آباد کے بھی بعض صاحب علم ہندوؤں کا میلان بھی شیعیت کی طرف تھا۔ شاید اسے مرزا مہدی بہادر کا اثر خیال کیا جا سکتا ہے۔

3-نجیب اللہ

گوالیار کے رہنے والے مذہبی بزرگوں میں نجیب اللہ شاہ گوالیاری بھی تھے، یہ اپنے وقت کے باکمالوں میں سے تھے، 1246ھ (1830-31) میں انھوں نے اپنا کلیات مرتب کرلیا تھا[3]۔ اس کلیات کا جو نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے اس کی ضخامت دو سو اٹھاسی اوراق کی ہے اور ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں۔ ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

ترا شکر ہے میرے پروردگار ترى ذات عالی پہ سب کچھ نثار

اور خاتمہ ایک قطعہ تاریخ پر ہوا ہے جس کے آخری دو شعر ہیں۔

جب کہ تاریخ کا خیال ہوا اس کا لکھنا مجھے وبال ہوا

اس میں ہاتف نے غیب سے آکر کہا لکھ آہ آہ داغ جگر

1240

نجیب اللہ شاہ نے صنف مثنوی سے بھی دلچسپی لی تھی چنانچہ ان کی ایک مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' کا بھی قلمی نسخہ آزاد لائبریری میں موجود ہے۔[4] یہ مثنوی چونسٹھ اوراق پر محیط ہے اور اس کے ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں۔

سید نجیب اللہ شاہ گوالیاری کی مثنوی لیلیٰ مجنوں ان کے کلیات کے شروع میں بھی مندرج ہے چنانچہ اس کا پہلا شعر اوپر لکھا جا چکا ہے مثنوی کا اختتام اس شعر پر ہوا ہے۔

کہاں اب یہ مغموم جیتا رہے جو وہ خاک میں پڑ کے یوں سو رہے

یہ مثنوی صوفیانہ طرز کی ہے اور زبان اس کی قدامت کے باوجود صاف سلیس اور رواں ہے۔ اس سے شاعر کی خوبی فکر اور خوش بیانی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

(و) تاریخ و معمہ

دہلی میں اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں تاریخ گوئی کے ساتھ ساتھ معمہ گوئی کا بھی چلن ہو گیا تھا۔ اس صورت حال کے اثرات آگرے میں پہنچے اور وہاں کے بھی بعض شاعروں نے ان دونوں سے دلچسپی لینی شروع کر دی تھی بلکہ کسی کسی نے تو اپنے حلقے میں نام پیدا کر لیا تھا۔

1- اعظم

"اعظم تخلص، منشی میر اعظم علی نام کہ سابق میر منشی مدرسہ جد دہلی تھے۔ وطن شریف فخر دہلی مقام ہے۔ اکثر نظر عنایت نیاز مند پر مبذول فرماتے ہیں۔ مورخی و علم معما بھی میں کمال دخل ہے"۔[1]

باطن نے ان کا کوئی معمہ یا قطعہ تاریخ نقل نہیں کیا ہے، البتہ اعظم نے ان کے تذکرے کی تالیف کے لیے تین قطعے لکھے تھے، ان کے آخری شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

(ا) وقت شب ناگاہ پیر عقل گفت از راہ کید　　نام و سالش بے تکلف گلستان بے خزاں

1265=1231　　+34

اس میں چونکہ کتاب کا نام بھی آ گیا ہے تعمیہ کے باوجود یہ اچھی تاریخ ہے۔

(2) سال تالیف گفت ملہم غیب نغمۂ جاں نواز ایامش
1265

اس میں مادۂ تاریخ "نغمۂ جاں نواز ایام" ہے۔ اس میں تعمیہ تخرجہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن مصرع میں چونکہ "ایامش" نظم ہوا ہے۔ حرف شین منقوطہ کا حذف پسندیدہ نہیں ہے۔

(3) چپ سے کہا یہ کان میں میرے سروش نے کیا ہی شگوفہ آج کھلا ہے بہشت کا
1265= 1260 + 5

اس میں "چپ" کے تعمیہ کے ساتھ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ یہ تعمیہ نہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔

2-اسیر:

نظیر اکبرآبادی کے فرزند میر گلزار علی اسیر اپنے وقت کے استادوں میں تھے۔ ان کے بعض شاگردوں نے تاریخ گوئی کے لیے نام پایا تھا۔ ان میں میاں غلام محمد رہا اور باطن زیادہ نمایاں ہیں۔ خود اسیر نے اپنے والد کی وفات کی بہت اچھی تاریخ کہی تھی۔ اس طرح۔

چہ خوش در رحلتش آورد فکر طبع تاریخے نظیر اکبرآبادی چوں زیں دنیائے اہتر شد
نظام نظم باہم درہم و برہم شدہ یکسر مخمس بے سروپا، بیت بیدل، فرد بے سر شد
1246=204 + 402 + 640

تاریخ کا مصرع اچھا ہے۔ اس سے ان اصناف کا بھی پتہ چلتا ہے جن میں نظیر نے امتیاز پیدا کیا تھا۔ لیکن رحلتش کے ساتھ لفظ خوش کا لانا اچھا نہیں ہے۔

3-باطن:

میر قطب الدین باطن میر اسیر کے شاگرد رشید اور تاریخ گوئی میں خوش فکر تھے۔ اپنے استاد کی اتباع میں انھوں نے بھی نظیر کی رحلت کی بہت عمدہ تاریخ کہی ہے۔

ہزار حیف ز باطن گذشت استادم کہ بے نظیر جہاں و نظیر علم آموز
دوازدہ چہل و شش بود چوں سن ہجری گذاشت نظم جہاں جہاں الم آموز
1246
سن وصال طبیعت بہ انتظام آورد سر غزل و رباعی و مطلع و دل سوز
1246=6+40+200+1000

حکیم میر باطن نے خود اپنے تذکرے کے واسطے چار قطعات تاریخ لکھے تھے2، یہاں ان کے صرف آخری شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

(1) از سر ہوش غور کر کے کہا نغمہ ہے بلبلان جادو کا

5 + 1260=1265ھ

اس میں یہ اچھا اور بامعنی تعمیہ ہے اور مصرع تاریخ برجستہ بھی ہے۔

(2) یقیں کے سر سے ہاتف نے کہا بس جواب گلشن بے خار ہے یہ

10 + 1255=1265ھ

تعمیہ کے باوجود یہ مصرع تاریخ بہت بے ساختہ اور بامعنی ہے۔ واقعی بہت اچھی تاریخ ہے۔

(3) ابھی ہو گلشن تاریخ بار دیگر لگایئے جو گلستان بے خزاں میں دل

1231 + 34=1265

شاعر نے بڑی خوبی سے تذکرے کے نام کو نظم کر دیا ہے اور نہایت برمحل تعمیہ سے سال تصنیف کے اعداد بھی حاصل کر لیے ہیں۔ اس سے شاعر کی تیزی طبع اور خوش فکری کا ثبوت ملتا ہے۔

(4) گر کیجیے پائے سرو سہ جعفری قلم دا ہووے آج باب گلستان بے خزاں

(3+6) - 1274=1265ھ

اس میں اگرچہ تخرجہ دو حرفوں کا ہے اچھا ہے۔

باطن نے اپنے اس تذکرے کی تاریخ آغاز بھی خوب کہی ہے۔

سال آغاز اس مرقع کا ہے گلستان بے خزاں یہ دیکھ

1262ھ

خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ تخرجہ ہے نہ تعمیہ مصرع تاریخ بے ساختہ ہے اور اس میں تذکرہ کا نام بھی آ گیا ہے۔

باطن نے اسی پر اکتفا نہیں کی، انھوں نے اپنے اس تذکرے کا ایک تاریخی نام بھی مقرر کیا تھا جو اس طرح ہے۔

نام تاریخی اس شگوفہ کا نغمہ عندلیب کہہ اے یار

1261ھ

اس نام سے اس تذکرے کا سال آغاز معلوم ہوتا ہے۔

ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ باطن کو نہ صرف شعر گوئی کا شوق تھا بلکہ وہ اچھی تاریخیں کہہ لینے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔

4-رہا:

باطن نے اپنے تذکرے میں ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"رہا تخلص، غلام محمد خاں نام، کہیں برادر عنایت حسین خاں مشیر، متوطن فخر دہلی، شاگرد خلیفہ میر گلزار علی صاحب اسیر"۔1

اگرچہ باطن نے ذکر نہیں کیا یہ اپنے زمانے میں تاریخ گوئی کے لیے معروف تھے۔ انھوں نے خود باطن کے تذکرے کی بہت بامعنی اور برجستہ تاریخ کہی تھی۔

بے شبہ جواب گل بے خار لکھا ہے

1265ھ

"گل بے خار عبارت از گلشن بے خار ہے"۔ اگر یہ کمی نہ ہوتی تو تاریخ لاجواب تھی۔

الہ آباد کے شاعر اعظم شاگرد آتش کے دیوان کی بھی انھوں نے تاریخ کہی تھی جو اس طرح درج ہے:

"قطعہ تاریخ طبع زاد غلام محمد خاں صاحب رہا شاگرد گلزار علی اسیر خلف الصدق نظیر"۔

جب چھپا دیوان اعظم اے رہا — کھل گیا باب کلام دل پذیر
سب نے خوش ہو کر پے تاریخ طبع — یوں کہا دیواں چھپا کیا ہے بے نظیر

1285ھ

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غلام محمد خاں رہا کافی مدت بعد تک بھی اپنی تاریخ گوئی کے لیے معروف رہے اور دور و نزدیک کے شعراء بھی اس باب میں ان سے رجوع کرتے رہے تھے۔

یہ محض چند شاعروں کا مذکور ہوا۔ کچھ شک نہیں کہ اس شہر آگرے میں اور بھی کئی شاعر تھے جو تاریخیں کہہ لیتے تھے۔ کہا جانا چاہیے کہ اس فن کو آگرے میں بھی خاصا فروغ حاصل ہوا تھا۔

(ز) ضلع جگت وغیرہ

''لفظ جگت'' تدبر ہوشمندی اور دانائی کے معنی میں آتا ہے۔ ہندی میں جوگتا بمعنی لیاقت اسی سے مشتق ہے۔ اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ بات ہوشیاری کے ساتھ اس طرح کہی جائے کہ دانشمند مخاطب غور وفکر کے بعد اصل مطلب تک پہنچ سکے۔ بیان میں معمولاً اس کے لیے تک بندی اور قافیہ پیمائی کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ صنعت تجنیس کو کام لاتے ہیں اور الفاظ ذو معنیین کا استعمال کرتے ہیں۔ مقصود اس صنعت سے ظرافت اور بذلہ سنجی ہوتا ہے اسی لیے لطیفہ گو کو جگت باز اور لطیفہ گوئی کو جگت بازی کہتے ہیں۔ اہل لکھنؤ جگت لڑانا بھی بولتے ہیں۔

''ضلع'' عربی لفظ ہے۔ یہ پسلی اور زاویہ کے معنی میں آتا ہے۔ اس سے بھی مراد یہ ہوتی ہے کہ بات کو سیدھے طور پر کہنے کے بجائے کسی ایسے زاویے سے کہا جائے کہ سننے والا غور اور تامل کے بعد جب اصل مفہوم تک پہنچے تو اسے لطف حاصل ہو اور قائل کی ذہانت اور خوش گفتاری کے لیے کلمات تحسین زبان سے نکل جائیں، اس کے لیے عموماً رعایتِ لفظی سے کام لیتے ہیں، اور جو بنیادی لفظ ہوتا ہے اس کے تلازمے جمع کر دیے جاتے ہیں۔ محاورہ میں ضلع باز اس شخص کو کہتے ہیں جو رعایت لفظی کے ساتھ بولنے میں مشاق ہو۔

مذکورہ تفصیلات سے قطع نظر، عام طور سے ضلع اور جگت کو مرادف خیال کر لیا گیا ہے اور ان

دونوں کلمات کو ایک ساتھ لاتے ہیں۔

''پھبتی'' کا مصدر پھبنا ہے یعنی بھلا لگنا، موزوں اور مناسب ہونا وغیرہ، اصطلاحاً پھبتی سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص یا چیز یا کیفیت کے لیے کوئی ایسی بات کہی جائے جو اس پر پھبے اور اس کے ساتھ کسی مخصوص نقطۂ نظر سے پوری طرح مناسبت رکھتی ہو، معمولاً اس میں ظرافت اور طنز کے مفہوم کو بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے، چنانچہ پھبتی کسنا محاورہ بہ معنی ہنسی اڑانا، استہزاء کرنا وغیرہ۔

ان صنعتوں کا رواج خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ میں رہا ہے، نواب مرزا شوق نے اپنی مثنوی میں کہا ہے۔

چوٹی لپٹی تھی باسی ہاروں سے　　لڑ رہی تھی جگت کہاروں سے

بعد کے زمانے میں مجلسوں میں بھی بعض ذاکروں نے ان صنعتوں سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا، آغا اشہر لکھنوی نے مولوی مقبول احمد دہلوی کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

''مرحوم نے ضلع جگت، اشارہ کنایہ، القاب کی تراش خراش اور چست فقروں سے عوام کو ایسا رجھایا کہ لکھنؤ کا شیعی طبقہ ان کا دم بھرنے لگا''۔1

آگرے میں بھی غالباً اہل لکھنؤ کے اثر سے ان صنعتوں کو رواج حاصل ہو گیا۔ میر قطب الدین باطن نے ہدایت شاعر کے حال میں خصوصیت سے اس کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے:

''ہدایت'' تخلص، شیخ ہدایت علی نام، ساکن جد دہلی، مرد ظریف حریف چالاک، والدان کے شیخ اکبر علی فن لطیفہ وجگت ذو معنی و در دغ گوئی میں یکتائے زمانہ و بے باک، 1250ھ (1834) میں کسی صدمۂ عظیم کے باعث جلا دا جل نے انھیں کے ہاتھ سے گلا کٹوانے کی مصلحت دی''۔2

افسوس ہے کہ قطب الدین باطن نے ان کے لطیفہ، جگت وغیرہ کی کوئی مثال نقل نہیں کی ہے۔

(ح) نثر

(خطوط و تراجم)

1- شوق

حسین بخش بخشی تخلص کا حال شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ شیخ الٰہی بخش شوق تخلص ان کے بیٹے تھے۔ شعر گوئی کا شوق ان کو اپنے والد سے ملا تھا لیکن ان کی طبیعت کی جولانی اسی حد تک محدود نہیں رہی۔ انھوں نے اردو نثر نویسی بھی اختیار کی اور نثر میں مختلف قسم کی چیزیں لکھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نثر ہی کو اپنے لیے باعث فخر و مباہات سمجھا تھا۔ میر محمد خاں سرور نے اپنے تذکرے میں ان کے اردو خطوں کی تعریف کی ہے اور ان کا حال انھوں نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

> ''شوق تخلص، شیخ الٰہی بخش متوطن مستقر الخلافہ اکبر آباد، بالفعل در فرخ آباد بہ سرکار صاحب عالم مرزا مظفر بخت بہادر خلف الرشید شہزادہ میر مرزا جواں بخت مرحوم، در جرگہ منشیاں سرفراز، شخص خلیق و شاعر شیریں کلام است، در انشا پردازی نیز مہارت دارد، چنانچہ کتاب قوانین السلطنت در نثر کہ تصنیف اوست روز ملازمت بہ حضور والا پیشکش نمودہ، ماورائے ایں انشا و مکاتیب خوب در زبان اردو از ذہن صافیش سرانجام

پذیرفتہ وہم دو دیوان فارسی در ریختہ مملو از قسام شعر مرتب ساختہ حسب اتفاق وارد دار الخلافہ گشتہ"۔1

اس اقتباس میں "مکاتیب خوب در زبان اردو" کی بات قابل توجہ ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کا مولد بھی آگرہ تھا اور وہ منشی حسین بخش کے بیٹے منشی نبی بخش حقیر تخلص کو باوجود یکہ عمر میں وہ بقول غالب ان سے چھوٹے تھے عموماً "بھائی صاحب" کہتے تھے۔ بخوبی ممکن ہے کہ ان کے توسط سے شوق کے خطوط بھی ان کی نظر سے گذرے ہوں اور انھیں نے مرزا کو اردو میں خطوط نویسی کی راہ دکھائی ہو۔

شوق کو اپنی نثری تحریروں کے لیے شہرت حاصل تھی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی ان کے ذکر میں ان تحریروں کا حوالہ دیا ہے اور انھوں نے شوق کے حالات میں بھی مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں:

"شوق تخلص، شیخ الٰہی بخش اکبر آبادی، کاتب تقدیر منصب نامہ نگاری مرزا مظفر بخت بہادر خلف مرزا جواں بخت بہ بخت دے نوشتہ، گویند دیوان ریختہ وفارسی فراہم آوردہ، کتابے تصنیف کردہ است مسمی بہ قوانین السلطنت، ہنگامیکہ بہ کشمکش شوق بہ تخت گاہ جہاں آبادی رسد بہ رسم رہ آوردہ پیشکش شاہی کند، وفاتش در 1241ھ اتفاق کردہ"۔2

حکیم قطب الدین باطن نے جو الٰہی بخش شوق کے ہم وطن ہونے کے سبب ان کے بارے میں براہ راست واقفیت رکھتے تھے اردو نثر میں شوق کی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے:

"نثر مثنوی نل ودمن بہ زبان ریختہ، انشا قوانین سلطنت بہ ہمیں زبان آوردہ"۔3

شوق کی ان دونوں نثری کتابوں کے اصل ماخذ وغیرہ کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی ہے، قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ دوسری کتاب مغلوں کی سلطنت کے ضابطوں سے متعلق رہی ہوگی اور اسی لیے وہ شاہزادہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی، پہلی کتاب میں فارسی کی کسی روایت سے نل ودمن کی داستان اردو میں منتقل کی گئی ہوگی۔

الٰہی بخش شوق کی نثری تحریروں کا تواتر کے ساتھ تذکرہ نویس ذکر کرتے آئے ہیں، باوجود اس کے ان کی تحریریں ابتدا ہی زمانہ سے نایاب ہو گئی ہیں اور اب ان میں کسی کا بھی سراغ

نہیں ملتا۔

2-سدا سکھ لال

آگرہ پر انگریزوں کو تسلط حاصل ہو چکا تھا۔ وہاں مختلف قسم کے کاروباران کے مفید مطلب جاری ہو گئے، سدا سکھ لال نامی ایک صاحب قلم نے کم وبیش اسی زمانے میں سرکار انگریزی کے تمام قوانین واحکامات کو چار جلدوں میں جمع کرنے کا منصوبہ بنایا، انھوں نے اپنی مجوزہ کتاب کا نام ''مجموعۂ قوانین'' رکھا، اس کتاب کے دیباچے میں سدا سکھ لال نے بتایا ہے کہ:

> ''مجموعہ قوانین کی جلد اول 1793 سے 1834 تک مرتب ہو کر 1864 میں مطبوع ہوئی، اب جلد ثانی متضمن ایکٹ ہائے غیر منسوخہ کی من ابتدائے 1834 لغایت 1857 مع جلد ثالث من ابتدائے 1858 لغایت 1860 اور جلد رابع من ابتدائے 1861 لغایت 1863 متضمن جملہ ایکٹ ہائے غیر منسوخہ مروجہ ممالک مغربی وشمالی چاپ کر شائع کی جاتی ہے۔ ان جلدوں میں بعض ایکٹ متعلقہ بنگالہ اور سپریم کورٹ گو کہ وہ متعلق ممالک مذکور نہیں ہیں مگر بایں نظر کہ ترجمہ ان کا کسی خاص وجہ سے اردو گورنمنٹ گزٹ ممالک مغربی وشمالی میں چھپا تھا داخل کیے گئے ہیں، فائدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو، فی الواقع یہ جلدیں آئینہ نمائے انتظام جملہ سر رشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں۔۔۔اور جو قوانین پریسیڈنسی یا سپریم کورٹ یا خاص بنگالہ ہیں ان کی تاریخ صدور کے بعد صرف حوالہ نام پریسیڈنسی کا یا سپریم کورٹ یا خاص بنگالے کا لکھ دیا ہے، ایکٹ نمبر (۱) 1834 ولایت ہند نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور سے کونسل کے اجلاس میں 20 نومبر 1834 میں صادر ہوا''۔

اس مجموعہ کی پہلی جلد جیسا کہ مذکور ہوا 1864 میں چھپ کر شائع ہوئی تھی لیکن اس میں جو ایکٹ شامل ہیں وہ گورنمنٹ گزٹ میں سال بہ سال چھپتے رہے تھے اس لیے ان کا یہاں پر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوا۔ یہ چاروں جلدیں مطبع نور للا بصار آگرے میں 1866 میں چھپ کر شائع ہو چکی تھی۔

(ط) مطبعے اور اخبار

آگرے میں مہاراجا بنارس اور شاہزادہ سلیمان شکوہ نے اقامت اختیار کی تھی۔ یہ دونوں انگریزوں کی صنعتوں وغیرہ کو دیکھے ہوئے تھے۔ آگرے اور کانپور کے درمیان بھی آمد و رفت کے سلسلے جاری تھے۔ نتیجہ کے طور پر بتدریج یہ بھی ایک صنعتی شہر کے طور پر ترقی کرنے لگا تھا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے یہاں کے ایک مطبع کا ذکر ضمناً اس طرح کیا ہے:

"کانپور اور میرٹھ کے بعد تیسرا چھاپہ خانہ آگرے میں کھولا گیا۔ اس کے مالک مسٹر ہنڈرسن تھے"۔

محمد عتیق صدیقی مرحوم نے اس مطبع کے بارے میں اطلاع فراہم کی ہے کہ:

"نیشنل آرکائیوز میں آگرہ اخبار کے سلسلے میں بعض سرکاری یادداشتیں اور ڈاکٹر ہنڈسن کے چند خطوط محفوظ ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آگرہ اخبار پریس جنوری 1831 میں قائم ہو چکا تھا"۔

اس پریس سے ہنڈرسن نے آگرہ اخبار کے نام سے دیسی زبان کا اخبار فارسی رسم خط میں جاری کیا تھا جو چل نہ سکا اس لیے نومبر 1832 (48-1247ھ) سے وہ اسے انگریزی میں نکالنے لگے۔

منشی واجد علی خان نے جو کسی وقت آگرہ اخبار سے بھی متعلق تھے اس کے بعد جلدی ہی اپنا پریس "مطبع زبدۃ الاخبار" کے نام سے قائم کر کے ایک ہفتہ وار اخبار اسی نام سے نکالنا شروع کر دیا۔ منشی صاحب فارسی کے معروف عالم تھے اور انھوں نے اپنے پریس سے بعد کے زمانے میں بعض کتابیں بھی شائع کی تھیں۔

حواشی

1-گلشن بے خار	ص231
2-سراپا سخن	ص249.138
3-گلستان بے خزان	ص257 و مابعد
4-طبقات شعرائے ہند	ص393
5-گلستان بے خزان	ص152
6-گلشن بے خار	ص129
7-گلستان بے خزاں	ص42
8-سراپا سخن	ص32
9-گلستان بے خزاں	ص36
10-گلشن ہمیشہ بہار	ص90
11-گلشن بے خار	ص132
12-خوش معرکہ زیبا ج2	ص598
13-گلستان بے خزاں	ص157
14-گلستان سخن ج1	ص351
15-گلستان بے خزان	ص91
16-خم خانہ جاوید ج3	ص298

17-اردو مخطوطات آصفیہ ج1 ص41

18-سراپا سخن ص139

19-گلستان بے خزان ص92

20-ایضاً ص26

21-سراپا سخن ص35

22-گلستان سخن ج1 ص269

23-گلستان بے خزان ص26

24-سراپا سخن ص319

25-تذکرۂ نادر ص36

26-گلستان بے خزاں ص6

27-سراپا سخن ص320

28-گلستان بے خزان ص65

29-گلستان سخن ج1 ص383

30-سخن شعرا ص117

31-خم خانۂ جاوید ج2 ص296

32-گلشن بے خار ص143

33-گلستان بے خزاں ص175

34-ریاض الفصحاء ص276

35-گلستان بے خزاں ص211

36-سخنانۂ جاوید ج4 ص252

37-گلستان سخن ج2 ص20

38-گلستان بے خزاں ص108
39-مخزنہ جاوید ج4 ص251
40-تذکرۂ ہندی ص25
41-گلستان بے خزاں ص63
42-ایضاً ص76
43-ریاض الفصحاء ص310
44-ایضاً ص255
45-گلستان بے خزاں ص214
46-سراپا سخن ص107
47-گلستان بے خزاں ص39
48-خوش معرکۂ زیبا ج2 ص623
49-گلستان بے خزاں ص238
50-ریاض الفصحاء ص173
51-گلشن بے خار ص126
52-ایضاً ص144
53-گلستان بے خزاں ص175
54-گلشن بے خار ص195
55-گلستان بے خزاں ص236
56-ایضاً ص202
57-گلشن بے خار ص170
58-گلستان بے خزاں ص208

ہزل وریختی

1-خندۂ گل ص426

2-خندۂ گل ص226

خمسے وغیرہ

1-گلستان بے خزاں ص260

2-سخن شعراء ص530

3-اردو مخطوطات علی گڑھ ص231

4-گلستان بے خزاں ص261

5-اردو شعراء کے تذکرے ص354

مثنوی

1-شمالی ہند میں اردو مثنوی ص325

2-فہرست نمائش پٹنہ

3-اردو مخطوطات علی گڑھ ص377

4-ایضاً ص251

تاریخ ومعمہ

1-گلستان بے خزاں ص21

2-ایضاً ص289ومابعد

3-دیوان اعظم ص

ضلع جگت وغیرہ

1-تذکرۃ الذاکرین ص44ومابعد

2-گلستان بے خزاں ص285

نثر

1-تذکرہ سرور	ص385
2-گلشن بے خار	ص111
3-گلستان بے خزاں	ص124
4-مسودہ منشورات	ص105

4-راجستھان

(الف) اجمیر	367
1-ممنون، میر نظام الدین	368
2-امانت میر امانت علی	370
3-یوسف علی علوی	371
(ب) الور	373
1-بلند صفدر علی بیگ	374
2-جعفر شریف	374
(ج) بھرت پور	375
1-رہا غلام محمد خاں	375
2-مشیر عنایت حسین	376
3-عاشق شیخ نبی بخش	377
4-وحید وحید الدین	377
5-فطرت حکیم ایلیس	378
(د) ٹونک	381
1-شادان بساون لال	382
2-نامعلوم	383
3-سید محمد علی	383
4-مرشد سید غلام مرشد	384

5-فیاض محمد فیاض خان	384
6-قادری سید غلام جیلانی	386
(ہ) جودھپور	389
رنگیلے رمضان علی	389
(و) جے پور	391
الف۔شاعری	391
1-صفدر میر صفدر علی	391
2-گل مرزا اکبر علی خان	392
ب۔نثر	395
1-قصہ رنگین گفتار	395
2-قاطع الشرک	396
حواشی	398

بارہویں صدی ہجری کے عشرۂ ہفتم (اٹھارہویں صدی کے وسط) میں راجستھان کے علاقے میں زبان اردو میں ایک ضخیم منظوم تصنیف ''تاریخ غربی'' کے نام سے ضرور وجود میں آ گئی تھی، لیکن اس کے بعد تصنیف وتالیف کے اعتبار سے کوئی نصف صدی سے زائد مدت تک بظاہر خاموشی رہی تھی، یہ زمانہ سیاسی ابتلا اور انتشار کا تھا۔ اس لیے اس دوران اگر کچھ تصنیفی اور تخلیقی کام ہوئے بھی ہوں گے تو ان کے تحفظ کی صورت غالباً نہ ہو سکی ہوگی۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ملک کے حالات ایک رخ پر آ گئے تھے اور افراتفری کی وہ صورت تقریباً نہیں رہ گئی تھی اس لیے اردو زبان میں نثر و نظم کے لکھے جانے کا سلسلہ گویا پھر سے شروع ہوا تھا، راجستھان کی بعض ریاستوں اور بعد میں نمایاں ہونے والے مراکز پر اس ابتدائی زمانے کی تخلیقات محفوظ نہیں رہ سکیں، کم اہل قلم ایسے ہوئے جن کا نام اور کلام زمانے کے نشیب و فراز کو جھیل کر باقی رہ سکا۔

(الف) اجمیر

یہ شہر زمانۂ قدیم سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی عقیدت کا مرکز رہا ہے۔ طمانیت قلب اور ذہنی سکون کے متلاشی دور دراز سے یہاں آ کر ایک مدت تک قیام کرتے اور نتیجہ کے طور پر اپنے علاقے کے علم و فن کو بھی اجمیر کی آبادی میں پھیلاتے رہے۔

حضرت خواجۂ بزرگ اجمیری کے حالات میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ زبان ہندی (قدیم اردو) کے کلام کے بھی گائے جانے کی اجازت دے دی تھی چنانچہ آج تک

عرس کے موقع پر ''اِستُتی'' (کلام حمد ومنقبت) کے گائے جانے کی روایت برقرار ہے۔ خواجۂ بزرگ کا یہ فیصلہ بڑی انقلابی اہمیت کا حامل تھا اور اس اعتبار سے بلا شبہ وہ ہندوستانی مسلمانوں اور زبان اردو کے محسنوں میں تھے۔

اکبر شاہ ثانی کے دور میں اجمیر اور اس کے مضافات میں اردو نثر ونظم میں بعض ایسے کام ہوئے جو کسی نہ کسی طور پر تا حال محفوظ رہ گئے ہیں لیکن انھیں کُل نہیں سمجھنا چاہیے، بہت علمی سرمایہ ہوگا جو دست بروزمانہ سے ضائع ہوگیا۔ امکان ہے کہ تلاش وتحقیق سے اس میں سے کچھ دستیاب ہوجائے۔

1-ممنون:

دہلی کے ممتاز شاعروں میں سے تھے۔ آخر عمر میں اجمیر میں آکر ایک مدت تک مقیم رہے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے لکھا ہے کہ:

> ''ممنون، نظام الدین نام، مہین پور قمر الدین منت است، اصلش از قصبہ سونی پت بمن توابع دار الخلافہ شاہجہاں آباد ومولد ومنشایش ہمیں شہر فجستہ بنیاد، کسب فنون از خدمت والد بزرگوار خود کردہ، مدتے بہ لکھنؤ بسر بردۂ زمان دراز بہ زمرۂ شعرائے پایۂ تخت حضور والا سرفراز ماندہ، از پیشگاہ خلافت فخر الشعراء لقب یافتہ، اکنوں از چندگاہ بہ کوہستان اجمیری می گزارند، طرز گفتارش خیلے دلپسند ودلنشیں است..... قوت نظم اکثر اصناف سخن دارد، دیوانش بہ نظر رسیدہ''۔1

شیخ امام بخش صہبائی نے جو ممنون کے معاصر خرد تھے، اجمیر میں ان کے قیام کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ''پیش گاہ خلافت سے فخر الشعراء خطاب عطا ہوا، من بعد ضلع اجمیر میں پیشگاہ کمپنی بہادر سے عہدۂ صدر الصدوری پر مختار رہا، مگر آج کل بہ باعث ضعف اعضاء اور بینائی کے خانہ نشیں یعنی شاہجہاں آباد میں وارد ہے''۔2

معلوم ہوتا ہے کہ ممنون کوٹ قاسم میں بھی جو اَب راجستھان کے ضلع سیکر میں شامل ہے، رہے تھے۔ اس کا ذکر علی حسن خاں سلیم نے کیا ہے:

''مدتے فوجداری کوٹ قاسم دور عہدِ جنرل اختر لونی عہدۂ تحصیلداری را سرانجام نمود،
دتازمان تالیف آفتاب عالم تاب بہ عمر شصت وپنج سالگی در قید حیات بود''۔3

ظاہرا قرینہ یہ ہے کہ نظام الدین ممنون پہلے کوٹ قاسم میں، پھر اجمیر میں رہے تھے، واللہ اعلم۔

میر ممنون کے حالات میں دو باتوں پر تعجب ہے۔ اول یہ کہ ان کے موجودہ دیوان میں اجمیر اور کوٹ قاسم سے متعلق کوئی قطعہ یا مثنوی وغیرہ شامل نہیں ہے۔ دوم یہ کہ اردو کے شاعروں کے متداول تذکروں میں ان مقاموں کے رہنے والے ممنون کے کسی بھی شاگرد کا ذکر نہیں ہے۔ یہ خیال کہ ان کا منصب شاگرد بنانے میں مانع ہوا تھا محض بے اصل ہے۔ اس زمانے میں شاہزادہ بلکہ خود بادشاہ بھی نوآموزوں کو اصلاح دیتا تھا اور شاگرد فخریہ اس نسبت تلمذ کا ذکر کرتا تھا۔

ممنون نے 1260ھ (1844) میں وفات پائی تھی۔ یہاں نمونہ کے طور پر ان کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

فرنگی زادۂ بیدرد تجھ بن دل پہ مستوں کے — کرے ہے کام موج بادہ تیغ پُرتگالی کا
تجھے، نقش مستی مٹایا، تو دیکھا — جو پردہ تھا حائل اٹھایا تو دیکھا
کوئی ہمدرد نہ ہمدم نہ یگانا اپنا — رو برو کس کے کہیں ہم یہ فسانہ اپنا
نہیں معلوم وعدہ کر گیا کون — کہ ہم آئیں گے ممنون تیرے گھر آج

پہلے شعر سے اہل دہلی بلکہ اہل راجستھان کے دلوں میں فرنگیوں کے خلاف جو جذبات مشتعل تھے ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وہ زمانہ تھا جب آمد و رفت اور رسل و رسائل میں بڑی دشواریاں تھیں۔ ممکن ہے انھیں وجوہ سے راجستھان کے مقامی اہل قلم کی نظم و نثر کا مذکور دہلی اور لکھنؤ وغیرہ مراکز تک نہ پہنچ سکا ہو اور ان کے ذکر سے متداول تذکرے خالی رہ گئے۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اہل راجستھان کے تحریری کارنامے (بصورت مخطوطات) اور ان کے تذکرے بھی تقریباً نایاب ہو گئے ہیں۔ انھیں کی مدد سے اب حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

2-امانت:

یہ راجستھان میں ناگور کے علاقے کے رہنے والے تھے جسے سلطنت کے زمانے میں سرکار کا درجہ حاصل رہا ہے۔ امانت کو شہرت نہیں مل سکی تھی چنانچہ ان کے معاصر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ مرزا قادر بخش صابر نے البتہ ان کے بارے میں لکھا ہے:

"امانت تخلص، میر امانت علی خلف میر کرامت علی ناگوری، اوائل میں سواران رسالہ سکندر صاحب میں منسلک تھا، جب اس انگریز نے وفات پائی، وہ بھی ترک روزگار کر کے خانہ نشیں ہوا، بعد چند روز کے کسی اور انگریز کی رفاقت میں اجمیر کی طرف راہی ہوا، اور پھر کسی تقریب سے راجا جے پور کی سرکار میں روزگار معقول کے حصول میں کامیاب ہوا، اور وہیں نقد زندگانی کو بمصلان قضا و قدر کے سپرد کیا"۔4

عبدالغفور خاں نساخ اور احترام الدین گ شاغل نے بھی ان کے حالات میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے، قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ امانت کے والد میر کرامت علی ناگوری بھی سپاہی پیشہ رہے ہوں گے۔

امانت کی زبان اور بیان کے انداز میں قدامت کا رنگ بہت نمایاں ہے، ایسا غالباً اس وجہ سے ہے کہ ان کو اپنے علاقے سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ میر امانت کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

دیکھا نہ حور کو بھی امانت نے آنکھ اٹھا — مارا ہوا تھا کس کے خدنگ نگاہ کا
ہم مرتے ہیں تشنگی سے ساقی کب سے — ظالم لب جام کو بھروا دے لب سے
بہار بھی نہیں آئی کہ جوش وحشت سے — ہمارے پاؤں کو ہے ربط خار صحرا سے
اللہ رے رسائی دست جنوں کہ اب — دامن کی راہ لی ہے گریباں کے چاک نے

میر امانت کو تلاشِ مضامین ہی نہیں، مضمون آفرینی کا بھی شوق معلوم ہوتا ہے اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اچھے شاعر تھے۔

عقیدت اہل علم و دانش کو قریب اور دور سے کھینچ کھینچ کر لے جاتی تھی اور اکثر ایسی صورتیں بھی ظہور میں آتی تھیں جن پر اہل مذہب کے ایک طبقہ کو معترض ہونے کا موقع ملتا تھا، یہ صورت حال ایک مستقل مسئلہ کی شکل اختیار کر گئی ہے اور اس موضوع سے متعلق دونوں طرف سے چھوٹے

بڑے رسالے اردو نثر میں بھی لکھے گئے ہیں۔

3-یوسف علی:

یہ یوسف علی لکھنؤ کے رہنے والے علمائے مذہب میں تھے، انھوں نے خود اپنا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے:

''عاجز گنہگار یوسف علی علوی لکھنوی کمترین زمان، قدوۂ عارفاں زبدۂ واصلاں، مرشدنا وہادینا، حضرت مولانا شاہ عبدالرحمٰن مد اللہ ظلہ العالی وکمالہٗ امیران عظام کی جناب میں غلامی کے دعویٰ کو جتاتا بھی ہے''۔7

مصنف نے شاہ اسماعیل شہید کی مشہور کتاب ''تقویۃ الایمان'' کا جواب لکھنا چاہا۔اس کام کے لیے اس نے اجمیر جا کر خواجۂ بزرگ کی روح سے تائید باطنی طلب کی۔اس معاملے کا بیان اس نے اس طرح کیا ہے:

''جب کہ یہ رسالہ بلدۂ مبارکہ حضرت اجمیر شریف میں سنہ بارہ سے سینتالیس ہجری نبوی (1827) میں آستانۂ مقدسہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے لکھنے میں آیا، محض دین کی تقویت کے واسطے تائید باطنی روح مبارک حضرت خواجہ صاحب کے سبب سے، اسی لیے نام اس رسالہ کا تائید المعین فی تقویت الدین رکھا''۔

یہ کتاب حضرت معین الدین کی روح کی تائید سے تقویت الایمان کے رد میں لکھی گئی تھی، اس لیے اس کے نام میں دونوں کے جُز واوّل کو شامل کرلیا گیا۔مصنف لکھنؤ کا رہنے والا اور رعایت لفظی کا دلدادہ تھا۔اس لیے اس نے مذکورہ دونوں کلمات یعنی معین اور قوت کا بہ کثرت استعمال کر کے عبارت میں ان دونوں کے معنی کی رعایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب8 کے مطالب کو چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر فصل کے لیے مصنف نے کلمہ تمہید کا استعمال کیا ہے۔ان چاروں فصلوں کے مباحث درج ذیل ہیں:

پہلی تمہید : توحید اور شرک کی تحقیق میں

دوسری تمہید : انبیا اور اولیا کی فضیلت کے بیان میں

تیسری تمہید : انبیاء اور اولیاء میں افضل کون ہے؟

چوتھی تمہید : انبیاء واولیاء کو جو بزرگی دی گئی ہے تو ان میں بزرگی کی کون سی باتیں ہوتی ہیں؟

ہر تمہید میں کئی کئی فائدے لکھے گئے ہیں۔ زیارت قبور اور مسئلہ شفاعت سے بھی بحث کی گئی ہے۔ ساری بحثوں کا ماحصل یہ ہے کہ اولیاء کرام کے مزاروں کو پوجنا کفر نہیں ہے۔

اس قدیم زمانہ میں نثر نظم آمیز لکھنے کا رواج تھا۔ اس کتاب میں بھی یہی صورت ہے۔ اس کی ابتداء حمد وثنا سے ہوتی ہے جو منظوم ہے۔ اس کے بعد نثری عبارت شروع ہوتی ہے:

''الٰہ العالمین شکر تیری جناب پاک کو ہو تو نے ہمارے تئیں اس قدر نعمتیں بخشیں کہ اگر ہر بال ہمارے بدن کا زبان ہو اور ہر زبان سے تیرا شکر ادا کریں تو چھوٹی سے چھوٹی نعمت کا بھی شکر قیامت تک ادا نہ کر سکیں گے۔

کتاب کا اختتام ان شعروں پر ہوا ہے ۔

نہ رکھ مجھ کو ہستی کی تقلید میں — فنا کر مجھے اپنی توحید میں
تو دیکھوں ترے نور کو جلوہ گر — ہر اک شے میں، کیا سنگ اور کیا شجر
مری تجھ سے ہمگی یہی آرزو — نہ ہو مجھ میں ایک ذرہ ہستی کی بو

کتاب کی ضخامت ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ ہے۔[2]

یوسف علی علوی کی زبان پر قدامت کا اثر بہت غالب ہے بلکہ بعض وقت خیال ہوتا ہے کہ اس میں لکھنؤ کی بول چال سے مطابقت کم سے کم پائی جاتی ہے۔

(ب) الوَر

ریاست آمیر (جے پور) کے راج گھرانے کے ایک فرد پرتاپ سنگھ نے اس علاقے کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر کچھ حصہ پر قبضہ کرلیا اور قصبہ الور کو اپنی راجدھانی بنالیا۔ یہ راجا صاحب ہمت اور دوراندیش تھا۔ اس نے اپنی رہائش کے لیے قلعہ کے اندر محل بنوایا، اور قصبہ کے گرد شہر پناہ اور خندق خام تیار کروائی[1]۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا لے پالک بختاور سنگھ گدی پر بیٹھا۔ اس ناعاقبت اندیش نے کسی بات پر خفا ہو کر رسول شاہیوں کا قتل عام کرایا اور اس کے کار پردازوں نے ظلم کا بازار گرم کیا۔ مسلمانوں کی مظلومی کی داستان سن کر اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے انگریزوں سے سفارش کر کے الور پر فوج کشی کرائی، اس کے چند سال بعد میوؤں نے سرکشی اختیار کی، اسی زمانہ میں 15 صفر 1230ھ جنوری 1815 کو راجا مرگیا، اس کے بعد بلونت سنگھ اور بنے سنگھ گدی پر بیٹھے اور ان کے موافقوں کے درمیان اختلافات جاری رہے۔

شاہ عالم ثانی کے عہد میں قصبہ الور میں فارسی علم ودانش کے بعض شیدائیوں کے موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں ایک گھرانہ: ''ملا وسن ولد ملا موسیٰ ساکن قصبہ الور'' کا بھی تھا[2]۔ اول الذکر نے رسالہ حسنات العارفین معروف بہ شطحات کو خود اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں الور میں ایک سرکاری مدرسہ قائم ہو چکا تھا۔ مرزا قادر بخش صابر

نے ضمناً اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

1-''بلند تخلص، صفدر علی بیگ نام، ابن مرزا افضل علی بیگ، قوم مغل والد اس نیک نہاد کا راجا الور کی سرکار میں علاقہ مدّری مدرسہ سے ممتاز ہے''۔3

افسوس ہے کہ اس مدرسہ کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں ہو سکی ہیں۔ مرزا افضل علی بیگ کے حالات بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ بصورت موجودہ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک علمی گھرانہ تھا۔ افضل بیگ کے ایک صاحبزادے صفدر علی بیگ شاعر تھے اور اس حیثیت سے یہ الور کی شعری اور علمی فضا کے بنانے والوں میں سے تھے۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں الور کے علاقے پر عملاً انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور وہاں عیسائی مذہب کی تلقین واشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا، بختاور سنگھ کی ناعاقبت اندیشی نے ریاست کی مسلم رعایا کو انگریزوں کی تائید وحمایت پر مجبور کر دیا تھا چنانچہ وہاں کے علمی کاموں میں اسی صورت حال کی عکاسی ظاہر ہوتی ہے۔ مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرے میں جعفر شریف نامی ایک نثر نویس کے حال میں لکھا ہے:

2-''جعفر شریف یعنی لالہ میاں، بیٹا علی شریف کا، قوم سے قریش، مذہب سے سُنّی، باشندہ الور کا قدیم سلطنت گولکنڈہ میں جس شہر میں وہ زندہ تھا درمیان 1832 (47-1247ھ) کے، اس کا باپ باشندہ ناگور کا تھا، وہ مصنف ایک بڑی ذی قدر ہندی کتاب مسمّی قانون اسلام کا ہے، جس کتاب کا انگریزی میں ڈاکٹر ہرکلاڈ صاحب نے ترجمہ کیا ہے، یہ رسالہ سب سے بڑی قدر کا کتابوں میں سے مذہب اسلام میں جو تصنیف ہوئی ہے، اہل اسلام کے مذہب کو وہ مستوعب بیان کرتا ہے''۔4

تلاش کے باوجود جعفر شریف کے حالات اور اس کی کتاب کے بارے میں مزید کوئی بات معلوم نہ ہو سکی، ہر نوع اوپر جو مذکور ہوا اس کی روشنی میں وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ریاست الور میں اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں اردو نثر ونظم کا کم وبیش رواج ہو گیا تھا۔

(ج) بھرت پور

بھرت پور کا علاقہ بھی صوبہ اکبرآباد (آگرہ) کے متعلقات میں سے تھا۔ راجا بدن نے یہاں ایک آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی جسے اس کے بیٹے سورج مل نے بہ زور شمشیر باپ کی زندگی میں ہی مستحکم کر دیا تھا۔ راجا سورج مل کے زمانہ میں اس ریاست کو شہرت اور نیک نامی حاصل ہوئی۔ محمد تقی میر جیسے باکمال نے بھی وہاں جا کر کچھ دن قیام کیا تھا۔ سورج مل کے بعد اس کے بیٹے رنجیت سنگھ کے زمانے میں اس ریاست میں مختلف علوم وفنون مثلاً طب، نجوم، ہیئت اور ہندسہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کو بھی رواج حاصل ہوا۔ جن گھرانوں نے بھرت پور میں علم وشعر کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا تھا ان میں سے ایک کے اخلاف میں کم سے کم دو شخصوں یعنی رہا اور مشیر نے شاعر کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ یہ دونوں اصلاً آگرے کے رہنے والے تھے چنانچہ ان کا حال مختصراً وہاں لکھا جا چکا ہے۔

1 - رہا: مرزا قادر بخش صابر نے ان کے حالات میں بہت مفید معلومات قلمبند کی ہیں، لکھا ہے:

> ''رہا تخلص، غلام محمد خاں، قوم افغان، ساکن اکبرآباد، شاگرد خلیفہ سید گلزار علی اسیر رحمۃ
> بزرگوار اس کا سرکار والی بھرت پور میں عہدہ ہائے جلیلہ سے ممتاز رہا اور اس کے پدر

عالی مقام نے از بس کہ ایام طفلی میں شوق سلح شوری غالب تھا اسی سرکار میں عہدۂ سپہ گری پر مامور ہو کر کثرت اعتبار سے لبنائے روزگار میں امتیاز بہم پہونچائے، کہتے ہیں کہ اس کامل نژد نے مولوی محمد کامل علیہ الرحمہ سے کہ نجوم و ہیئت و ہندسہ میں یگانۂ روزگار اور وحید قرون اور اوحد ارتھے، تمام کتب درسیہ ابتداء سے انتہا تک پڑھی ہیں، ریختہ میں زبان شستگی اور فکر بلندی سے خالی نہیں ہے"۔1

حکیم قطب الدین باطن نے بھی اگر چہ رہا کے والد اور دادا کا نام نہیں لکھا ہے لیکن ان کے بھائی کا ذکر کر دیا ہے، رہا کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ:

1-"رہا تخلص، غلام محمد خاں نام، کہین برادر عنایت حسین خاں مشیر، متوطن فخر دہلی، شاگرد خلیفہ میر گلزار علی صاحب اسیر"۔2

اور ان کے بھائی کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

2-"مشیر تخلص، بہ عنایت حسین نام، شاگرد استاد اسیر، شوخ چشم، طرار طبع نوجوان، بندے پر مہربان"۔

تعجب ہے کہ باطن نے اپنے مہربان کے ذکر میں اس قدر اختصار سے کام لیا اور اس کے عالی مرتبت باپ دادا کا نام تک نہیں لیا۔ ذیل میں ان دونوں بھائیوں کے صرف دو دو شعر نمونہ کے طور پر درج کیے جاتے ہیں:

اشعار رہا:

کس روز خیالِ مہ کنعاں نہیں رکھتے — کس روز ہم آباد یہ زنداں نہیں رکھتے
شادی ہے کبھی، غم ہے کبھی، وصل کبھی، ہجر — ہر روز نیا ڈھنگ ہے اس چرخ کہن کا

اشعار مشیر:

تم شب مہ میں جس طرف کو گئے — مہ کامل چلا تمھارے ساتھ
چھوڑیگا جنوں تن پہ نہ اک تار کفن کا — شرمندہ نہ ہوگا یہ گنہگار کفن کا

دونوں بھائی رعایت لفظی کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں کو مضامین تازہ کی تلاش کا شوق ہے۔ گویا ان کی شاعری کا میلان لکھنویت کی طرف تھا۔

جس مرکز پر نجوم، ہیئت اور ہندسہ وغیرہ علوم کے سیکھنے اور سکھانے والے موجود ہوں وہاں کسی مدرسہ کا قیام نہ ہونا حیرت انگیز ہوتا۔ میر قطب الدین باطن نے ضمناً یہ اطلاع بھی قلمبند کردی ہے کہ بھرت پور میں بھی ایک سرکاری مدرسہ قائم تھا اور وہاں ایسے استاد موجود تھے جو اپنے موضوع سے متعلق تفصیل کے ساتھ بحث ومباحثہ کر سکتے تھے۔ اس زمانے میں جب کہ ہندوستانی ریاستیں ہر اعتبار سے رو بہ زوال تھیں۔ بھرت پور اور الور جیسی سرکاروں میں بھی باضابطہ مدرسوں کی موجودگی قابل توجہ ہے۔

باطن نے مدرسہ بھرت پور کا ذکر عاشق کے حالات میں کیا ہے، ان کا اختصار اس طرح ہے:

> 3-''عاشق تخلص، شیخ نبی بخش نام، کہین پور شیخ محمد صلاح مرحوم، پنجابی الاصل مولد ومنشا جۂ دہلی مفہوم شاگرد رشید ہادی شعرا، شاہد سخن کے عاشق ومبتلا، مرد لطیف ظریف وحریف، بذلہ سنج، چست وطرار استوار، استعداد فارسی معقول، علم عربی سے آگاہ، صالح مزاج، صدہا کتب تحت خامہ گذریں، ظفر یاب خاں راسخ بریلوی سے سوال وجواب بہ نظم ونثر اکثر بہ وجہ احسن رہا، مرزا تخلص شاگرد مرشد شعراء سے مباحثۂ معقول رہا، تہذیب طالب علمان مدرسۂ سرکار بھرت پور ان کے اختیار تھی، مباحثۂ درس میں ان کو باہم تکرار تھی، سنہ بارہ سو تریسٹھ ہجری (1847) میں ترک روزگار کر کے حرمین شریفین کی زیارت کو گئے، سفر مبارک میں جہان سے سفر کیا، میں اور وہ دونوں شاگرد استاد باسرا دیعنی ہادی شعرا نظیر جن کا کلام دلپذیر.....''

معلوم ہوتا ہے کہ والی بھرت پور کو طب ومعالجہ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس سرکار میں جو شاعر باریاب ہوئے تھے ان میں سے بیشتر باہر سے آنے والے طبیب تھے بعض یہ ہیں:

4-وحید:

حکیم قطب الدین باطن نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''حکیم محمد وحید الدین خاں رئیس بدایوں، بہ سرکار والی بھرت پور بہ زمرۂ اطبا سرفراز''۔5

محسن نے ان کے بارے میں مفید معلومات قلمبند کی ہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں:

> ''ملازم راجا بھرت پور حکیم وحید اللہ خاں وحید ولد حکیم سعید اللہ خاں (سعد اللہ؟) بن

حاذق الملک حکیم عبد اللہ خاں قریشی، باشندۂ بدایوں، مقیم بھرت پور، صاحب

دیوان"۔6

اس سے ظاہر ہے کہ یہ خاندانی طبیب تھے۔ راجا نے ان کی قدر کی اور اپنی سرکار میں انھیں طلب کر لیا، شاعری کے فنِ شریف سے بھی کما حقہ دلچسپی لیتے تھے، مشاق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ مشکل ردیف اور قوافی میں بھی اچھے شعر کہہ لیتے تھے، کلام کا نمونہ یہ ہے۔

دیکھ کر گلشن میں تیری زمزمہ سازی وحید ·· بولنے سے تھک گئی آخر زبان عندلیب

شجر عشق نے اچھا یہ دیا مجھ کو ثمر وجہ بے وجہ جو سب سنگ زنی کرتے ہیں

کیوں چھپاتا ہے صنم توتہِ داماں عارض پارۂ نور ہیں یہ، کب ہوئے پنہاں عارض

دردِ ہجراں سے ہوئے جاتے ہیں سر کے ٹکرے چشم سے آتے ہیں چھن چھن کے جگر کے ٹکڑے

(5) فطرت:

یہ اصلاً پرتگالی تھے اور ہندوستان میں انھوں نے جے پور کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا، حکیم قطب الدین باطن نے لکھا ہے:

"فطرت تخلص، حکیم ایلس نام، ابن حکیم بیدرو ڈسلوا (پیڈرو ڈی سلوا) المخاطب بہ خرد مند خاں ساکن جے پور، علم طب سے بہرہ اندوز، فکر شعر معقول، حال ساکن بھرت پور، عرصہ قریب ہوا کہ مر گئے، ایام زندگی بخوبی بھر گئے"۔7

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے ان کے حالات مجملاً اس طرح تحریر کیے ہیں:

"اس8 خاندان کے موجودہ معمر حضرات سے معلوم ہوا کہ اُن کا آبائی وطن پرتگال کی ایک قدیم آبادی سِلوا تھی۔ اسی نسبت سے یہ خاندان ڈی سلوا کہلایا۔ ان کے مورث اعلا حکیم پیڈرو ڈی سلوا عرف خرد مند خاں کو مہاراجا سوائی جے سنگھ دوم موسس شہر جے پور نے خصوصی طور پر بلوایا تھا۔ ان کے بیٹے ڈان زیویر ڈی سلوا عرف اچھے صاحب تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے: ڈان گاسپر ڈی سلوا، ڈان جوزڈی سلوا، ڈان فرانسس ڈی سلوا۔

دوسرے بیٹے ڈان ایلس ڈی سلوا بھرت پور کے مہاراجا کے ملازم ہو کر وہاں چلے گئے، اس خاندان کا آبائی پیشہ حکمت تھا۔ یہ سلسلہ کئی پشتوں تک جاری رہا"۔

اس خاندان کے واسطے سے راجستھان کے علاقوں میں پرتگالی زبان ومعاشرت کے کم وبیش جو اثرات مرتب ہوئے تھے ان کے تجزیے اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ فطرتؔ کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جو شب کو خواب میں آیا وہ چشمۂ حیواں　　بہائے چشم نے رو رو کے خواب میں دریا

دل کو چھیدا، سینہ چیرا، کاٹا سر، باندھے ہیں ہاتھ　　تیر نے، خنجر نے، تیغ وطرّۂ طرّار نے

ان کی زبان بھی اور شاعری بھی اکتسابی تھی۔ صنائع وبدائع کے صَرف کو ہی بہ گمان غالب یہ شاعری کا کمال خیال کرتے تھے۔ مشق ومزاولت نے قادرالکلام بنا دیا تھا چنانچہ سنگلاخ زمینوں میں بھی بڑے شوق سے غزلیں کہتے تھے۔

بھرت پور میں ملک کے مختلف گوشوں سے اہل شوق آکر مقیم ہوئے تھے۔ یہاں عام طور سے کتابی اردو کا چلن ہوا تھا اور اس میں دہلی اور لکھنؤ وغیرہ مختلف مراکز کے اثرات نمایاں تھے۔

(د) ٹونک

راجستھان کے خطے میں یوسف زئی پٹھانوں کی ایک ریاست ٹونک تھی۔ امیر الدولہ نواب محمد امیر خان بہادر نے 1232ھ (1817) میں سرکار کمپنی بہادر سے ایک معاہدہ کر کے اپنے مستقر ٹونک کو ایک مختصر سی ریاست کی حیثیت دے دی تھی۔ یہ امیر خاں جسونت راو ہلکر کے دوست اور ایک صاحب حوصلہ سردار تھے۔ اپنی عالی ہمتی اور زور شمشیر سے انھوں نے اپنی ریاست کو بتدریج وسعت عطا کی، نواب کی خوش انتظامی نے ریاست کو بہت جلد عزت اور توقیر عطا کر دی اور کیفیت یہ ہوئی کہ دور و قریب سے اہل دانش و تدبر اور ارباب علم و فن یہاں آ آ کر بسنے لگے۔ امیر مینائی نے رام پور کے نواب احمد علی خاں رند کے احوال میں لکھا ہے:

> "نواب رند کو، نظم و نسق ریاست سے مطلق سروکار نہ تھا، ہزارہا آدمی گھر چھوڑ کر ٹونک وغیرہ اور ریاستوں کو چلے گئے۔ نواب امیر خاں کی نوکری کر لی"۔1

اپنے ابتدائی زمانے میں فقیر محمد خاں گویا بھی نواب امیر خاں بہادر کی ملازمت اور مصاحبت میں رہے تھے۔ امیر خاں بہادر کی وفات کے بعد 1250ھ (1834) میں وزیر الدولہ بہادر مسند نشیں ہوئے۔ یعنی انھوں نے اکبر شاہ ثانی کا آخری دور دیکھا تھا۔ وزیر الدولہ نہایت متقی اور دین دار رئیس تھے۔ انھوں نے علوم و فنون کی سرپرستی کو بدستور جاری

رکھا۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی ریاست کو ایک اچھے علمی مرکز کا درجہ حاصل ہوگیا۔شعرا اور مصنفین کے ساتھ ساتھ وہاں تصنیفات اور تالیفات کا بھی قابل توجہ ذخیرہ فراہم ہوگیا تھا۔دہلی کے نیشنل میوزیم میں اکبر شاہ ثانی کے عہد کے جو متعدد قلمی نسخے نواب ٹونک کے کتب خانے کے لیے خریدے گئے تھے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

1-اخوان الصفا	اکرام علی
2-انتخاب خلاصۃ التواریخ	مرزا عالم علی بیگ
3-پدماوت	سید غلام علی مشہدی عشرت
4-دیوان سودا	مرزا محمد رفیع سودا۔

(1) شاداں

لالا سری رام نے ان کے تعارف میں جو تحریر کیا ہے مختصراً یہ ہے:

"منشی بساون لعل شاداں، قوم کائتھ، میر منشی نواب امیر خاں بہادر والی ریاست ٹونک .... کتاب امیر نامہ یعنی سوانح عمری نواب موصوف کی ان کی تصنیفات سے ہے، اور ایک فارسی مثنوی بھی انھوں نے ممدوح کے امیروں کے حالات میں لکھی ہے"۔[2]

یہ شاداں نین سکھ رائے کے بیٹے اور کائتھ سکسینہ تھے۔اصلاً بلگرام متعلقہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، نواب کی ایماء سے 1240ھ (1824-25) میں فارسی نثر میں امیر نامہ لکھا تھا، یہ کتاب بہ گمان غالب ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں اس کے ایک سے زائد قلمی نسخے موجود ہیں۔شاداں اردو میں بھی شعر کہتے تھے، ان کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے۔

یوں داغ دل ہیں اس مرے سینے کے آس پاس — چنے جڑے ہوں جیسے نگینے کے آس پاس

ان کا ایک قطعہ یہ ہے، کہتے ہیں انھوں نے فی البدیہہ کہہ کر نواب کی نذر کیا تھا۔

گل گلاب نے خوبی جو یہ دکھائی ہے — بہار جامۂ گلگوں پہن کے آئی ہے

جو پوچھیے تو یہ ہے برکت قدوم حضور — وگرنہ گل نے یہ خوبی کہاں سے پائی ہے

منشی دیبی پرشاد نے امیر نامہ کا اردو زبان میں افتخار التواریخ کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔پھر حافظ پائندہ محمد خاں نکہت رام پوری ابن شمس الدین خاں رام پوری نے امیر نامہ کو اردو میں نظم

کر کے اس کا نام ''ظفر نامۂ امیر'' رکھا تھا۔ افسوس ہے کہ نکہت کا احوال اور اردو کلام فی الوقت ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا۔

(2) نامعلوم

نواب امیر خاں بہادر کے متوسلین میں سے کسی شاعر نے 1236ھ (1821) میں ایک مثنوی مظہر لاٗ نوار لکھی تھی جس میں نواب کی اور ان کی حویلی کی خوبیوں اور رونقوں کا بیان کیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے مثنوی سے پہلے فارسی نثر میں اس کا دیباچہ بھی لکھا تھا۔ قلمی نسخے کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:

''حمد خدائے جہاں آفریں، پیدا کنندۂ زمان وزمیں، صانع شمس وقمر، خالق جن والبشر، آتش بے مثل.....''۔

اس مثنوی کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

اسے جو پڑھ کے ہووے خرم وشاد　　دعائے خیر سے یا رب کرے یاد

معلوم ہوتا ہے کہ مخطوطے کے کچھ ورق ضائع ہو گئے جنھیں بعد میں نیلی روشنائی سے لکھ کر پورا کیا گیا ہے۔ ترقیمہ اس نسخے کا اس طرح ہے:

''تمام شد مثنوی مظہر لاٗ نوار بہ دستخط عاصی پُر معاصی محمد رحیم اللہ 1238ھ (1827)''۔

یعنی یہ تصنیف کے صرف دو برس بعد کا نسخہ ہے، فہرست نگار نے کاتب کو مصنف خیال کر لیا ہے اور اس مثنوی کو محمد رحیم اللہ کی تصنیف قرار دے دیا ہے۔

(3) سید محمد علی

یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے مریدوں میں سے تھے۔ صاحب علم وفضل تھے ٹونک کے علاقے میں ان کے تربیت کردہ کئی شاعر تھے۔ تعجب ہے کہ ان کے حالات بالکل معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کے ایک شاگرد محمد فیاض خاں کی نظم ''جواہر معنی'' کے قلمی نسخے پر ایک مہر لگی ہوئی ہے جس میں ''امیر وزیر محمد علی 1281ھ'' لکھا ہے، اگر یہ انھیں مولوی محمد علی کی مہر ہے تو سمجھا جانا چاہیے کہ یہ نواب وزیر الدولہ کے امراء میں سے تھے اور 1281ھ (1864-65) تک زندہ تھے، امیر مینائی نے ان کے بعض شاگردوں کا احوال اور کلام اپنے تذکرے میں تحریر کیا ہے، مثلاً:

(5)مرشد

مرشد، سید غلام مرشد بلاسپوری ابن مولوی غلام جیلانی قدس سرہما مولوی سید محمد علی مغفور متوطن ٹونک کے شاگرد رشید ہیں، کلام ان کا قابل دید ہے، اٹھائیس برس کی عمر پائی، 1284ھ (1867-68) میں رحلت فرمائی۔

کم عمری کے باوجود مرشد پختہ اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اپنی قوت مشقی کے اظہار کے لیے وہ مخمس بھی کہتے تھے۔ امیر مینائی نے ان کے مخمس کا یہ ایک بند نمونہ کے طور پر نقل کیا ہے:

"مخمس در مدح نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خان بہادر والی ٹونک"

ثریا مثل سنبل خوشہ چیں ہے اس کے خرمن کا
قبائے چرخ اطلس ایک گوشہ اس کے دامن کا
فروغ ماہ تاباں عکس اس کے روے روشن کا
بہار ہشت جنت ایک بوٹا اس کے گلشن کا
ضیائے نور سے اس کی مزین شمس اکبر ہے

(5)فیاض

یہ بھی مرشد کے استاد بھائی تھے۔ امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں ان کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے:

"فیاض، محمد فیاض خاں ولد مولوی عبداللہ خاں ساکن بلاسپور یہ بزرگ حافظ قرآن، قاری خوش خوان تھے، نہایت نیک نہاد بڑے ذی استعداد، ضبط اوقات سے زمرۂ اہل اللہ میں داخل، طب میں دستگاہ کامل، سید طوی محمد علی متوطن ٹونک سے تلمذ تھا، پینتالیس برس کی عمر ہوئی، پچیسویں رجب کو چار شنبہ کے دن بارہ سو ستر ہجری (1857) میں رحلت کی، کچھ کلام ان کا ملا کہ وہ درج تذکرہ ہوا"۔

حافظ احمد علی شوق کے تذکرے میں ان کے بارے میں ہے کہ:

"وزیر الدولہ کے عہد میں فیاض ٹونک میں بہ عہدۂ وکالت ملازم تھے، تاریخ وفات 25 رجب 1272ھ (یکم اپریل 1856) ہے، وفات کے وقت عمر چھیالیس

برس کی تھی، رام پور میں قلاش خاں کی مسجد کے قریب قبرستان میں دفن ہوئے"۔

امیر مینائی نے ان کا صرف فارسی کلام نقل کیا ہے جس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید فیاض اردو میں نہیں کہتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اردو کے بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کی ایک طویل مثنوی جو ساڑھے سینتیس سو سے زائد شعروں پر مشتمل بتائی گئی ہے اپنے زمانے میں مقبول رہی ہے۔ اس کے قلمی نسخے کراچی اور دہلی وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، اس مثنوی کا عنوان "جواہر معانی" ہے۔ اس میں حضرت سلیمان اور حضرت بلقیس کے واقعہ کی شرح نظم کی گئی ہے، نسخۂ دہلی کی کتابت 25 شوال 1260ھ (1844) کو مظہر الدین فیض محمد نے کی تھی[8]۔ شروع کے دو شعر یہ ہیں۔

کہاں اے گہر ریز معنی نگار　　عطارد رقم منشی نامدار
تراش اک قلم خط ریحاں نگار　　کہ ہر حرف میں جس کی ہو لالہ زار

یہ نسخہ ذیل کے شعروں پر مکمل ہوا ہے۔

پلا ساقیا جام صہبائے خام　　ہوا پختہ رنگ معانی تمام
غم اور رنج فیاض اب دور کر　　مے شادمانی سے مسرور کر

ترقیمہ میں کاتب نے مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں، اس لیے وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"الحمد للہ کہ نسخہ جواہر معنی مشتمل بر احوال سلیمانی و بلقیس زہرہ پیشانی در عرصۂ دو ماہ بہ حسب فرمودۂ جناب فیض مآب سکندر شوکت سلیماں حشم ہرستم تواں فریدوں علم نواب والا خطاب محمد وزیر الدولہ بہادر جنگ دام ملکہ، دراز دولتہ و حشمتہ، مصنف نسخہ ہذا محمد فیاض خاں ابن مولوی محمد عبد اللہ ابن مولوی محمد بشارت اللہ متوطن قصبہ بلاسپور، عملہ پرگنہ راجپور علاقہ مصطفیٰ آباد عرف رام پور غفرلہ، کاتب خاکسار مظہر الدین فیض محمد ابن وزیر الدین احمد ساکن قصبہ بھروپچ بہ تاریخ بست و پنجم شہر شوال المکرم 1260 ہجری صورت اختتام یافت"۔

اس مخطوطے کے سرورق پر ایک مہر لگی ہے جس میں لکھا ہے "امیر وزیر محمد علی 1281ھ" یہ مہر غالباً مصنف کے استاد کی ہے۔

نظم جواہر معانی کا نسخہ کراچی ناقص الآخر ہے۔ اس کے تعارف میں جناب مشفق خواجہ نے

جو لکھا ہے اس کا اختصار اس طرح ہے:

''اس مثنوی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی داستان حیات بیان کی گئی ہے، اس ناقص الآخر نسخے میں کل بیس ابواب ہیں، ان میں سے بس چھ باب (نوتا چودہ) ملکہ بلقیس کے تعلق سے ہیں، مثنوی کی ابتداء حمد ونعت اور منقبت اصحاب کرام سے ہوتی ہے۔ ورق تیرہ، پ سے تذکر مدح جناب سیدی وسندی مخدومی ومرشدی مولانا غلام جیلانی صاحب زاد اللہ رشدہم ومجدہم ہے .... مولانا غلام جیلانی کا اصل وطن بلاس پور تھا اور ٹونک کے نواب محمد وزیر الدولہ ان کے مرید تھے... اس کے بعد مدح نواب والا جناب گوہر کان تعظیم وتوقیر وفرہنگ نواب محمد وزیر الدولہ بہادر نصرت جنگ دام اقبالہ ہے پھر اصل داستان شروع ہوتی ہے''۔9

حافظ شوق نے فیاض کی تقریباً دو درجن تصانیف کے نام لکھے ہیں جو نظم اور نثر دونوں میں ہیں اور ان کے موضوعات مذہب، طب، ادب قانون وغیرہ ہیں۔

افسوس ہے کہ فیاض کی غزلیں وغیرہ ہمیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔

(6) قادری

یہ محمد فیاض خاں فیاض کے مرشد تھے، چنانچہ اقتباس بالا سے ظاہر ہے، امیر مینائی نے ان کا احوال اس طرح تحریر کیا ہے:

''قادری سید شاہ غلام جیلانی خلف سید شاہ حقیقت اللہ عرف بھورے میاں قدس سرہٗ قصبہ بلاس پور کے متوطن، بڑے مرد مرتاض، اتقا کے صاف باطن، مدت تک ٹونک میں رونق افروز رہے، نواب وزیر الدولہ والی ٹونک اور بہت سے وہاں کے لوگ حضرت کے فیض سے بہرہ اندوز رہے، گاہ گاہ بطور خود شعر بھی موزوں فرماتے تھے، ابتداء میں معلم تخلص تھا، سرسٹھ (کذا) برس کی عمر پائی، محرم کی اٹھارویں تاریخ بارہ سو تہتر (1856) میں وفات پائی، ایک شعر حضرت کا پایا وہ یہاں ضبط تحریر میں آ گیا 10

از جنگ نامۂ امام حسین علیہ السلام

نور چشم وقرۃ العین محمد مصطفیٰ ﷺ

راکب دوش پیمبر سبط خیر المرسلیں

اس اقتباس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ بلاس پور (ضلع رام پور) بڑی مردم خیز بستی تھی کہ وہاں عالم اور مرد مرتاض ہوتے تھے۔ اس بستی کے اکثر باصلاحیت اور حوصلہ مند شخص ترک وطن کر کے ٹونک میں بجا رہے تھے۔

اس میں تو شک نہیں کہ معمولاً اردو میں شعر گوئی کو غزل گوئی کا مرادف سمجھا جاتا تھا.....اور جنوب کے بیشتر مراکز پر مثنوی کے لکھے جانے کا چلن زیادہ تھا۔ ان علاقوں میں ملک گیری کے لیے اکثر جنگیں بھی ہو رہی تھیں بعض شاعروں نے جنگ نامے بھی لکھے تھے، اس رو میں کچھ شاعروں نے نام اور انعام کے حصول کے لیے مذہبی بزرگوں کے سوانح اور واقعات پر مشتمل جنگ نامے بھی تصنیف کیے تھے چنانچہ قادری نے بھی یہی کیا تھا۔

غلام جیلانی قادری نے ایک اور مثنوی "نظم الہدایت" کے نام سے لکھی تھی، نیشنل میوزیم دہلی میں اس کا بھی ایک قلمی نسخہ موجود ہے 11 جو ساٹھ اوراق پر محیط ہے۔ جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے، اس نظم کا موضوع اسلامی قوانین اور فقہ سے متعلق ہے۔ بعض دعاؤں اور ان کی اہمیت وغیرہ کا بھی اس نظم میں بیان کیا گیا ہے، یہ شروع اس شعر سے ہوئی ہے۔

کہہ دلا تو حمد اس خالق کی سب سے اولاً جس نے مشت خاک کے تئیں نعمت ایمان دیا

اور خاتمہ اس مثنوی کا اس شعر پر کیا گیا ہے۔

یا الٰہی کر مری یہ سب دعائیں مستجاب تا کہ ہوں جلدی ترے فضل و کرم سے کامیاب

اس نسخے کا بھی ترقیمہ معلومات افزا ہے چنانچہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

"تمت تمام شد نسخہ متبرکہ مسمّٰی بہ نظم ہدایت در علم دین و شرح متین تصنیف سیادت شریعت پناہ معرفت و حقیقت آگاہ، سالک و مسالک خدا دانی، اسوۂ بارگاہ ربانی مولانا مولوی غلام جیلانی دام فیضہ، وکم نوالہ، یا ناظر فیہ سہل باللہ برحمۃ علی المصنف والمستظر لصاحبہ والطالب الممسک خیرا تزید بہا بعد ذلک غفرانا کاتبہ، بہ تاریخ یازدہم شہر ذی قعدہ 1263ھ (اکتوبر 1847)"۔

قوی امکان ہے کہ ان کی بعض تصانیف اور بھی ہوں۔

(۵) جودھپور

جودھپور کی ریاست وہی ہے جسے کسی زمانہ میں مارواڑ کہا جاتا تھا۔ ناگور کا قصبہ جو زمانۂ قدیم سے صوفیوں اور بزرگوں کا مسکن رہا ہے اسی ریاست کی حدود میں ہے۔ یہ علاقہ ابتدائے زمانہ سے ہی مسلمانوں کے زیر اثر رہا ہے۔ اس لیے یہاں کی مقامی بول چال میں فارسی زبان کے اثرات نمایاں ہیں۔

جودھپور میں زبان اردو بول چال میں رائج ہوگئی تھی لیکن اس زبان کے تحریری نقوش یہاں اکبر شاہ ثانی کے عہد سے پہلے دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کا کہنا ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے دور میں جودھپور کا راجا مان سنگھ فن موسیقی کا دلدادہ تھا اس کے دربار میں اردو غزلیں گائی جاتی تھیں۔

(1) رنگیلے: اسی راجہ مان سنگھ کے زمانہ میں سکندرآباد ضلع بلند شہر کا ایک موسیقار رمضان علی رنگیلے تخلص جودھپور پہنچا۔ راجا نے اس کی قدر کی اور جاگیر عطا کی۔ وہ جودھپور ہی میں 75-1274ھ (1885) میں فوت ہوا۔ اس کے گھرانے کے افراد بعد میں بھی موسیقی میں اس کی روش کو نبھاتے رہے چنانچہ وہ گھرانہ بھی رنگیلے کے نام سے معروف ہوا۔ رمضان علی رنگیلے خود بھی شعر کہتا تھا۔ اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جیسے تیری ادا کے ہم نے مزے اٹھائے
ویسے ہی رنج جاناں سو سو طرح کے پائے

کیونکر رگیلا حق کی رحمت سے ہووے منکر
بندوں نے جس کے آگے انساں موئے جلائے

آج گلشن میں کیا مزا دیکھا
ہر بیاباں میں گل کھلا دیکھا

ہے سکندر کہاں ، کہاں دارا
سب کو اس خاک میں ملا دیکھا

(و) جے پور

(الف) شاعری

جے پور بھی راجستھان کی پرانی ریاستوں میں سے ہے۔ قدیم تاریخوں میں اس کا نام آمیر آیا ہے۔ اس ریاست کا علاقہ شیخاوٹی مہدوی فرقہ کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہاں ان کا ایک دائرہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ اب وہ دائرہ ضلع جھنجھنو کا ایک قصبہ ہے۔ مہدوی بزرگوں نے زبان اردو کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ اسی زبان میں ان کی ایک مشہور اور ضخیم منظوم تصنیف تاریخ غریبی بھی موجود ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے آخر زمانے میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے دفاتر میں اردو کا استعمال شروع کیا تو جے پور کی ریاست میں بھی اسی زبان کو اختیار کر لیا گیا۔ زبان اردو کے فروغ میں تاخیر کا سبب احترام الدین شاغل نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''مہاراجا سوائی جے سنگھ کے بعد چھ رئیس ایسری سنگھ سے جے سنگھ سوم تک یکے بعد دیگرے ہوئے۔ ان کے عہد کا کوئی علمی و ادبی کارنامہ نہیں پایا جاتا بجز اس کے کہ چند ذی علم بزرگ جے پور آئے اور یہاں متوطن ہو کر بعض نے علمی فیض بھی پہنچایا''۔ 1

(1) صفدر

قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرے میں شاہ عالم ثانی کے عہد کے ایک شاعر کا ذکر اس

طرح کیا ہے:

''صفدر تخلص، میر صفدر علی است، وے سیدے است، از سکنۂ نواح جے پور بہ علاقۂ امیر سامانی بعضے امور سرکار دولتمدار نواب اسد الدولہ نجابت علی خان بہادر ہنر بر جنگ متعلق است، گاہ گاہ بطور خود شعر بختی گوید، دو بیت از وے است۔

دل کو تو مرے چھیڑ یو اے جان سمجھ کر　　اخگر کو نہ چھو لعل بدخشان سمجھ کر
اے ساکن اقلیم عدم، دم ترے قرباں　　کیا لاؤں ضیافت تری مہمان سمجھ کر''[2]

شیخ مصحفی نے ان کے بارے میں بعض مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں، لکھا ہے:

''میر صفدر علی صفدر تخلص، شاگرد میاں نصیر کہ از شاہ جہاں آباد بہ گوالیار رسیدہ، ہمراہ ایشاں آمدہ بود، جوان صلاحیت شعار و مہذب الاخلاق است''۔[3]

اپنے استاد کی روش کے مطابق مشکل ردیفوں قافیوں میں کامیابی سے غزلیں کہتے تھے، مثلاً:

جب کہ آتش کدہ یہ سینۂ سوزاں بن جائے　　جلوۂ برق نہ کیوں چاک گریباں بن جائے
کھول دیتی گرہ زلف، صبا کیوں نہ ہوئی　　تیرے پاؤں سے لگی رہتی حنا کیوں نہ ہوئی

جے پور کو اکبر شاہ ثانی کے عہد میں حضرت میر ضیاء الدین جے پوری کے مسکن کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل رہی ہے۔ یہ مولانا محمد فخر الدین صاحب کے خلیفۂ خاص تھے اور ان کے مریدوں میں نواب الٰہی بخش خاں معروف اور مولوی نیاز احمد بریلوی جیسے حضرات تھے۔

(2) گل: مرزا اکبر علی خاں نام، گل و نگار تخلص، نواب رضا علی بیگ خاں کے بیٹے اور افتخار الدولہ بہادر نواب محمد بیگ خاں فیروز جنگ ہمدانی کے پوتے تھے، قرآن و حدیث کا اچھا مطالعہ کیا تھا، اور مذہبیات سے بخوبی دلچسپی رکھتے تھے، ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی کا کہنا ہے کہ وہ 1225ھ (1810) سے پہلے دہلی سے جے پور پہنچ گئے تھے اور وہیں انھوں نے وفات 1266ھ (1869) میں پائی تھی، تاریخ وفات اس طرح تحریر کی گئی ہے:

''بیتے در تاریخ میرزا اکبر علی بیگ کہ گل تخلص بود، شاعر

صد حیف میرزائے اکبر علی فنا شد
تاریخ گفت رضواں، گل را بہشت جا شد''
1266

مرزا اکبر علی بیگ گل مولانا ضیاء الدین جے پوری سے عقیدت رکھتے تھے چنانچہ ان کے خلیفہ اور سجادہ نشیں رحمت علی شاہ (متوفی 1230ھ/ 1814) کی مدح میں ان کے دیوان میں ایک قصیدہ موجود ہے، گل نے وزیر الدولہ محمد وزیر خان بہادر والیِ ٹونک کی مدح میں بھی قصیدے لکھے تھے۔

قاضی فرزند علی فقیر تلمیذ شیخ عطا حسین شور شاگرد مرزا اکبر علی گل نے ان کے تلمذ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

اور گل وہ تھے کہ ان کی بہار کلام سے　　آتی مشام عقل میں تھی بوئے باغ میر

اور خود گل نے اپنے استاد کا ذکر اس شعر میں کیا ہے۔

نہ کیوں گوہر فشاں اشعار ہوں تیرے زمانے میں　　ترا استاد اے گل میر سا یکتائے دوراں ہے

اکبر علی خاں کا تخلص گل ان کے کسی دوست یا بزرگ نے جس کا تخلص (یا شاید نام) بلبل تھا تجویز کیا تھا۔ لیکن ان کے استاد نے ان کے لیے نگار تخلص پسند کیا تھا، چنانچہ کہتے ہیں۔

گل رکھا بلبل نے اور استاد نے رکھا نگار　　میرزا اکبر علی خاں کے ہوئے ہیں نام دو

بتایا گیا ہے کہ ان کا ضخیم دیوان مرتب تھا اور اس میں غزلوں کے علاوہ قطعات تاریخ، مثنویاں، خمسے، واسوخت، مثمن، قصائد وغیرہ تھے۔ انھوں نے تین مثنویاں مقامی بول چال (بھاکھا) میں بھی لکھی تھی جن کو ڈاکٹر ابو الفیض نے ہندی مثنویاں کہا ہے۔ ان میں ایک کے چند شعر یہ ہیں۔

پاپ کپٹ کو چھوڑ دے جی کی گھنڈی کھول　　اس کا بھید بتائے دے اے بلبل سچ بول

اے بلبل سچ بول کپٹ نہ رکھ جی مائیں　　میرے من کی مائیں پیت اور تیرے نائیں

سن بلبل کہے پھول چھپائے نہ چھپت ہے　　آگ برہ کی جیو مائیں جا کے سُلگت ہے

آتش عشق بہر دل کہ شود شعلہ فشاں　　گہ کند سوختہ دل گاہ کند دل بریاں

احترام الدین شاغل نے گل کے حالات میں لکھا ہے:

''حسب ذیل صاحبان ان کے معاصر ہیں: اظہر، بندہ، نگار اور مہدی، مگر ان چاروں کا بھی حال معلوم نہ ہو سکا''

ان چاروں کا ذکر گل نے اس مقطع میں کیا ہے۔

لے نگار و بندہ و مہدی و اظہر سے یہ گل　　اس غزل پر آفریں اے بندہ پرور تو سہی

(ب) نثر

راجستھان کے علاقے میں اردو نثر نگاری کا کوئی نمونہ شاہ عالم ثانی کے عہد تک کا ہنوز دستیاب نہیں ہو سکا ہے، اس خطے کی اولین نثری تصنیف کی حیثیت سے عظمت اللہ نیاز کے قصہ رنگین گفتار کو پیش کیا گیا ہے لیکن اس امکان سے صرف نظر نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہاں اس سے پہلے بھی شاید اردو نثر میں کچھ لکھا گیا ہو۔

1- قصہ رنگین گفتار: مصنف نے جو شاعر بھی تھا اس قصہ کا نام تاریخی رکھا ہے۔ اس سے سال تصنیف 1226ھ (1811) معلوم ہوتا ہے، مصنف نے اپنی جے پور میں آمد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ''عرض کرتا ہے احقر الانام نیاز تخلص، عظمت اللہ بخطبہ نام کہ ہر چند گاہ دار الخلافہ شاہجہاں آباد میں موزوں طبعوں کی ہمنشینی سے غزل کا تلاش رکھتا، اکثر اوقات خاطر آزردہ کو شعر کے تردد میں کاوش خراش دیتا، ہر گاہ سوائی جے پور میں وارد ہو کر آرام ملازمت حکیم صاحب فیاض زماں حاتم دوراں، حکیم شودیر دیسلو (ڈپو یڑی سلوا) پرتگیر خاں زاد اقبالہ کا پایا''۔

نیاز پرتگیر خان مذکور کے بیٹے کے اتالیق تھے چنانچہ اس کا ذکر انھوں نے ان لفظوں میں

قلمبند کیا ہے:

''بحسب اتفاق خلف الصدق حکیم صاحب کے زاسپار وسیلوا (گاسپرڈی سلوا)
عرف اچھے صاحب نے کہ اس کو چند روز نیازمند سے واسطہ تعلم کا بھی درمیان رہا
ہے''۔

اس زمانے کے طریقہ کے مطابق عظمت اللہ نیاز نے بھی اپنی داستان کو حمد و نعت سے شروع کیا ہے۔ یہاں ان میں سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

ھُوَ اللہ لاأحد موجود مطلق　　نہیں اُس بن کوئی معبود برحق
محمد جان ہے، پیغمبری تن　　نہ ہو قایم بغیر از جاں کبھی تن
پھر اس تن کے عناصر اور ارکان　　ابو بکرؓ و عمرؓ عثمانؓ علیؓ جان
درود حق بہ جانِ مصطفیٰؐ یاد　　بر آل اطہر و اصحاب امجاد

ان شعروں سے ظاہر ہے کہ مصنف عقیدہ کے اعتبار سے سُنّی تھا۔

نیاز نے قصہ میں بیچ بیچ میں متفرق اشعار، غزلیں اور مثنویاں وغیرہ بھی شامل کی ہیں۔ داستان کو مکمل کر لینے کے بعد بھی اس نے ایک غزل لکھی ہے جس کا مقطع یہ ہے۔

لگ رہی ہے تری رحمت پہ مری چشم نیاز　　کر نظر مجھ پہ بھی گو ہوں میں گنہگار ہزار

افسوس ہے کہ تلاش کے باوجود نیاز کے حالات اور ان کی نظم و نثر کا کوئی اور نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

(2) قاطع الشرک: مرزا اکبر علی بیگ خاں متخلص بہ گل کا حال شاعر کی حیثیت سے لکھا جا چکا ہے۔ انھوں نے اردو نثر میں بھی ایک کتاب سوا دو سو صفحات سے زائد ضخامت کی لکھی تھی اور اس کا نام قاطع الشرک رکھا تھا۔ اس میں قرآن پاک اور حدیثوں کے حوالے سے شرک کی مذمت اور تردید کی تھی۔

کتاب کا آغاز بسم اللہ وغیرہ سے ہوا ہے، اور ذیل کی عبارت پر اس کا اختتام ہوا ہے:

''دین اور دنیا میں تمھاری بھلائی ہے اور خدا اور رسول ﷺ تمھیں راضی ہوتے
قیامت کے دن اور تم کو بہشت ملے گی، شکر اور احسان پاک پروردگار کا''۔

اس کتاب کے مخطوطہ دہلی کا ترقیمہ یہ ہے:

''راقم کتاب مصنف رسالہ ہذا مرزا اکبر علی خاں متخلص بہ گل ابن نواب رضا علی بیگ خاں مرحوم ولد افتخار الدولہ بہادر نواب محمد بیگ خاں فیروز جنگ ہمدانی، بہ تاریخ ششم شہر ربیع الاول 1257ھ (1841) تمام شد''۔

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا اکبر علی کے والد نواب رضا علی بیگ کا 1257ھ سے پہلے انتقال ہو چکا تھا اور مرزا اکبر علی نے یہ کتاب بھی اس سے پہلے کسی زمانے میں مکمل کر لی تھی۔ یہ مخطوطہ نواب ٹونک کے اردو ذخیرۂ کتب سے خریدا گیا ہے۔ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے۔

حواشی

(الف) اجمیر

صفحہ

1-گلشن بے خار ص187

2-انتخاب دواوین ص264

3-صبح گلشن ص454

4-گلستان سخن جلد1 ص274

5-سخن شعرا ص45

6-تذکرہ شعراء جے پور ص100

7-بمبئی کے اردو مخطوطات ص83

8-تذکرہ مخطوطات جلد4 ص160

9-قاموس الکتب جلد1 ص895

(ب) الور

1-وقائع راجستھان ص362تا368

2-مخطوطات شیرانی جلد2 ص213

3-گلستان سخن جلد1 ص303

4-طبقات شعرائے ہند ص280تا281

(ج) بھرت پور

2-گلستان سخن جلد1 ص523

2-گلستان بے خزاں ص101

3-ایضاً ص244

4-ایضاً ص158,157

5-ایضاً ص282

6-سراپا سخن ص240,57

7-گلستان بے خزاں (ص۱۸۷)

8-راجستھان میں اردو حاشیہ صفحہ 112

(د) ٹونک

1-انتخاب یادگار ص66

2-مخزنہ جاوید جلد۴ ص375

3-دہلی کے اردو مخطوطات ص29

4-ایضاً ص176

5-انتخاب یادگار ص347

6-ایضاً ص297

7-کاملان رام پور ص367

8-دہلی کے اردو مخطوطات ص176,175

9-جائزہ مخطوطات اردو جلد 1 ص942تا945

10-انتخاب یادگار ص298

11-دہلی کے اردو مخطوطات ص146,145

(ہ) جودھپور

1-راجستھان میں اردو ص171,170

(و) جے پور

1-شعرائے جے پور ص3

2-مجموعۂ نغز جلد ا ص362

3-ریاض الفصحا ص173

4-گلستان بے خزاں ص221

5-ایضاً ص255

6-راجستھان میں اردو ص58 تا67

7-تذکرۂ شعرائے جے پور ص397

8-راجستھان میں اردو ص54 تا56

9-دہلی کے مخطوطات ص194 تا195

5-بندیل کھنڈ

(الف) کالپی 405
(ب) باندہ 413

(الف) کالپی غازی الدین خاں 405
1-انور غلام علی 406
2-فرقت عطاء اللہ خان 406
3-عیاش غلام جیلانی خاں 407
4-رشید نواب نصیر الدولہ 406
5-شیدا نواب معین الدین خاں 406
6-بیتاب نواب احمد بخش خان 406
7-شفق محمد سعد الدین خاں 409
8-منتظر نور الاسلام 410
9-حیرت غلام فخر الدین 410
10-قلق میر امجد علی 410
11-شفیق خواجہ نور الدین 411

(1)

غازی الدین خاں عماد الملک ہمہ صفت موصوف اور اپنے وقت کے بے مثال عالم تھے۔ ان کے حالات میں حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے لکھا ہے:

"قطع نظر از ضائع سپاہ گری ولطیفہ گوئی و بذلہ سنجی و بدیہہ خوانی و ہفت زبانی و ہفت قلمی وفقیر پرستی وکشادہ دستی ومعلومات اشغال فقرا واطلاع بر اوراد صلحا وانشا پردازی وسخن طرازی بانواع لاتحصیٰ وحصور علوم شرعیہ ودفور فنون نقلیہ ونیک دینی وخوش اعتقادی وکشادہ رویٔ وخدایادی بالسنہ متعددہ بکمال فصاحت ونہایت بلاغت سخن می گفت"۔ 1

غازی الدین خاں آخر عمر میں گردش زمانہ سے کالپی پہنچے۔ اور وہیں تنگی اور تنگ دستی میں رحلت کی۔ قاسم نے اس سانحہ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"در آخر ہا بہ ثمرۂ نمک حرامی کہ باولی نعمت قدیمی از وے بظہور رسید، آوارۂ دشت ادبار شدہ در چار سوئے عالم حیران وسرگرداں می گشت ودر یکجا قرار نمی گرفت در اسیمہ ایام بسری بُرد، عاقبۃ الامر ناکام ونامقضی المرام در بلدۂ کالپی جاں بجاں بخش سپرد"۔

غازی الدین خاں کی نکتہ سنجی اور سخن فہمی مشہور تھی چنانچہ اس زمانے کے بڑے شاعران کی

تحسین کے متمنی رہتے تھے۔ سید انشاء اللہ خاں کے حال میں مرزا علی لطف نے تحریر کیا ہے کہ:

"سال گذشتہ انھوں نے ایک قصیدہ زبان ریختہ میں غیر منقوط یعنی جن کے اشعار میں کوئی حرف صاحب نقطہ نہیں ہے، نواب عماد الملک کی مدح میں لکھ کر کالپی بھجوایا اور صلے میں اس کے انعام تحسین اور آفرین کا بہت سا پایا"۔ 2

1-انور

نواب غازی الدین خاں کی قدر شناسی کے نتیجہ میں بہت جلد کالپی میں علم و شعر کا چرچا ہو گیا تھا۔ علی ابراہیم خاں خلیل نے ایک شاعر کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"انور غلام علی، از سکنۂ کالپی بودہ از دست 3

سوہنے دہن پہ تیرے جو شرط ہے مسی کی تیرے لبوں کا بوسہ مصری ہے کالپی کی

معلوم ہوتا ہے کہ نواب غازی الدین خاں کے قیام کے نتیجے میں کالپی میں بعض صنعتوں کو بھی فروغ حاصل ہونے لگا تھا اور اس شہر کو بعض اشیا مثلاً مصری کے لیے شہرت مل گئی تھی۔

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کے تذکرے میں کالپی میں آکر سکونت اختیار کرنے والے جن شعراء کا حال تحریر ہے ان میں سے چند کے نام اس طرح ہیں:

الف۔ اظہر غلام محی الدین خلف غلام حسین سروری

ب۔ حیرت غلام محی الدین خاں عرف میر متو

ج۔ عنایت شیخ نظام الدین

2-فرقت

نواب غازی الدین خاں کی اولاد نے اپنی کم بضاعتی کے باوجود اپنے پدر والا قدر کی عمدہ روایتوں کو بحد امکان قائم اور جاری رکھنے کی کوشش کی تھی اور صاحبانِ علم و شعر کی بقدر وسعت سرپرستی کرتے رہے تھے۔ قاسم کے تذکرے میں فرقت تخلص کے ایک شاعر کا حال اس طرح آیا ہے:

"فرقت تخلص، عطاء اللہ خاں است، وے برادر زادہ محمد یعقوب خاں عرف میاں کلو، خواص حضور پُر نور و جوان سعادتمند ارجمند ہوشیار ستودہ طور است، نیا کانش اکثر

بخواصی سلاطین تیموریہ اُنار اللہ برکانہم عز امتیاز داشتند، خودش نیز بیشتر بہ رکاب شہزادگان ایں دودمان عالی شان سفرہا گزیدہ ورنجہا کشیدہ و بہ دیار مغربیہ و جنوبیہ رسیدہ ورا امتہا دیدہ، از چندے بہ رفاقت یکے از فرزندان نواب غفراں مآب وزیر الممالک عماد الملک غازی الدین خاں بہادر بہ نواح کالپی ایام حیات مستعار بسری بُردو گاہ گاہ بطور خود فکر شعری کند، وخیال خودسری در سر دارد و بہ رویہ ایں وقت کہ بہ دیار مشرقیہ رواج یافتہ ہمت می گمارد"۔4

ان کے دو شعر یہ ہیں۔

میرے گھر کے پاس آکر جو وہ بدگمان الٹا — تو ادھر زمین الٹی، اودھر آسمان الٹا

شعلۂ آہ کا ہے کس کے اثر پتھر میں — کہ ہے اس طرح سے پوشیدہ شرر پتھر میں

تذکروں میں غازی الدین خاں عماد الملک کے اور جن بیٹوں کے احوال درج ہیں یہ ہیں:

3-عیاش

ان کا حال قاسم نے اس طور پر تحریر کیا ہے:

"غلام جیلانی خان سلمہ الرحمٰن المعروف بہ میاں بخشو پسر نواب معلا القاب وزیر الممالک عماد الملک غازی الدین خان بہادر عفی اللہ عنہ، وے جوانیست خلیق، شیریں زبان، گرم جوش، عذب البیان، عالی ہمت، والا نہمت، پاکیزہ خلقت، شاگرد قلندر بخش جرات، صید دلہا بہ اخلاق حسن می نماید، بہ شیریں زبانی وہمربانی کس دنا کس را مشتاق لقائے فرخ بقائے خودمی فرماید، با قاسم بیچارہ اس سراپا نقصان در ایام ورود خود حضرت دہلی بہ اشتیاق ہر چہ تمامتر ملاقات نمودہ بہ اشفاق کہ زیادہ از اں متصور نیست الطاف فرمودہ"۔5

ان کے کلام کا انداز ان شعروں سے ظاہر ہے۔

اُمنڈا ہے ابر زور، زمیں سبزہ زار ہے — ساقی جو تو بھی آوے تو کیا بہار ہے

دل میں آتا ہے کہ اب کیجیے ترک اسباب — بے سروپاؤں کو کیا ہے سروسامان سے کام

4-رشید:

نواب غازی الدین خاں کے دوسرے صاحبزادے کا تعارف مصحفی نے اپنے تذکرے میں ان لفظوں میں کرایا ہے:

''نواب نصیر الدولہ رشید تخلص خلف الرشید نواب عماد الدولہ مُعرف غازی الدین خاں مرحوم، جوان مہذب الاخلاق، از مدت مدید در کالپی استقامت دارد، بمقتضائے موزونی طبع کہ موروثی است نظم اشعار فارسی را بسرانجام رسانند''۔6

شیخ مصحفی نے ان کے جتنے اشعار لکھے ہیں۔ سب فارسی میں ہیں۔ ایک مقطع یہ ہے۔

غزل گفتی کہ دُر سُفتی رشیدا تو نام ہند و ایراں تازہ کردی

نواب رشید غالباً اردو میں شعر نہیں کہتے تھے اسی لیے اردو شاعروں کے تذکرے ان کے ذکر سے عموماً خالی ہیں۔

5-شیدا

نواب غازی الدین خاں کے بیٹوں کی اولاد میں بھی بعض لوگ شاعر تھے اور اس حیثیت سے بھی وہ سب کالپی اور مضافات میں موثر حیثیت کے مالک تھے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے مختصراً غازی الدین خاں کے ایک پوتے کا حال اس طرح تحریر کیا ہے:

''شیدا تخلص، نواب معین الدین خاں نبیرۂ نواب غازی الدین خاں مرحوم متخلص بہ نظام کہ جلایل مآثر ایشاں مقرون مع خاص و عام است، بہ کالپی سکونت دارد، گاہ گاہ بہ جہاں آبادی رسد''۔7

ان کے دو شعر یہ ہیں۔

اتنا نازک ہے مزاج اے بت قاتل تیرا کہ نہ پتا نہیں دل کھول کے بسمل تیرا

شمع تک ٹھنڈی اٹھی بزم سے اس کی، پرہم اٹھے تو جل کے اٹھے، بیٹھے تو جل کر بیٹھے

6-بیتاب:

بیتاب کا تعارف محسن نے مختصراً اس طرح کرایا ہے:

''افضل الدولہ، نتظم الملک، نواب احمد بخش خان بہادر مرحوم بیتاب عزیزوں میں
عماد الملک نواب غازی الدین خاں وزیر کے، باشندۂ دہلی، مقیم موضع کندورہ
(کدورہ) ضلع کالپی، صاحب دیوان''۔8

مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نواب ناصر الدولہ بہادر ناصر تخلص ولد وزیر الملک نواب عماد الملک غازی الدین خان بہادر نظام تخلص کے بیٹے اور عماد الملک کے پوتے تھے، بیتاب کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

نہیں ہے آج جو وہ گل غدار پہلو میں　　اچھل رہا ہے دلِ بے قرار پہلو میں
اب اس کی دید کے لالے پڑے ہیں شان خدا　　جو اپنے رہتا تھا لیل ونہار پہلو میں

7۔شفق

جیسا کہ مذکور ہوا بیتاب کے والد نواب ناصر الدولہ بہادر بھی شاعر تھے۔ ناصر تخلص کرتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ ان کا نام اور کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ البتہ بیتاب کے ایک صاحبزادے نے شاعر کی حیثیت سے نام پیدا کیا تھا اور ان کا حال محسن نے اس طرح لکھا ہے:

''شفق، نواب انوار الدولہ سعید الملک محمد سعد الدین خان بہادر صولت جنگ عرف
بھلے صاحب خلف نواب احمد بخش خان بہادر عرف میر منو بیتاب عزیزوں میں نواب
امیر الملک نواب بادنی ضلع کالپی مغفور کے جو اولاد میں نواب غازی الدین خاں کی
ہیں، باشندہ کدورا، صاحب دیوان شاگرد میر امجد علی قلق''۔10

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ان شفق کے نام متعدد خطوط لکھے تھے۔ یہ خود صاحب تصانیف گذرے ہیں، نساخ نے ان کے دیوان کے علاوہ بتایا ہے کہ:

''ان کی ایک چھوٹی سی مثنوی نظر سے گذری''۔11

اس مثنوی کا نام بقول لالا سریرام چشمۂ فیض تھا12۔ ممکن ہے کہ یہ نام تاریخی ہو۔ اس سے 1238 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔

نواب غازی الدین خاں اور ان کے اخلاف عموماً غزل گو تھے۔ بعض نے مثنوی اور قصیدے بھی لکھے تھے۔ ان کے اثر سے کالپی اور اس کے مضافات میں انھیں اصناف کو رواج

حاصل ہوا تھا۔

8-منتظر

باوجودیکہ نواب غازی الدین خاں اوران اخلاف کالپی میں با اختیار اور صاحب اقتدار نہیں تھے۔ان کے قیام کے فیض سے یہ خطہ ارباب علم وشعر کے لیے پُرکشش تھا۔شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرے میں ضمناً لکھا ہے:

''دریں اثنا میاں نورالاسلام منتظر را بہ سبب بیماری سل سفرِ ناگزیر درپیش آمد ....مرزا حیدرعلی گرم بعد وفات میاں منتظر بہ طرف کالپی ہمراہ یکے از دوستاں رفت''۔13

کالپی میں گرم کا قیام مختصر رہا تھا۔وہاں سے وہ دکن گئے اور پھر وہیں رحلت کر گئے۔

9-حیرت

ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ نے مختصراً حیرت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''حیرت تخلص، غلام فخرالدین نبیرۂ میر متو ولد اعتمادالدولہ قمرالدین خاں مقیم کالپی، فارسی بھی کہتے تھے''۔14

ان کے مزید حالات معلوم نہیں ہو سکے،ان کے اردو کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہم اس بزم سے یوں پُر ارمان نکلے　　جوانی میں جس طرح سے جان نکلے

یہ ستم دیکھوں کن آنکھوں سے میں اے غیرت عشق　　ایک عالم اسی کوچے کا تماشائی ہے

10-قلق

اس دیار کے مسلّم الثبوت استادوں میں سے تھے،محسن نے ان کے حالات میں لکھا ہے:

''میر امجد علی قلق ولد میر محمد علی، مولد ان کا لکھنؤ مسکن کدورا توابع کالپی، جاگیر نواب امیر الملک، ان کے بہت شاگرد، اپنے عہد کے اس موضع میں استاد ہیں، صاحب دیوان شاگرد فخرالملک نواب میر متو بیتاب''15

ان کے کچھ شعر یہ ہیں۔

ہجوم آپ کے در پر ہے دادخواہوں کا　　ستم تو دیکھیے ان شرگیں نگاہوں کا

کاہ کی طرح سے کاہیدہ اگرچہ ہے قلق　　غم سلامت ہے تو کچھ اور بھی لاغر ہوگا

بے ہوشی میں کیا اس کو کہا تھا جو قلق آہ　　کہتا ہے کہ بند اب تو رکھو ہوش میں منہ کو
اے ضعف اب تو اتنی بھی طاقت نہیں رہی　　مانگوں خدا سے وصل صنم کو اٹھا کے ہاتھ

ان میں سے دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیرانہ سالی میں پریشان حالی میں بسر کرتے تھے۔

محسن نے ان کے بہت شاگرد بتائے ہیں لیکن ایک دو سے زیادہ کا حال نہیں لکھا ہے۔

11-شفیق

یہ شفیق نواب بیتاب کے فرزند اور میر قلق کے شاگرد تھے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

''شفیق تخلص، خواجہ نورالدین خاں عرف سانولے صاحب برادر سعیدالدین خاں شفق شاگرد امجد علی قلق''۔16

سید محسن موسوی نے ان سے متعلق زیادہ معلومات قلمبند کی ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

''نواب خواجہ نورالدین خاں عرف سانولے صاحب شفیق، برادر حقیقی نواب محمد سعدالدین خاں شفق کہ حال ان کا تحریر ہو چکا ہے، خلف نواب احمد بخش خان بہادر بیتاب عزیزوں میں نواب امیر الملک کے، باشندۂ موضع کدورا ضلع کالپی، صاحب دیوان، شاگرد رشید امجد علی قلق''۔

ان کے دو شعر نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں۔

کندن سا دمکنے لگا وہ پھول سا چہرہ　　کی مے نے اترتے ہی یہ تاثیر گلے میں
محشر میں سر اٹھا نہیں سکتے ہیں شرم سے　　ہے شرم اے شفیق ہماری خدا کے ہاتھ

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کالپی اور اس کے مضافات میں نواب غازی الدین خاں عمادالملک کے اخلاف ہی موثر اور موثر حیثیت کے مالک تھے، اس علاقے کا علمی اور شعری ماحول انھیں کی پسند اور مزاج کے مطابق ڈھلتا رہا تھا، شروع زمانے میں اس خطے میں جرأت اور انشا وغیرہ کے اثرات بھی مرتب ہوئے تھے لیکن بعد میں مختلف وجوہ سے یہاں کی شعر گوئی کا انداز کم وبیش وہی ہو چلا تھا جو کانپور میں تھا۔ اس علاقے کی مقبول ترین صنفِ شاعری غزل ہی تھی، تاریخیں بھی کچھ کہی گئی تھیں اور بعض شاعروں نے مثنوی اور قصیدے کی طرف بھی کسی حد تک توجہ کی تھی لیکن ان اصناف میں کوئی وقیع تخلیق وجود میں نہیں آسکی تھی۔

حواشی

	صفحہ
1- مجموعۂ نغز جلد، 2	ص277
2- گلشن ہند	ص41
3- ایضاً	ص40
4- مجموعۂ نغز، ج2	ص47
5- ایضاج2	ص22
6- ریاض الفصحا	ص98
7- گلشن بے خار	ص115
8- سراپا سخن	ص245
9- گلستان سخن	ص249
10- سراپا سخن	ص277,199وغیرہ
11- سخن شعرا	ص248
12- خم خانۂ جاوید جلد5	ص6
13- ریاض الفصحا	ص2
14- سخن شعرا	ص145
15- سراپا سخن	ص189,225
16- سخن شعرا	ص250
17- سراپا سخن	ص225,162

(ب) باندہ

1-شاعری 415

(1)

1-علی بہادر اول 415
2-شمشیر بہادر ثانی 416
3-ذوالفقار علی بہادر 416
4-شہید مولوی غلام امام 417
5-راغب مرزا مجی جان 418

(2)

1-علی بہادر ثانی 418
2-رنگین سعادت یار خاں 419
3-شہید مولوی غلام امام 435
4-صادق 436
5-اخگر احمد نور خاں 436
6-نوازش آغا نوازش 437

2-نثر 441

1-رنگین سعادت یار خان 441
2-سخاوت علی 445

حواشی 447

شاعری

(1)

مشہور بُندیلہ راجا چھتر سال نے مرنے سے پہلے اپنے علاقے کو جو "بندیل کھنڈ" کہلاتا تھا تین حصوں میں تقسیم کر کے دو حصے اپنے دونوں بیٹوں کو دے دیے اور اور تیسرا حصہ اپنے منہ بولے بیٹے اور داماد مرہٹہ سردار باجی راؤ پیشوا کے حوالہ کر دیا تھا۔ مگر اس کے مرنے کے بعد آپس میں خانہ جنگی ہو کر رہی۔ پیشوا کا ایک بھائی مشرف بہ اسلام ہو کر شمشیر بہادر کے لقب سے معروف ہوا تھا، اس کے بیٹے علی بہادر نے پیشوا کی ایما سے فوج کشی کر کے بُندیل کھنڈ کے پورے علاقے کو فتح کر لیا۔ اور اسے پیشوا کے حوالہ کر دیا۔ پیشوا نے اسے نواب کے خطاب سے عزت بخشی اور باندہ کا خطہ اس کو عنایت کر دیا۔ اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔

1- نواب علی بہادر جری اور حوصلہ مند شخص تھا، کہتے ہیں کہ اسی نے غلام قادر روہیلہ کو گرفتار کر کے نابینا بادشاہ شاہ عالم ثانی کی خدمت میں پیش کر دیا تھا اور اس طرح دہلی کے ساتھ خوشگوار روابط کے لیے فضا کو ہموار کر دیا تھا۔ نواب علی بہادر کے ساتھ باندہ میں مرہٹوں کی سپاہ وغیرہ بھی رہتی تھی۔ خود نواب کی ایک شادی آگرہ کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان سب حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شہر کی بول چال شمال اور جنوب کی کئی مختلف بولیوں مثلاً کھڑی، برج، بُندیلی اور مرہٹی وغیرہ کا آمیختہ بن گئی تھی۔

2- نواب علی بہادر کی وفات کے بعد 1802 میں ان کے بڑے بیٹے شمشیر بہادر ثانی کے لقب سے مسند نشیں ہوئے۔ ان کا تعلق مرہٹواڑے سے تھا۔ اس لیے ان کے زمانے میں باندہ کی بول چال پر مرہٹی زبان کا اثر زیادہ ہونے لگا تھا۔

نواب شمشیر بہادر ثانی کی مسند نشینی کو ابھی مشکل سے ایک سال گذرا تھا کہ انگریزی افواج کے مقابلے میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی اور تاوان کے طور پر انھیں بندیل کھنڈ کا پورا علاقہ انگریزوں کے حوالہ کرنا پڑا۔ انھوں نے دریائے کین کے مشرقی علاقے باندہ، کالپی، کونچ، جلال پور وغیرہ کو ملا کر بندیل کھنڈ کو ایک ضلع کی صورت دے دی جس کا صدر مقام باندہ مقرر ہوا۔ نواب کے قبضے میں محض ان کی ذاتی جاگیر املاک اور محلات رہ گئے تھے اور وہ انگریزی سرکار کے وظیفہ خوار بن کر رہ گئے، ان کی جاگیر سے متعلق سارا کام کاج مرہٹی زبان میں ہوتا تھا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ نواب شمشیر بہادر کے زمانے میں فارسی اور اردو نظم ونثر کے فروغ کے لیے زیادہ مواقع نہیں رہ گئے تھے۔ انفرادی کاوشیں جو ہوئی ہوں گی ان کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔

3- شمشیر بہادر ثانی 1238ھ (1823) میں لاولد فوت ہوئے۔ ان کے بعد ان کے مختلف البطن بھائی نواب ذوالفقار علی بہادر مسند نشیں ہوئے۔ ان کی والدہ آگرہ کی رہنے والی ایک علم دوست اور معزز خاتون تھیں۔ انھوں نے سعادت یار خاں رنگین کے ساتھ سلوک کیے تھے، چنانچہ ان کی وفات سے متعلق رنگین نے جو قطعہ تاریخ کہا تھا، اُس کا مذکور اس طرح ملتا ہے:

"قطعہ تاریخ وفات والدۂ نواب ذوالفقار بہادر در شہر باندہ و شعر

<u>در بخارائے ہے</u>"[1]

1246ھ

ڈاکٹر صابر علی خاں کی کتاب میں کلمہ 'ہائے' مکرر لکھا ہے، اسے سہوِ کتابت خیال کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس صورت میں اس سے 1247 کے عدد برآمد ہوں گے۔

اِس خاتون نے اپنے بیٹے کی تعلیم وتربیت کا اہتمام اسی اطراف کے طور طریقے کے مطابق کیا تھا۔ چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ نواب ذوالفقار بہادر نہ صرف فارسی سے بہت اچھی طرح سے واقف تھے بلکہ فارسی شاعری کی اپنے وسائل کی حد تک سرپرستی بھی کرتے رہتے تھے۔ اپنے

زمانے میں انھوں نے مختلف مراکز سے صاحبان علم وفضیلت کو طلب کر کے باندہ میں ان کی قدر افزائی کی تھی۔ صالحہ بیگم قریشی نے اس سلسلے میں درج ذیل علما کے نام تحریر کیے ہیں:

''مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور مولانا خرم علی بلہوری''۔2

4-شہید

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے اپنے پہلے تذکرے میں مولوی غلام امام شہید کا حال اس طرح درج کیا ہے:

''ہر اقسام کے اشعار میں ان کو کمال حاصل ہے اور مختلف انواع اسالیب نثر میں یہ عدیم المثال ہیں۔ یہ اس زبردست قصیدہ کی جو انھوں نے ضلع باندہ میں مستعدوں اور شاعروں کے معرکے کے موقع پر نواب ذوالفقار بہادر کی مدح میں کہا تھا اور جس میں بہت سی صنعتیں استعمال کی تھیں۔ جملہ کاملان سخن اور واقفان فن کی طرف سے بہت تعریف وتوصیف ہوئی تھی جو ان کے علوے مرتبہ اور کمال فن پر شاہد ہے''۔3

اس اقتباس سے کئی قابل توجہ حقائق سامنے آتے ہیں یعنی:

(الف) اس زمانے میں باندے میں متعدد ایسے شاعر موجود تھے، جو مدعی کمال تھے۔

(ب) ''مستعدوں اور شاعروں کے مابین'' اس شہر میں معرکے ہوتے رہتے تھے۔ اور

(ج) ان معرکوں میں نواب ذوالفقار بہادر کی حیثیت حکم کی ہوتی تھی۔

(د) باندہ کے ان معرکوں میں دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ قصیدے بھی پڑھے جاتے تھے۔

کلب حسین خاں نادر نے جس قصیدہ کا ذکر کیا ہے وہ فارسی زبان میں ہے۔ اس میں غلام امام شہید نے ایک ایک صنعت میں کئی کئی شعر کہے تھے۔ اور کچھ شک نہیں کہ وہ قصیدہ ان کی قادر الکلامی کا عمدہ مظہر ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر اس کے صرف دو شعر لکھے جاتے ہیں:

تجنیس تام

ہزاراں زاں رخ گلگوں، ہزاراں آرزو دارند　　زحسرت زار نالد در چمن زارش گل خنداں

غیر منقوط

رسا مس طارم اسلام وعدل علم راحامل سوار ادہم اکرام وحلم وحملہ را سلطاں

5-راغب

غلام امام شہید کے علاوہ ایک اور فارسی گو شاعر کا احوال نادر نے اس طور پر قلمبند کیا ہے:

"راغب ان کا نام مرزا مہی جان ہے، یہ بزرگ اگرچہ اپنے جاگیر کے انتظام کے سلسلے میں باندہ ضلع میں مقیم رہتے ہیں، مفتی سید کرامت علی اور اس ضلع کے صدر امین مولوی عدالت صاحب کے ساتھ قرابت کی وجہ سے کبھی کبھی اس شہر (الہ آباد) میں بھی آجاتے ہیں"4 ان کے شعروں کی خوبی ایسی نہیں تھی، کہ اس رسالہ کو اس سے خالی رہنے دیتا، ان کا ایک شعر جو یاد تھا یہ ہے۔

نفس لعل ستم است چوافتاد بہ خاک ماہ نومبر فلک از دور تماشا می کرد

شہید اور راغب جیسے فارسی گو شاعروں کی موجودگی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ اس زمانے میں باندہ میں فارسی شاعری کا بھی چلن ہو گیا تھا اور نواب ذوالفقار بہادر ذاتی طور پر اس کی سرپرستی کرتے رہتے تھے۔

(2)

باندہ کے علاقے میں اردو نظم ونثر کی روایت کچھ قدیم نہیں تھی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے ناسازگار ہونے کے باوجود اس شہر کے اشراف اردو فارسی سے دلچسپی رکھتے تھے، اور اس طرح نظم ونثر کے لیے کسی نہ کسی طور پر فضا موجود تھی۔ ضرورت صرف ایک تحریک کی تھی اور وہ تحریک نواب ذوالفقار بہادر کے لیے مقدر تھی۔

1-علی

نواب ذوالفقار بہادر خود تو شاعر نہیں تھے لیکن ان کی مذہب پسندی اور ادب دوستی کا اثر ان کے گھریلو ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ اس میں نواب کی والدہ کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ ان کے صاحبزادے علی بہادر حافظ قرآن بھی ہوئے اور شاعر بھی، چنانچہ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''علی حافظ قرآن، عالی دودمان، رئیس باندہ، اشرف الامرا نواب علی بہادر ولد نواب ذوالفقار بہادر ملقب بہ پیشوا صاحب دیوان دشتوی مہر و ماہ شاگرد مشی منیر''۔5

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب ذوالفقار بہادر اپنی قدیمی خاندانی روایات کے مطابق ''پیشوا'' کہلاتے تھے اور اس طرح اسلام قبول کر لینے کے باوجود مرہٹوں سے انھوں نے اپنے رابطے کو کسی نہ کسی طور پر قائم اور باقی رکھا تھا۔ ماضی سے رابطے کا اس خاندان میں رجحان آخر تک رہا ہے چنانچہ یہ بات ان کے ناموں سے بھی ظاہر ہے۔ ذوالفقار بہادر نے اپنے بیٹے کا نام علی بہادر رکھا تھا، اور پھر اس نے بھی اپنے بیٹوں کے نام شمشیر بہادر اور ذوالفقار بہادر رکھے تھے۔ یہ علی بہادر ثانی اپنے نام کی مناسبت سے علی تخلص کرتے تھے۔ ان کے دو شعر نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

قلق نہیں جو غم بے شمار دل میں ہے — ہزار بھیڑ ہو، پر جائے یار دل میں ہے
کدورت آئینہ صاف کی چھپے کیوں کر — عیاں ہے منہ سے صفائی غبار دل میں ہے

2- رنگین

نواب ذوالفقار بہادر کے عہد کی سب سے اہم علمی ادبی شخصیت سعادت یار خان رنگین کی تھی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ان کے حالات اس طرح قلمبند کیے ہیں:

''رنگین تخلص، سعادت یار خان خلف محکم الدولہ طہماسپ بیگ خاں لختے از فنون سپاہگری آگاہ است، اکثر بلاد را بہ گام سیاحت پیمودہ، در ایام جوانی عشقہا ورزیدہ، مرد خوش صحبت و خوش اختلاط است، با پیرانہ سالی ظریف الطبع تمیز شاہ حاتم است، چند دیوان با اصناف سخن نظم کردہ، و آنرا در مجلدے فراہم آوردہ نورتن نام کردہ، چوں دواوین دیگر مبنی بر ہزل و بختی وغیرہ است، کہ امرا و آن بایں ذخیرہ نمی سازد، بنابر آن از دیوان ریختہ و بختہ بہ وقت تمام ایں ابیات گزیدہ شد۔ بعد بہ پایاں آمدن ایں تذکرہ بہ سر آمد و کان ذالک فی شہر جمادی الثانی سنہ ہزار و دو صد و پنجاہ و یک، ہشتاد سال زندگانی کرد، واز غرایب امور آنکہ ی گفت دریں سال رخت بہ عدم آبادی کشم، چوں سبب پرسیدہ آمد، گفت سالہا است کہ بے خواست مصرع تاریخ فوت خود بر

زبان آمدہ کہ دریں سال از آنجہانی شدنِ من خبری دہد وقصہ شاہ حاتم کہ شاعر مشہور است
واستاد او بود نقل کرد کہ ہمبریں نمط ایشاں را اتفاق افتاد، خلاصہ بخناں دیدہ شد"۔6

سعادت یار خاں رنگین جہاں گشت آدمی تھے، آخر عمر میں 1243ھ (1827-28) میں باندہ پہنچے لیکن غور کریں تو ان کی تصنیفی زندگی کا سب سے اہم زمانہ یہی تھا۔ یہاں انھوں نے نثر اور نظم میں کئی مفید اور قابل قدر کام کیے۔ باندہ میں اپنے پہنچنے کا حال انھوں نے جنگ نامہ میں نظم کیا ہے اس طرح۔

میں اک جا پہ دل کو لگاتا نہیں — مجھے رہنا اک جا کا بھاتا نہیں
پر اب ہاتھ سے ہے مرا بس گیا — کہ باندے میں ہوں آن کر پھنس گیا
یہاں کا ہے نوّاب یک طرفہ چیز — نہایت وہ رکھتا ہے مجھکو عزیز
مصاحب ہیں وہ اس کے جتنے رفیق — وہ سب جان ودل سے ہیں میرے شفیق
خصوص ان میں ہے ایک شمشیر خاں — کہ میں جن کی خاطر ہوں رہتا یہاں
میں الفت میں ان کی گرفتار ہوں — نکلنے نہیں پاتا ناچار ہوں
برس دو سے اس جا پہ پابند ہوں — میں پابند ہوں لیک خورسند ہوں

شہر باندہ میں اپنی آمد سے متعلق سعادت یار خاں رنگین کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

کہ باندہ کے شہر میں جو ہوں آیا — مجھے شمشیر خاں نے ہے بلایا

اپنی جوانی میں رنگین سپاہی پیشہ تھے اور مدت تک مرہٹوں کے لشکر میں رہے تھے۔ وہ مرہٹی زبان سے بھی کسی حد تک واقف تھے اور اُس میں بھی شعر کہہ لیتے تھے۔ بخوبی ممکن ہے کہ مرہٹوں ہی کے کسی لشکر میں ان کی شمشیر خاں سے ملاقات ہوئی ہو اور پھر اس ملاقات نے دوستی کی صورت اختیار کر لی ہو، رنگین ہر فن مولا تھے، وہ گھوڑوں کی شناخت معالجہ اور سواری وغیرہ میں باکمال تھے، سپاہی تھے اور اعلیٰ درجے کے مصاحب بھی تھے۔ ضروری نہیں ہے کہ شمشیر خاں سے ان کی دوستی کی بنیاد شاعری ہی رہی ہو اور اسی حیثیت سے ان کو باندہ میں بلایا گیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ شمشیر خاں ان کے اس کمال سے بھی بہت متاثر تھے۔ چنانچہ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

رنگین کے قیام کے فیض سے باندہ میں شعر وشاعری کا ماحول پیدا ہو گیا تھا اور بخوبی ممکن ہے

کہ اس شہر کے بعض نو مشق ان سے استفادہ کرنے لگے ہوں۔ اپنی شعری فتوحات کا بیان رنگین نے اس طرح کیا ہے:

"گفتن شعر بدانست بندہ بست و ہفت قسم است چنانچہ بندہ آں بست و ہفت قسم را نظم کردہ گاہے دیدہ و شنیدہ نہ شدہ کہ از ابتدائے خلقت شعر کہ عرصہ دو ہزار سال گذشتہ شد کسے تا امروز سوائے حضرت امیر خسرو دہلوی پانزدہ قسم را ہم ازاں جملہ بست و ہفت قسم نظم کردہ باشد، اگر کلیات بندہ را کسے تکلیف کشید تمام و کمال مطالعہ کند یقین کہ بہ افراط آں بست و ہفت قسم را بہ یابد، ایں نوشتہ صرف برائے شان شوکتِ خود نہ نوشتہ ام بلکہ ادائے شکر حق جل شانہ ادای نمایم کہ ہم چو من بے سر و مال را ایں نعمت عطا کردہ کہ بہ کسے مرحمت نہ فرمودہ بموجب ایں تفصیل:

قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، سلام، غزل، رباعی، قطعہ، فرد، تاریخ، پہیلی، واسوخت، منقبت، کبت، دوہرہ، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس، مربع، مثلث، بحر طویل، مستزاد، ملمعہ، صنائع، بدایع، تضمین، قطعہ بند، شہر آشوب۔

و در ہفدہ زبان دیوان نظم کردہ، نام آں مجموعہ رنگین نہادہ ام، در ہفدہ زبان ہم کسے شعر نہ گفتہ آں دیوان مجموعہ رنگین اگر کسے مطالعہ کند امتحاں کند، بموجب ایں تفصیل:

عربی، ترکی، فارسی، پشتو، ہندی، مارواڑی، بھاکا، پوربی، دکھنی، ہنزل، برج، ہندی فرنگی، ہندیِ کشمیری نو آمدہ، ہندیِ افغاں بچہ ہا، پنجابی کھترانی ہا، اردوے بیگمات، پنجابی پچادہ ہا یعنی دہقانی، نیز در یازدہ بحر بہ قدر چہل و دو مثنوی کہ بقدر بیست ہزار شعر دارند نظم کردہ ام در تصوف و ظرافت و معاد و معاش و علم مجلس و خطوط نویسی، کسے در یازدہ بحر مثنوی با ہم نہ گفتہ مگر حضرت جامی در ہفت بحر مثنوی گفتہ اند، دیگرے دو ہفت بحر ہم نہ گفتہ، پانصد شش حکایت عجیب عجیب نظم کردہ ام"۔[7]

رنگین جیسے باکمال کی اقامت کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اہل باندہ کے سامنے اردو شاعری کی زیادہ سے زیادہ صورتوں اور قسموں کے نمونے آ گئے تھے۔ اور اس طرح ہر شاعر کے لیے موقع تھا کہ وہ

اپنی صلاحیت، لیاقت اور پسند کے مطابق جس نوع کے چاہے شعر کہہ لے۔

سعادت یار خاں رنگین کے کمالوں میں تو شبہ نہیں لیکن ان کے ساتھ محرومیاں بھی دو طرح کی تھیں:

(الف) ان کی ساری تخلیقات کے مطالعے کے لیے جس ذوق وشوق اور فرصت کی ضرورت تھی وہ ہر شخص کو میسر نہیں تھی، پھر ان سب کو کما حقہ سمجھنے کے لیے کم سے کم سترہ زبانوں سے واقفیت اور مختلف علوم وفنون سے کسی قدر آگاہی بھی درکار تھی اور اس درجہ کی لیاقت کمیاب ضرور تھی۔

(ب) تجارت اور سپہ گری میں جاں فشانی کے بعد وہ بالآخر دنیا کے معاملات سے بیزار ہو گئے تھے، جنگ نامے میں کہتے ہیں۔

یہ سُن دل سے میں دیا سب چھوڑ　　لیا ساری ثروت سے منہ اپنا موڑ
برس تیس اس پر گئے ہیں گذر　　نہیں حشمت وجاہ وہ دھیان پر

اور آخر عمر میں تو وہ باندے کے ''نواب بے ملک'' کے ایک مصاحب کی رفاقت میں بسر کر رہے تھے، گویا تنگ دستی اور مفلسی ان کا مقدر بن گئی تھیں جس کا قدرتی نتیجہ بے قدری اور گمنامی کے سوا کچھ نہیں تھا وہ دلی یا لکھنؤ میں رہے ہوتے تو شاید کچھ اور صورت ہوتی۔

سید انشاء اللہ خاں انشاء سے رنگین کی دوستی تھی اور یہ دوستی اس طرح کام آئی کہ یہ اکثر اہل تذکرہ کے خیال میں سید انشاء کے بخ بن کر رہ گئے تھے، مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات میں سید انشاء کے احوال میں محض ضمناً ان کا ذکر آ گیا ہے۔ خود ان کے احوال پر دو چار ورق بھی سیاہ کرنا گوارا نہ ہوا اور تو اور پروفیسر گیان چند جنھوں نے شمالی ہند کی اردو مثنویوں سے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالنے کا فخر حاصل کر لیا ہے رنگین کی علمی کارکردگی کی داد اس طرح دیتے ہیں:

''رنگین کی تمام مثنویوں کا تعارف تفصیلی اطناب بے جا اور بے لطفی کا باعث ہوگا، ڈاکٹر صابر علی خاں کی کتاب سعادت یار خاں رنگین میں ان سب کی تفصیلات درج ہیں''۔[8]

جب خود میاں رنگین کے ساتھ یہ معاملہ ہو تو باندہ کے بے چارے شاعروں وغیرہ کی کارکردگیوں کو پوچھنے والا بھلا کون ہوتا۔

سعادت یار خاں رنگین کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کے کلام کی تشہیر بھی جیسی کہ چاہیے تھی نہیں ہوئی۔ فرس نامہ وغیرہ چند مفید تحریروں کی ضرور بعض اہل شوق ضرورت مندوں نے نقل تیار کرلی یا کروالی تھی۔ ورنہ ان کے کلام نظم ونثر کا بیشتر حصہ خود شاعر ہی کی تحویل میں رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے:

''انھوں (رنگین) نے باندے کے قیام کی فرصت کو غنیمت جانا اور سارے کلام نظم ونثر کو مرتب کرنا شروع کر دیا، انڈیا آفس لائبریری میں جہاں رنگین کے کلام کا بیشتر حصہ محفوظ ہے زیادہ تر نسخے ان کے اپنے ہاتھ کے، باندے میں لکھے ہوئے، موجود ہیں، اس کام سے فارغ ہوئے کہ 1251ھ (1835) میں پیام اجل آپہنچا اپنی عمر کے آخری چھ سال کے حالات انھوں نے بہت کم لکھے ہیں''۔

بات فرصت کی نہیں تھی۔ مجبوری اور کسمپرسی تھی، جس نے ان سے یہ کام لے لیا تھا۔ انھوں نے سید انشا کا حشر دیکھا تھا۔ پھر خود پر جو گزر رہی تھی اسے بھی دیکھ رہے تھے۔ ساری عمر کی کمائی ان کے یہی دواوین وغیرہ تھے۔ اس دولت کے ضائع ہونے کا بڑا قلق ہوتا۔ مرنے سے پہلے چاہا کہ اسے سلیقے سے صاف کر کے کاغذ کی تحویل میں دے دیں جہاں تک ہوسکا پرانے نوشتوں میں ترمیم واضافے بھی کیے اور جو صاف کر سکے انھیں کر گئے اور پروفیسر گیان چند کو یہ شکوہ کرنے کا موقع دیے گئے کہ:

''ایک ہی مثنوی کے مختلف نسخوں میں اشعار کی تعداد میں کمی بیشی پائی جاتی ہے''۔

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے سچ کی بات کہی ہے کہ:

''شاہنامہ اب بھی اہل کمال اس زمانے میں کہہ سکتے ہیں مگر محمود سا قدرداں کوئی نہیں''۔10

میاں رنگین کی قدر کرنے والا کون تھا، ان سے تو شاید کوئی یہ کہنے والا بھی نہ ہوا کہ اپنا فلاں دیوان ہمارے لیے نقل کر دو۔ ان کی مایوسیوں کا کیا ٹھکانہ تھا۔ لیکن ایک بیدرد، خدابیزار، وطن فراموش، نکمے کے غلام نے ان کی مثنویوں کے بارے میں اس انداز سے تبصرے کیے ہیں:

''ان کا شہر آشوب بھی روایات کے برعکس معاشی شعور کا آئینہ دار نہیں بلکہ دنیا کے

دھندوں پر لات مار کے خدا سے لو لگانے کی تلقین کرتا ہے"۔

باندہ کے قیام کے زمانہ میں پیرانہ سالی کے باوجود رنگین کا قلم خاصی تیزی سے چلتا رہا، انھوں نے اس زمانے میں کئی قابل قدر چیزیں لکھیں۔ یہاں ان میں سے صرف بعض کا مختصراً تعارف کرایا جاتا ہے۔

(1) قوت الایمان: یہ کوئی دوسو شعروں کی ایک مختصر مثنوی ہے جس میں رنگین نے اپنے عقیدے سے متعلق مختلف کتابوں سے ان مسائل کو جمع کر کے نظم کیا ہے جن کا جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے، شروع میں چار خلفاء کا ذکر کیا ہے اس طرح۔

پہلا خلیفہ تھا ابوبکرؓ جان — دوسرا بے شک تھا عمرؓ اس کو مان
تیسرا عثمانؓ تھا چوتھا علیؓ — ایک سے تھی ایک کی خصلت بھلی
تیس برس بعد پیغمبر کے یار — طور خلافت کا رہا بر قرار
بعد جو کچھ کچھ خلل آنے لگا — بند بندھا جو تھا وہ جانے لگا

اس قسم کے احوال کے بیان کے بعد خدا، فرشتے، قیامت، پیغمبر، شرع محمدیہ، انبیا، اولیا، اور صالحین وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے اور پھر نماز اور حلال وحرام وغیرہ کے مسائل سے بحث کی ہے۔ شاعر نے اپنی اس مثنوی کی تاریخ اس طرح نظم کی ہے۔

بولا وہ، تصنیف عجائب ہے یہ — کہہ تو یہ تاریخ غرائب ہے یہ

1243ھ

(2) جنگ نامۂ رنگین: یہ اردو کی گنی چنی رزمیہ مثنویوں میں سے ایک ہے۔ اس میں رنگین نے جنگ پاٹن کے واقعات نظم کیے ہیں، جس میں وہ خود مغلوں کی طرف سے شریک رہے تھے، یہ جنگ 1202ھ (1788) میں مغلوں اور مرہٹوں کے درمیان ہوئی تھی۔ آغاز ان شعروں سے ہوتا ہے۔

پس از حمد حق اور نعتِ رسولؐ — مری عرض یارو یہ کرنا قبول
کہ ہو جنگ نامہ جو یہ پڑھ کے شاد — کرو فاتحہ خیر سے مجھ کو یاد
تم اک مجھ سے نادر روایت سنو — مری آنکھ دیکھی حکایت سنو

نواب اسماعیل خاں ایک صاحب حوصلہ رئیس تھا جس نے نجف گڑھ سے بیکانیر تک کے علاقے کو فتح کرلیا تھا۔

سن ہجری بارہ سو اور دو تھے یار　　کہ ہریانے مین فوج تھی بے شمار
اسماعیل خاں مرد ہشیار تھا　　وہ ہم سارے مغلوں کا سردار تھا

اس کے یہاں یہ گفتگو ہوئی کہ ہندوستان میں مرہٹوں کا زور بہت ہوگیا ہے۔ان کے پاس ملک کی بہت فوج ہے اور انھیں بادشاہ کی بھی حمایت حاصل ہے۔اگر بادشاہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھے تو ہم مرہٹوں سے پونا بھی چھین لیں،غرض مشورے کے بعد ایک عرضی گل محمد کے ہاتھ بھیجی گئی۔ بادشاہ نے کہا کہ نواب کو سودا ہوا ہے۔ایسا کرے گا تو خراب ہوگا البتہ اگر سب راجے مدد کریں تو نواب کامیاب ہوسکتا ہے....جودھپور سے بیکانیر تک سب راجے نواب کے ساتھ ہوگئے اور بڑا لشکر تیار ہوگیا۔

گنا سب کو جب تب پیادے سوار　　ہوئے سارے دولاکھ کتنے ہزار

یہ لشکر جرار پاٹن کے مقام پر پہنچا،طے پایا کہ اسی جگہ پر جنگ کریں گے کیوں کہ

یہ پاٹن جو ہے سب ہی راجوں کا جی　　ہے سرحد ہمارے بھی یہ ملک کی

مرہٹہ سردار سیندھیا بندرابن میں تھا۔اس نے سنا تو بہت غضبناک ہوا اور مقابلے کے لیے اپنا لشکر روانہ کردیا۔اس کے ساتھ ایک فرانسیسی سردار ڈبائے بھی تھا۔

ڈبائے فرنگی فرانسیسی تھا　　ہیں انگریز انیس تو وہ بیس تھا

مرہٹہ فوج سب ملاکر تین لاکھ ہوگئی،6 شوال لڑائی کا دن مقرر ہوا۔لڑائی کا نقشہ کھینچا اور فرنگی ڈبائے نے اپنی چال بازی سے خوب کام لیا۔رنگین نے پہلے اپنی فوج کی یلغار کا بیان کیا ہے اور پھر مخالف سمت کے حملوں کا ذکر کیا ہے۔

کڑک بخش کا کنپو اک تھا نجیب　　وہ پہنچا ڈبائے کے جاکر قریب
ڈبائے جو اس پر چلا کچکچا　　تو وہ کنپو یک لخت اٹھا بلبلا
یہ کہہ بھیجا نواب سے پھر شتاب　　کہ لیجے خبر اب نہیں ہم میں تاب

نواب ہاتھی پر سوار ہوکر سواروں کے ساتھ آیا اور ڈبائے کے کنپو کو پیچھے ڈھکیل دیا۔

مرے بے شمار ان کے جتنے جوان　　شہادت کو نصف اُن سے پہنچے یہاں

صورت حال یہ ہوئی کہ مرہٹے ہوشیاری سے پیچھے ہٹنے لگے۔ نواب کے سوار ان کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھے، جب چار کوس نکل گئے تو اچانک مرہٹوں نے ان کو گھیر لیا۔ مرہٹوں نے نواب کے لشکر میں یہ خبر پہنچادی کہ تمھارا نواب مارا گیا۔ اب تم روپیے لے کر ہمارے نوکر ہو جاؤ۔ غرض اس طرح نواب کے لشکر کو توڑ دیا۔ نواب اپنے ساتھیوں کے ساتھ لڑتے رہے۔

ہم ایک رات دن جنگ کرتے رہے　　رہے مارتے اور مرتے رہے
نہ آئے وہ گنتی میں جتنے موئے　　بتاؤں تمھیں کیا کہ کتنے موئے
کیا اس طرف کا جو ہم نے شمار　　شہید اس طرف کے ہوئے پانچ ہزار

آخر نواب کو جب اپنے لشکر کا حال معلوم ہوا تو سر پیٹ لیا۔ صرف آٹھ سو سپاہی بچے تھے۔ آدھی رات کو اندھیرے میں فرار ہوئے، کسی طرح جے پور پہنچے، وہاں کے راجا نے حوصلہ بڑھایا، تمام سامان فراہم کیا اور کہا کہ جودھپور میں راٹھور راجا کے پاس جاؤ وہ تمھارے ساتھ لڑ کر مرہٹوں کو ضرور شکست دے دے گا۔ اس واقعہ کے بعد رنگین نواب کی ملازمت چھوڑ کر بھرت پور آ گئے۔

شفیق اپنا راجا کو پہچان کے　　بھرت پور میں نوکر ہوئے آن کے

اس کے بعد کی داستان رنگین کی شنیدہ ہے کہ جودھپور کے راجا نے نواب کی طرف التفات نہیں کیا۔ مجبوراً نواب بھیلواڑے کی طرف چلے گئے۔

رنگین دو برس تک بھرت پور میں رہے۔ پھر لکھنؤ مرشد آباد اور بنگالے میں قیام کرتے ہوئے مرہٹوں کی عملداری میں پہنچ گئے، کھنڈوجی مرہٹہ سردار نے ان کی قدر کی۔ علاقہ اور فوج وغیرہ دے کر انھیں نواب بنادیا لیکن رنگین کی طبیعت دنیا سے اچاٹ ہو گئی تھی اور انھوں نے

لیا ساری ثروت سے منہ اپنا موڑ

بالآخر شمشیر خاں کی دوستی کی وجہ سے وہ باندہ میں آ کر مقیم ہو گئے اور یہاں یہ جنگ نامہ تصنیف کیا۔ اس میں کہتے ہیں۔

ہوا ہے پچھتر کے سن میں نظم　　کیا ہے اسے پندرہ دن میں نظم
ہوئے پانچ سو شعر اس جا تمام　　بس اب تو ختم کر لکھ کے والسلام

اس جنگ نامے میں جو واقعات کا بیان اس شخص نے کیا ہے جو ذاتی طور پر اس میں شریک تھا، اس لحاظ سے اسے ایک مستند تواریخی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اونچ نیچ اور چھل بھل سے مغلوں کی بہادری اور جاں فشانی پر فرانسیسیوں اور مرہٹوں کی کامیابی ایک قابل توجہ حقیقت ہے۔ رنگین نے اس مثنوی میں اسلحوں کے استعمال اور جنگی معاملات کا اختصار کے ساتھ لیکن بہت اچھا بیان کیا ہے۔ ہر موڑ پر اس نے ربط و تسلسل بہت سلیقہ سے قائم رکھا ہے۔ زبان سادہ اور بے تکلف ہے۔ اور سچ بات یہ ہے کہ ایسی مثنوی کے لیے ایسی ہی زبان اور بیان چاہیے تھا۔

(3) داستان رنگین: رنگین کی اس مثنوی کے ایک قلمی نسخے کا تعارف ڈاکٹر صابر علی خاں نے مختصراً اس طرح کرایا ہے:

"داستان رنگین، قلمی، نسخہ انڈیا آفس نمبر 94، تعداد اوراق 94، مصنف کا قلمی نسخہ، تاریخ کتابت 12 صفر 1249ھ، بمقام باندہ، تاریخ تصنیف 1245ھ، اس میں گجرات کے سوداگر بچے کی کہانی ہے جو عجیب و غریب ہے اور یہ ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے"۔12

ڈاکٹر گیان چند کی بصیرت بلکہ بصارت کی بھی داد دینی چاہیے کہ موصوف نے اس مثنوی سے متعلق تحریر فرمایا ہے:

"داستان رنگین، سوداگر گجرات آغا عزیز کی کہانی، باندہ میں رنگین کے کسی دوست نے یہ قصہ سنایا، رنگین نے اسے اکیس دن میں 1245ھ میں نظم کر دیا، یہ نسخہ رنگین کا پانچواں جزو" پہلا شعر یہ ہے۔

حمد لکھ سکتے نہیں لوح و قلم حمد اس کی میں کروں کیوں کر رقم

ڈاکٹر صابر علی خاں کے مقالے میں ان دونوں مثنویوں (داستان رنگین اور نظم رنگین) کا ذکر نہیں ہے۔"13

ڈاکٹر صابر علی خاں کی کتاب سے "داستان رنگین" سے متعلق اقتباس نقل کیا جا چکا ہے۔ اب "نظم رنگین" کے بارے میں ان کی تحریر درج کی جاتی ہے:

"نظم رنگین قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر 92 تعداد اوراق 41 قلمی نسخہ مصنف تاریخ کتابت

28 صفر 1249ھ بمقام باندہ، اس میں ایک ہزار اشعار ہیں، کل سو حکایات ہیں،
ایک سو شعروں پر مشتمل بُندیل کھنڈ میں دس دس حکایات ہیں اور دس دس حکایات میں
سو سو شعر ہیں اور ہر دس دس حکایات جدا بحر میں نظم کی ہیں"۔14

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نے ان دونوں مثنویوں کے بارے میں جو چند سطریں قلم بند کی ہیں وہ بلوم ہارٹ کی فہرست کے حوالے سے ہیں۔ دونوں کے قلمی نسخے ان کی نظر سے نہیں گذرے ہیں۔

مثنوی نظم رنگین بہت پہلے کی تصنیف ہے اس لیے وہ ہمارے موضوع کے دائرے سے باہر ہے۔

(4) ساقی نامہ رنگین: ڈاکٹر صابر علی خاں نے اس نظم کے جس نسخے سے استفادہ کیا ہے اس کی کیفیت اس طرح قلمبند کی ہے:

"مصنف کا قلمی نسخہ تاریخ کتابت 20 شوال 1248ھ بمقام باندہ"۔15

پروفیسر گیان چند کا خیال ہے کہ "اگر یہ تاریخ کتابت ہے تو تاریخ تصنیف بھی اسی کے آس پاس ہونی چاہیے"16 جو بھی ہو یہ ساقی نامہ "17 سبع سیارہ رنگین کا پانچواں حصہ ہے۔ اس کی ابتدا حمد و نعت، مدح چار یار، مدح سخن و سخن گو، شکوہ فلک، دو نیائے دوں، وغیرہ سے ہوتی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ اس میں رنگین نے ضمناً ایک قصہ بھی شامل کر دیا ہے۔ اس طرح کہ شاعر کو ڈر ہے کہ کہیں اس کا بھی وہی حال نہ ہو جو ایک پری رو کے عاشق کا ہوا تھا۔ اس لیے پچیس شعروں میں وہ ساقی کو رحم کرنے کے لیے قسمیں دلاتا ہے۔

ارے تجھ کو باد صبا کی قسم ارے تجھ کو اپنے خدا کی قسم
قسم ہے تجھے جان من ناز کی قسم ہے تجھے اپنے انداز کی

اس کے بعد کہتا ہے کہ آنے میں اتنی دیر نہ ہو کہ مجھے اجل آ جائے۔ اس اندیشہ کے اظہار کے بعد رنگین نے پری رو اور اس کے عاشق کی داستان نظم کی ہے۔ اس میں منظر کشی سراپا نگاری، وغیرہ سبھی کچھ ہے۔ سراپا کے کچھ شعر یہ ہیں۔

سراپا میں اس کا بیاں کیا کروں عیاں تھا عیاں کو عیاں کیا کروں

وہ چوٹی تھی جس کا ہر ایک بال بال　　سدا گردن حور کا ہووے بال
فتح پیچ وہ جس میں جو دل پھنسے　　تو اس کی قضا سر پہ آکر ہنسے
وہ آنکھیں سیہ اور وہ ترچھی نگاہ　　وہ مکھڑا چمکتا ہوا مثل ماہ
وہ جوبن کا غرہ وہ دل کی امنگ　　وہ آنکھوں سے ظاہر نشے کی ترنگ

اب عالم فراق کے بیان سے متعلق اس مثنوی کے چند شعر لکھے جاتے ہیں:

گذرتا تھا دن رات روتے اسے　　نہ پاتے کبھی شب کو سوتے اسے
غم یار میں بے خور وخواب تھا　　غرض شکل سیماب بیتاب تھا
پھرے تھا اسے ڈھونڈتا کو بہ کو　　رہے تھی اسی کی اسے جستجو
کبھی جا نکلتا اگر سوئے باغ　　دکھاتا دل اپنے کا لالے کو داغ

اس قصے کے عاشق کے انجام کو بیان کرنے کے بعد شاعر نے کہا ہے کہ ۔

تمنا ترے ہاتھ کے جام کی　　کسی دن کرے گی یہی مجھ سے بھی

شاعر چاہتا ہے کہ یہ انجام اس کا نہ ہو اس لیے وہ شراب ناب کے بجائے شراب معرفت اور میخانہ کی جگہ چشمۂ کوثر کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ساقی کوثر سے دعا کرتا ہے۔

ترحم سے ساقی کوثر ۔ ادھر　　مری تشنگی کو ذرا دیکھ کر
پلانا مجھے جام محشر کے روز　　بجھانا مری آتش دل کی سوز

اور پھر دعاؤں پر وہ اپنی اس نظم کو ختم کرتا ہے۔

جہاں میں بہ نیکی ہوں مشہور میں　　رہوں تر وتازہ وشاد وسرور میں
مری آل اولاد بھی خوش رہیں　　نہ دیں کے نہ دنیا کے کچھ دکھ سہیں
مری نظم کو پڑھ کے ہر ایک بار　　دعا مانگے حق میں مرے لاکھ بار

پھر آخری شعر میں شاعر نے اس نظم کے شعروں کی تعداد بتائی ہے۔

ہوئے ڈھائی سو شعر کر لے شمار　　بس اس کو یہاں ختم کر مرے یار

ساقی نامے کے مطالب کو ایک سے زائد موڑ دے کر رنگین نے اسے بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز بنا دیا ہے۔ اس نہایت مفید نظم کے بارے میں ڈاکٹر صابر علی خاں نے صحیح رائے دی ہے کہ

''اس سے ان کی شاعرانہ ندرت، مشاقی، طبیعت کی ایجاد، اور کلام کی بیساختگی کا ثبوت ملتا ہے''۔

(5) خیل نامہ: یہ سعادت یار خاں رنگین کی ایک نادر مثنوی ہے۔ اس کے دو نسخے کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں موجود ہیں۔ پہلے نسخہ کی کتابت اردو میں کمال احمد نامی کسی شخص نے 1246ھ (1830-31) میں چوالیس اوراق پر کی ہے۔ دوسرے نسخہ کی ضخامت 104 ورق ہے۔ عابد امام زیدی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''اس نسخے کے ساتھ دو نسخے اور بھی ہیں۔ ایک زنانہ محاورات کی مختصر لغت ہے جو سعادت یار خاں رنگین ہی کے مولفات میں سے ہے۔ دوسرا نسخہ عملیات و تعبیر رویا وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے اور ناقص ہے۔ ان تینوں نسخوں کے اوراق کی مجموعی تعداد ایک سو چار ہے۔ رنگین کی مثنوی خیل نامہ کا ذکر بیشتر کتابوں میں نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اس کی اہمیت زیادہ ہے''۔18

ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کے اہتمام سے قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی ایک نمائش 1959 میں ہوئی تھی۔ اس کے مخطوطات کی فہرست قاضی محمد سعید نے مرتب کر کے شائع کردی تھی۔ اس فہرست میں رنگین کی چند مثنویوں کا ذکر ہے۔ امکان ہے کہ ان میں سے بھی کوئی ایسی ہو جس کا تا حال تعارف نہیں کرایا گیا ہے۔

(6) مثنوی فارسی: شروع میں یہ ذکر آچکا ہے کہ باندہ میں فارسی شاعری کا چلن ہو گیا تھا، میاں رنگین تو سترہ زبانوں کے شاعر تھے۔ وہ فارسی میں بھی بے تکلف شعر کہتے تھے۔ شمشیر خاں کی فرمائش سے انھوں نے ایک مثنوی مولانا رومی کے طرز میں کہی تھی۔ اس کے قلمی نسخے کے تعارف میں ڈاکٹر صابر علی خاں نے لکھا ہے:

''مثنوی بہ طرز مولانا روم حسب فرمائش شمشیر خاں تاریخ کتابت 17 رجب 1248ھ، قلمی نسخہ مصنف''۔19

اس مثنوی کا عنوان اس طرح لکھا ہے:

''مثنوی فارسی بہ طرز حضرت مولوی روم و بیان حکایات در تصوف''۔20

اس مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے۔

یا الٰہ العالمین رب الجلیل　　برتری وبہتری از قال وقیل

یہ مثنوی تو فارسی زبان میں ہے لیکن بعض دوسرے اساتذۂ فارسی مثلاً الٰہی شیرازی، فریدالدین عطار وغیرہ کے طرز میں بھی رنگین نے اردو میں چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھی ہیں۔

(7) مجموعۂ رنگین: یہ نورتن رنگین کا پانچواں حصہ ہے اور چالیس اوراق پر محیط ہے۔اس مجموعہ میں بقول رنگین سترہ زبانوں میں مختلف اصناف میں ان کا کلام یکجا کیا گیا ہے۔اس کی روشنی میں ڈاکٹر صابر علی خاں نے لکھا ہے:

''معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رنگین صرف زبانوں کے فرق ہی نہیں بلکہ لب ولہجہ اور مقامی اختلافات سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ پنجابی کی غزل کے علاوہ ایک غزل پنجاب کے گنواروں کی زبان میں لکھی ہے''۔21

جس نسخے سے ڈاکٹر صابر علی خاں نے استفادہ کیا ہے اس کا ترقیمہ انھوں نے اس طرح نقل کیا ہے:

''تمام شد نسخۂ پنجم نورتن رنگین کہ مشہور بہ مجموعۂ رنگین در ہفدہ زبان نظم شدہ، تصنیف سعادت یار خاں رنگین پسر محکم الدولہ طہماس بیگ خان بہادر اعتقاد جنگ روہی در شہر باندہ بہ تاریخ ہفدہم ماہ ربیع الثانی روز دوشنبہ در عہد محمد اکبر شاہ بادشاہ سال جلوس 12 مطابق 1249ھ بدستخط مصنف مذکور تحریر یافت''۔

اس نسخے کے بارے میں ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ:

''مجموعۂ رنگین کی تاریخ تصنیف 1235ھ ہے جیسا کہ دیوان تشنہ کے دیباچے میں انھوں نے خود لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ 1246ھ میں مجموعۂ رنگین کا نسخہ نقل کرتے وقت متفرق اشعار اور قطعات تاریخ وغیرہ اس میں شامل کرتے گئے جو اصل نسخے میں پہلے سے موجود نہیں تھے۔ اس مجموعے میں رنگین نے پہیلیاں بھی لکھی ہیں جن کی تعداد انتیس ہے''۔

اس مجموعے میں نواب ذوالفقار بہادر کی والدہ کی وفات کے علاوہ محمد ہادی کی شرح سہ نثر

ظہوری کی تاریخ تصنیف سے متعلق سات شعر کا قطعہ بھی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے۔

کہی تاریخ تب یہ رنگین نے　　شرح تصنیف محمد ہادی

1250ھ

اس اعتبار سے اس مجموعے کو رنگین کی زندگی کی آخری تحریروں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ باندہ کے اس محمد ہادی اور اس کی شرح سہ نثر ظہوری کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی، البتہ اس شرح کی موجودگی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ یہ شخص فارسی کا عالم اور شاید معلم بھی رہا ہوگا۔ اس مجموعہ میں اور بھی بعض قطعات تاریخ ایسے ہیں جو غالباً باندہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں ہے۔

(8) متفرقات: میاں رنگین کی بعض مختصر تحریروں پر مشتمل ایک قلمی نسخہ کا تعارف ڈاکٹر صابر علی خاں نے اس طرح کرایا ہے:

"متفرقات مجموعہ قلمی انڈیا آفس نمبر 108، مصنف کا قلمی نسخہ، سنہ کتابت 1250ھ

بمقام باندہ اس میں حسب ذیل تصانیف شامل ہیں:

(الف) قوت الایمان، 9 ورق، 1250ھ

(ب) ترجمہ قصیدۂ غوثیہ، 7 ورق، 1250ھ

(ج) ترجمہ قصیدہ بانت سعاد، 12 ورق، 1250ھ"

(د) نسخہ درستی قصیدہ مرزا رفیع سودا بموجب فرمائش شمشیر خاں، فوراً در یک جلسہ، 4 ورق"۔22

ان میں سے پہلے کا حال لکھا جا چکا ہے، دوسرا رسالہ قصیدۂ غوثیہ کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ قصیدہ شیخ عبدالقادر گیلانی کا تصنیف کردہ ہے اور عربی زبان میں ہے، فارسی میں تو اس کے ترجمے موجود تھے۔ اردو میں اس وقت تک شاید کوئی ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ یہ کام رنگین نے اپنے بیٹے اختیار خاں کی فرمائش سے 1250ھ (1834ء) میں باندہ میں کیا تھا۔ شعروں کی کل تعداد ایک سو دس ہے۔ ابتدا ان شعروں سے کی ہے ۔

پلایا مجھ کو جس دم بادۂ وصل　　رہا مجھ میں اور اس میں پھر نہ کچھ فصل

پھر آخر ہو کے میں مشتاق بولا　　کہ اے مے جلد تو میری طرف آ

چلی آئے مری جانب رواں ہو　　پیالوں میں وہ بھر بھر شاداں ہو
نشے میں ولولہ یہ مجھ کو آیا　　کہ پی کر میں نے اوروں کو چکھایا
کہی پھر میں نے سب قطبوں سے یہ بات　　کہ تم اس طرح کاٹو اپنے اوقات
ترے حلقے میں داخل ہوں سب آکر　　ہر اک مسرور ہو لذت اٹھا کر

اس کے آخر میں تین شعر یہ ہیں۔

جہاں تک مَرد مَردانے بہم ہیں　　انھوں کی پشت پر میرے قدم ہیں
اور عبد القادر اب مشہور ہوں میں　　مرا جد نور کا تھا نور ہوں میں
مرا جد مالکِ کوثر یقیں ہے　　شک اس کی مالکی میں کچھ نہیں ہے

اس ترجمے کی زبان نہایت صاف، سادہ، رواں اور سلیس ہے۔

تیسرا رسالہ حضرت رسول اکرم ﷺ کی مدح میں حضرت کعب بن زہیرؓ کے اس مشہور عربی قصیدے کا ترجمہ ہے جس کا عنوان ''بانت سُعاد'' ہے۔ حضرت رسول اکرمؐ نے اسے پسند فرما کر حضرت کعبؓ کو انعام کے طور پر اپنی ردائے پاک عنایت کی تھی۔ اردو میں اس قصیدے کو پہلی بار 23ء منتقل کرنے کا سہرا بھی رنگین ہی کے سر معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں البتہ اس کے کئی لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اردو میں ترجمے کیے ہیں۔ چنانچہ چند برس پہلے رئیس نعمانی نے بھی یہ کام کیا تھا۔ یہ ترجمہ رئیس نعمانی کے مجموعۂ نعت ''چراغ نوا'' میں شامل ہے۔

اصل عربی قصیدے میں کل اُنسٹھ شعر تھے، رنگین کے ترجمے میں ایک سو ساٹھ اشعار ہیں، ڈاکٹر صابر علی خاں نے پورا ترجمہ اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے، شروع اس طرح کیا ہے۔

وہ معشوقہ بچھڑی جو مجھ سے سُعاد　　تو اس واسطے دل نہیں میرا شاد
زبس اس کی آنکھوں میں تصویر ہے　　مجھے رات دن اس کی تدبیر ہے

اس محبوبِ مجازی کا رنگین نے تفصیل سے سراپا نظم کرنے کے بعد اس کے وعدوں کی نفی کی ہے اس طرح۔

ہیں عرقوب کے اس کے وعدے تمام　　نکلنے کا ان سے نہیں تیرا کام

پھر کہتے ہیں۔

سکونت وہاں کی ہے اب اس نے جا　　نہ پہنچے جہاں وہم بھی مطلقا
مگر اونٹ وہ جن پہ جب ہوں سوار　　تو چلنے میں ہوں وہ شتر بے مہار
ہیں اس کے فقط ناقے ایسے یقیں　　تو پہنچا کے دکھلا دیں وہ سرزمیں

اس کے بعد ناقے کے اوصاف اور اعضا کا بیان بہت تفصیل سے کیا ہے۔ اردو شاعری میں ناقے کے سراپا کے بیان کی مثال نایاب تو نہیں، کمیاب ضرور ہے۔ اس قسم کے بیانوں کے بعد حضرت رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں جانے کے ارادے کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

مجھے یہ خبر ہے مرے قتل کا　　پیغمبرؐ نے ہے حکم سب کو دیا
ہوا مجھ سے حال آنکہ جو ہے قصور　　رسول خدا بخش دے گا ضرور
سو آیا نبیؐ کی ہوں خدمت میں یاں　　پشیمان و نالاں و منت کناں

اس قصیدے کے آخر میں یہ مذکور ہے۔

وہ اسلام جو اس پہ لائے تھے سب　　کہ ہجرت کر و تم مدینے سے اب
گئے سب مدینے مہاجر وہ ہو　　مگر وہ ضعیف اور بے سر تھے جو
نہ پہنچے لڑائی میں وہ اس سبب　　کہ تھے بے سلاح اور بے نیزہ سب
بہادر وہ ہیں جن کی اونچی ہے ناک　　نہیں ہے لڑائی سے کچھ ان کو باک

قصیدے کا ترجمہ ان شعروں پر ختم ہوتا ہے۔

نہیں ہے صحابہ کے تیروں کی مار　　بہ جز سینۂ کافراں زینہار
کہ ان کو کبھی موت کے حوض سے　　نہ سیرابی ہوگی ذرا خوض سے

اس سلسلے کا سعادت یار خاں رنگین کا آخری رسالہ سودا کے مشہور قصیدے

صبح ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک

کے شعروں میں بعض لفظوں کی ترمیم پر مشتمل ہے۔ یہ کام شمشیر خاں کی فرمائش پر فوراً کیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ یہ ترمیمیں بہت سرسری ہیں اور ان کو کچھ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

رنگین نے اپنی غزلوں، ہزلوں، اور ریختی وغیرہ کے دواوین بھی باندہ کے قیام کے زمانے

میں 1249ھ (1833) میں صاف کیے تھے 24۔ ظاہراً ان اصناف میں اپنے جدید کلام کو بھی انھوں نے ان دواوین میں شامل کرلیا ہوگا۔ باندہ میں رنگین کی مصروفیتوں پر نظر کریں تو خیال ہوتا ہے کہ وہاں انھوں نے ہزل اور ریختی سے دلچسپی نہ لی ہوگی اور غزلیں بھی زیادہ نہیں کہی ہوگی۔

3-شہید

مولوی غلام امام شہید کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ لالا سری رام نے ان کے جو حالات لکھے ہیں ان کا اختصار یہ ہے:

''مولوی غلام امام شاگرد مرزا قتیل و مصحفی باشندۂ امیٹھی ضلع لکھنؤ آپ کے والد مشہور مشائخ سے تھے۔ آپ نے آغا اسماعیل مازندرانی سے عروض وعلم معانی کی کتابیں پڑھیں، فارسی میں پوری استعداد تھی۔ صنائع بدائع پر پورا عبور تھا۔ فارسی میں صاحب دیوان تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے تھے، الہ آباد میں عہدۂ پیشکاری صدر نظامت پر فائز تھے۔ اپنے گھر پر مجلس میلاد کرتے تھے اور تازہ نعتیہ کلام خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ نواب محی الدولہ بہادر نے حیدرآباد دکن میں بلایا تھا۔ سرکار نظام سے چار سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوگیا تھا۔ عرصہ ہوا کہ سفر آخرت کیا''۔

مولوی غلام امام شہید کا سالِ ولادت 1219ھ (1804) ہے، اور تذکرہ شوکت نادری کے اندراج کی روشنی میں ان کے قیام باندہ کا زمانہ 1247ھ کے آس پاس کا معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے نظم ونثر میں متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کا رسالہ مولود شریف بہت مقبول ہوا تھا۔ بار بار چھپا اور گھر گھر میں پڑھا جاتا تھا۔ اس کا 1259ھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے، آغاز ان شعروں سے ہوا ہے ۔

حمد بے حد اس خدائے پاک کو　　نور ایماں جس نے بخشا خاک کو
خاک کو پُر نور سرتاپا کیا　　قطرۂ ناچیز کو دریا کیا

اور اس کا اختتام اس عبارت پر ہوا ہے:

''بار خدایا اگر میرا سلام تو نے قبول کیا ہو تو اس دم مجھے اپنے حبیب کے حضور میں بُلا، بس یا محمدؐ یا محمدؐ کہتے ہوئے زمین پر گر پڑا اور رسول مقبول کی محبت میں روانہ ملک بقا ہوا''۔

اس رسالے میں نثر و نظم ملی جلی ہوئی ہے۔

4-صادق

صادق تخلص کے کوئی شاعر باندہ میں نواب ذوالفقار بہادر کے عہد میں تھے، ان کا نام اور احوال معلوم نہیں ہوسکا، فارسی داں تھے اور تاریخ گوئی کا شوق تھا۔ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ نے وفات پائی تو صادق نے تاریخ کہی۔

پہلا شعر جس میں ان کا نام نظم ہوا ہے اور انھیں مفتی، عالم اور سخی بتایا ہے، واضح نہیں ہے۔

روز جمعہ بہ ربیع دویمیو بست ودوم　　رفت از دار فنا سوئے بقا وقت سحر

گفت صادق پے تاریخ.....در ماتم او　　جود بیدل شد و گردید فضیلت بے سر

ء1247=1240 + ۷

خود مولوی محمد علی بھی شاعر تھے۔ عموماً فارسی میں شعر کہتے تھے۔ لیکن تخلص بہ گمان غالب کچھ مقرر نہیں کیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا اردو کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔

مختلف تاخذ کے حوالہ سے صالحہ بیگم قریشی نے نواب ذوالفقار بہادر کے عہد میں باندہ میں درج ذیل شاعروں کی موجودگی کا پتہ دیا ہے:

مرزا عباس بیگ عباس دنادر تخلص، محمد یار خاں تخلص نامعلوم اور نامی بلگرامی لیکن ان کا احوال اور کلام دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔28

5-اخگر

باندہ سے متصل بندیل کھنڈ کے علاقوں میں مختلف مقاموں پر بھی بعض شاعروں کی موجودگی کا پتا چلتا ہے چنانچہ محسن کے تذکرے میں ہے:

''کوتوال مہوبہ متعلقہ بندیل کھنڈ احمد انور خاں اخگر ولد نور محمد خاں باشندۂ رامپور، صاحب دیوان''۔29

معلوم ہوتا ہے کہ رامپور سے آکر انھوں نے مستقلاً بندیل کھنڈ ہی کے علاقے میں سکونت اختیار کر لی تھی، چنانچہ ان کے صاحبزادے عبدالغفور خاں شرر بھی اسی علاقے میں تھانیدار رہ چکے

تھے، معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں ترقی کر کے وہیں تحصیلدار ہو گئے۔ چنانچہ محسن نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''عبدالغفور خاں شرر خلف نور محمد خاں، پوتے شاہ محمد خاں کابلی کے، مولد ان کا دہلی، باشندۂ رامپور، بندیل کھنڈ میں تحصیلدار ہیں، صاحب دیوان''۔30

اخگر کے نام میں کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے، باپ اور بیٹے کے یہاں پر دو دو شعر نقل کیے جاتے ہیں:

کلام اخگر۔

کیا میرے سیم تن کی ہے تاثیر ہاتھ میں — مٹی جو لے ابھی تو ہو اکسیر ہاتھ میں
کیوں کر ہمارا عقدۂ دل وا کسی سے ہو — آتی نہیں ہے زلف گرہ گیر ہاتھ میں

کلام شرر۔

اس قامت دلچسپ پہ اپنی جو پڑی آنکھ — سرکی نہ پھر اس جا سے کہ جس جا پہ گڑی آنکھ
بعد مُردن اس لیے باندھے ہمارے ہاتھ پاؤں — گور میں بھی تا کہ یہ وحشی نہ مارے ہاتھ پاؤں

6-نوازش

نوازش حسین خاں عُرف مرزا خانی متخلص بہ نوازش لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے، میر سوز کے شاگرد ہوئے۔ کانپور میں نیلام کے دیہات خریدنے کے لیے گئے۔ اپنے اس مقصد کے لیے انھیں بعض دیہاتوں میں بھی جانا پڑا۔ اکبر پور بیربر (کذا) نامی ایک گاؤں میں پہنچے۔ وہاں کی بولی عجیب معلوم ہوئی، نوازش کے خیال کے مطابق وہ بندیل کھنڈ کی بولی تھی۔ نوازش کو اس بول چال اور وہاں کے موسم وغیرہ سے تکلیف ہوئی اس لیے انھوں نے اس کی ہجو میں ایک مثنوی لکھ کر محمد مہدی نامی کسی شخص کی خدمت میں پیش کی تھی۔31

نوازش نے اس ہجو میں اس مقام کی بول چال دکھانے کے لیے وہاں کے بکثرت الفاظ کے معنی اور محل استعمال کا بیان کیا ہے۔ اس طرح یہ ہجو اس علاقے کی بولی کی ایک مختصر سی لُغت بن گئی اور اس اعتبار سے یہ نوازش کے ایک قابل توجہ کارنامہ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ابتدا اس طرح کی ہے

اے پشت و پناہ خاکساراں — وے چشمۂ فیض و لطف و احساں

اے کار روائے مشکلِ خلق　　وے عقدۂ کشائے مشکل خلق
اے کان سخا ومعدنِ جود　　وے راہ نمائے باب بہبود
بعد از آداب بندگی میں　　پڑھتا ہوں یہ شعر جو لکھے ہیں
آپ اس کو ہنسی نہ جانئے گا　　واللہ یقیں مانیے گا

اس کے بعد کہتے ہیں کہ میں یہاں کے گنوار لوگوں سے کب تک نہ بولتا، میرا تو انھیں سے کام پڑا ہے جس جگہ ایسی زبان بولی جاتی ہو وہاں فکرِ سخن بھلا کہاں ممکن ہے، اس مختصر سے تمہیدی بیان کے بعد نوازش نے ایک ایک لفظ کا مرادف نظم کیا ہے چند متفرق اشعار نمونے کے طور پر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

یہ پوچ ہیں ان کی گفتگو پوچ　　کہتے ہیں پوچھار مور کو پوچ
اس دیس کا کون پھر ٹھکانا　　جس جا بڑا بھائی ٹھہرے نانا
یہ نطفہ حرامیوں کی بانی　　کہتے ہیں بڑی بہن کو نانی
جس جا ہو خداوند ان کو کہنا　　کہتے ہیں یہ دین بند اس جا
یہ گو کہ نہیں بوندیل کھنڈی　　مفسد کو ہیں یہاں بھی کہتے ڈندی
بے پیروں کا دیکھیے گا لہجہ　　بوڑھے کو یہ کہتے ہیں ڈوکرا
سمجھا ہوں بہ دیر میں کہ یہ خر　　جلدی کی جگہ ہیں کہتے ہڑبڑ

اس مقام کی خوفناکی کا بیان کرتے ہوئے شاعر نے کہا ہے۔

اس مرتبہ یہاں ہیں سانپ بچھو　　ہر گھر میں مار مار ہر سو
کہتا ہے یہی ہر ایک پیادہ　　آغا صاحب وہ شیر نکلا
اس خوف دور جا میں اب تو دن رات　　کٹتی ہیں یہاں یہ مری اوقات
پر دیکھ کے حالت زمانہ　　بندے نے یہیں کیا ہے تھانہ

برسات کا حال بھی ان چار شعروں میں نظم کیا ہے۔

برسات کا کیا کہوں میں عالم　　دیکھی، یہ خرابی ہے بہت کم
مینہ کھل گیا جس گھڑی برس کر　　چاہے کوئی گھر سے جو ہو باہر

مٹی لگ لگ ہر ایک جوتا　　بھاری ہوتا ہے من بھرے کا
دیکھا جو غرض پھر اس نگر میں　　جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

اسی طرح جاڑے گرمی کا حال نظم کرنے کے بعد آغا نوازش نے اپنی اس مثنوی کو اس طرح ختم کیا ہے۔

اور جتنے ہیں عہدہ دار یہاں کے　　سارے بد ذات ہیں جہاں کے
میں کیا کہوں ان سبھوں کے اوصاف　　قاضی بھی ہے قاف، قالو کو قاف
یہاں کا جو ہر ایک چودھری ہے　　چو طرفہ یہاں اسی دھری ہے
القصہ یہ ایسا پرگنہ ہے　　ہجو اس کو جو کیجیے بجا ہے

ہجو ہونے کے باوجود اس مثنوی میں فحش کا عنصر نہیں ہے۔ بلکہ ایک دو مقاموں کو چھوڑ کر گالی یا اس قبیل کے الفاظ بھی نہیں آئے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ ایک کامیاب مثنوی ہے۔

بندیل کھنڈ کی زبان میں مرہٹی الفاظ بھی داخل ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس مثنوی میں بھی بعض الفاظ آ گئے ہیں مثلاً:

دوندو = جھگڑا، لڑائی وغیرہ

ہڑویں = جلدی تیار ہونے والا، نرم و نازک

2-نثر

عام یہ ہے کہ کسی علاقے میں پہلے نظم کو رواج ہوتا ہے اور پھر نثر پھلتی پھولتی ہے۔ لیکن باندہ میں نظم اور نثر دونوں کا سلسلہ کم وبیش ساتھ ساتھ جاری ہوا اور اس معاملے میں بھی سعادت یار خاں رنگین کی کارکردگی موثر اور راہنما ثابت ہوئی تھی۔

رنگین نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں نثری تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ یہاں قیام باندہ کے زمانے کی ان کی تحریروں کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔

امتحان رنگین: یہ رنگین کے مجموعہ ''نورتن رنگین'' کا نواں حصہ ہے۔ خود مصنف نے اس کا تاریخی نام ''امتحان سعادت یار خاں'' رکھا ہے۔ جس سے اس کا سال تصنیف 1246ھ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے دیباچے سے پتہ چلتا ہے کہ اس رسالے کا محرک واقعہ فیض آباد میں پیش آیا تھا۔ ایک مدت کے بعد جب رنگین باندہ میں مقیم ہوئے تو مرزا محمد علی کی فرمائش پر انھوں نے اس واقعہ کو قلمبند کیا تھا۔ اس مقام پر یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرزا محمد علی مولوی محمد علی صدر امین باندہ سے مختلف شخص تھا۔ واقعہ اس طرح ہے کہ:

''رنگین فیض آباد پہنچے تو شہرت ہوئی کہ یہ ہر شاعر کے کلام کو ہیچ سمجھتا ہے۔ آغا تقی خاں، نواب آغا نصیر خاں، نواب مرزا تجو، میر مستحسن خلیق، مرزا مغل سبقت وغیرہ نے مشورہ کر کے ان کی

دعوت کی۔ کھانے کے بعد شعروشاعری کا ذکر چھڑا۔ بحث یہ تھی کہ موجودہ زمانے میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ سودا، میر، درد، سوز، انشاء، جرات، مصحفی، نصیر اور ناسخ وغیرہ کے نام لیے گئے۔ رنگین کی بشریت جوش میں آئی۔ انھوں نے کہا شاعروں کی چار قسمیں ہوتی ہیں:

اول شاعر کہ جو طبع موزوں رکھتا ہے اور شعر کہتا ہے خواہ صد ہزار شعر کہے۔

دوم استاد جو صاحب طرز ہو جائے خواہ عمر بھر میں صرف سو شعر کہے۔

سوم ملک الشعرا جو کئی طرزوں پر قادر ہو اور

چہارم علامہ جو خود کئی طرز ایجاد کرے۔

رنگین کے نزدیک درد، میر، انشاء، ناسخ وغیرہ استاد ہیں کہ ہر ایک کا اپنا طرز جدا ہے۔ سودا ملک الشعرا ہیں کہ ایک سے زیادہ طرز پر قادر ہیں لیکن علامہ کوئی بھی نہیں۔ رنگین صرف خود کو علامہ سمجھتے ہیں اور اس کی تین دلیلیں ہیں:

(الف) اصناف سخن کی مختلف ستائیس شکلیں ہیں سوائے ان (رنگین) کے کسی شاعر نے ان سب میں افراط کے ساتھ شعر گوئی نہیں کی۔

(ب) امیر خسرو کے علاوہ کسی نے پانچ یا چھ زبانوں میں شعر نہیں کہے۔ رنگین نے مجموعۂ رنگین میں سترہ زبانوں میں شعر کہے ہیں۔

(ج) سوائے جامی کے کسی نے سات بحروں میں مثنوی نہیں کہی۔ رنگین نے گیارہ بحروں میں مثنویاں کہی ہیں۔

سب نے اس بات کو تسلیم کرنے کے بعد پوچھا آپ کی تصانیف کتنی ہیں؟ جواب دیا: بیست و پنج اور ان کی چار جلدیں ہیں:

جلد اول: نورتن جس میں نو تصانیف ہیں۔

جلد دوم: شش جہت رنگین (مسدس رنگین) اس میں چھ مثنویاں ہیں اور چھ ہزار شعر۔

جلد سوم: پنجۂ رنگین (مخمس رنگین) پانچ مثنویاں اور پانچ ہزار شعر۔

جلد چہارم: خمسۂ رنگین اس میں بھی پانچ مثنویاں ہیں۔

اس رسالے امتحانِ رنگین کے مطالعہ سے نہ صرف رنگین کی تصانیف کی نوعیتوں کا پتہ چلتا

ہے بلکہ علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے ان کے مرتبۂ عالی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اختصار کے باوجود رنگین کے سلسلۂ حالات میں اس رسالے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

تجربۂ رنگین: یہ رنگین کی کارآمد تصانیف میں سے ایک ہے اور ان کے مجموعہ ''سبع سیارۂ رنگین'' کا چھٹا حصہ ہے، اس کے دیباچے میں مذکور ہے کہ جب 1214ھ (1800) میں رنگین کھانڈو جی مرہٹہ کے پاس گوالیار میں پہنچے تو اس نے پوچھا کہ انگریز دیسی سپاہیوں پر کیوں غالب آجاتے ہیں؟ رنگین نے جواب دیا کہ ہندوستانی اشراف فن سپاہ گری میں کسی کی شاگردی اختیار کرنے کو ذلت سمجھتے ہیں اور انگریز معمولی معمولی آدمی سے بھی علم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے سات ہتھیاروں کی تفصیل بیان کی۔

چند سال کے بعد جب رنگین باندہ میں مقیم تھے۔ نواب ذوالفقار بہادر کی فرمائش سے انھوں نے مذکورہ تفصیلات کو 1248ھ (1832) میں اردو نثر میں قلمبند کر دیا۔ جن سات ہتھیاروں کی کیفیت اس رسالے میں بیان کی گئی ہے یہ ہیں:

سپر، تلوار، چھری، نیزہ، برچھی، کمان، بندوق

ذیل میں اس کا ایک مختصر اقتباس درج کیا جاتا ہے:

> ''فصل چوتھی، سپر کے باندھنے کے بیان میں، یعنی سوار تو تا مقدور سپر کو پشت پر سے نہ کھولے، باعث یہ کہ ہر انسان کی پشت اس کاندھے سے تا اُس کاندھے اور گردن کی جڑ سے جسے فارسی میں چار بند کہتے ہیں اسے تا ریڑھ جسے ریختہ زبان میں ریڑہ کہتے ہیں اور ہندی بھاکا میں کنگروڑ بولتے ہیں، خدا کی قدرت سے کہنی کی ابتدا سے بیچ کی انگلی کی نوک تک اور چار انگل ہر شخص کی ہوتی ہے، بس سپر پیٹھ کی محافظت کے واسطے ہے، چاہیے ہر شخص کی سپر اس کے ہاتھ کے برابر اور چار انگل ہو، اگر اس پُت سے زیادہ ہوگی تو اسے وہ حیران کرے گی''۔

سعادت خاں رنگین عملاً اور پیشہ کے اعتبار سے بھی سپاہی رہ چکے تھے۔ اس زمانے کے اسلحوں اور جنگ کے طور طریقوں سے بخوبی واقف تھے۔ اس رسالے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا انھیں تجربہ تھا۔ اس لیے یہ رسالہ بہت وقیع ہے۔ نثر بھی اس کی رواں اور سلیس ہے اور

بیان کا انداز بھی سلجھا ہوا اور سریع الفہم ہے۔ رنگین نے اس میں اہتمام بھی کیا ہے کہ فارسی اور ہندستانی اصطلاحوں کی بہت سلیقے سے حسب موقع وضرورت وضاحت کر دی ہے۔ اس سے رسالہ کی افادیت زیادہ ہوگئی ہے۔

اخبار رنگین: ڈاکٹر صابر علی خاں نے جس نسخہ سے استفادہ کیا ہے اس کا تعارف مختصراً اس طرح کرایا ہے:

''اخبار رنگین، قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۸۷، تعداد اوراق چالیس، قلمی نسخہ مصنف، سنہ کتابت 1249ھ بہ مقام بانده''۔3

اس کے بارے میں رنگین کا بیان ہے کہ:

''در ہندی زبان نثر مسجع و منقی حکایات عجائب کہ از گوش شنیدہ واز چشم خود دیدہ بطور اخبار آں را نوشتہ ام'':

اس رسالے میں ترانوے واقعات روز نامچے کے طور پر رنگین نے قلمبند کیے ہیں۔ نمونہ کے طور پر دو یہاں پر نقل کیے جاتے ہیں:

(14) شاہجہاں آباد میں سعادت یار خان رنگین نے اپنے سوداگری ہاتھیوں کے واسطے بیگم کے باغ میں املی کی کاشت بیگو باغبان سے کرائی۔ اس کو نیک سمجھا گیا لیکن اس نے ساری کھیتی اپنے اہل وعیال اور گائے بیل کو کھلا دی بلکہ سارے شہر میں دھڑلے سے بیچی۔

کچھ نہ کہہ اب اس سے تو اے نیک خو تخم نیکی مزرع دنیا میں بو

(27) شاہجہاں آباد میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو کسی نے جا کر کہا کہ آج فلانی جگہ پر محرم کی مجلس میں اصحاب رسول اور اولیاء اللہ کے بعد آپ پر بھی دیر تک تبرا ہوتا رہا۔ آپ نے فرمایا: شکر ہے کہ انھوں نے مجھے اولیاء اللہ کے بعد بڑا سمجھا۔

صبر کے رستے پہ چل بے رہ نہ جا دیکھ اچھا ساتھ ہے یہ رہ نہ جا

ہندی مثل: صبر کی داد خدا ہی دے گا''۔

اوپر رنگین کے تین نثری رسالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہر قسم کی نثر بہت روانی اور خوبی کے ساتھ لکھنے پر قادر تھے۔

سخاوت علی:

نواب ذوالفقار بہادر کے حالات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ انھوں نے مختلف مراکز سے علما کو مدعو کر کے باندہ میں ان کی قدر افزائی کی تھی۔ سید احمد شہید کے سلسلے کے جو عالم اس شہر میں آئے تھے ان میں مولوی سخاوت علی جونپوری بھی تھے۔ یہ شیخ رعایت علی کے فرزند اور قصبہ منڈیاہوں کے رہنے والے تھے، 1226ھ (1811) میں پیدا ہوئے تھے۔ تکمیل علوم کے بعد کچھ مدت تک نواب ذوالفقار بہادر کی ملازمت میں باندہ میں مقیم رہ کر وہاں کے مدرسے میں تعلیم دیتے رہے، پھر جونپور جا کر وہاں مختلف طریقوں سے مذہبی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہ سید احمد شہید کے خلفا میں نامور ہوئے، انھوں نے اردو میں کئی کتابیں اور رسالے تالیف کیے تھے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے آٹھ کتابوں کا ذکر کیا ہے[5]۔ ان کے علاوہ دو یہ ہیں:

(الف) جوابات سوالات تسعہ؛ اس میں مولوی شیخ محمد مچھلی شہری کے جواب میں حدیث قلتین اور ماء کثیر سے بحث کی ہے۔

(ب) گلدستہ شریعت

افسوس یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے بھی سال تالیف کا پتہ نہیں چل سکا البتہ تقریباً سبھی رسالے بنارس، لکھنؤ وغیرہ مقاموں پر چھپ گئے ہیں۔ مولوی سخاوت علی کی نثر کا عام انداز یہ ہے:

> ''عرض کرتا ہے کہ فقیر سراپا تقصیر خادم بارگاہ احمد، فقیر سخاوت علی محمدی کہ اس زمانے میں راہ راست کیساب اور زیادتی وکمی دین میں بھی پھیل پڑی۔ کوئی اس قدر دلیر ہے کہ گناہ سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ کلماتِ کفر کو بلا تکلف زبان پر جاری کرتا ہے اور کسی کو یہاں تک شدت آئی کہ بجز دسنے ایک کلمہ کفر کے کہنے والوں کو کافر لقب دیا اور بلا تکلف حکم کفر اس پر جاری کیا اور حالانکہ خدا اور رسول کو دونوں ناپسند ہیں'' (اقتباس از رسالہ کلماتِ کفر)۔

مولوی سخاوت علی نے سوال و جواب کی صورت میں بھی ایک مختصر سا رسالہ ''عقائد نامہ'' کے نام سے لکھا تھا۔ اس کا ایک مختصر سا اقتباس یہ ہے:

سوال: ایمان کے کیا معنی ہیں؟

جواب: جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، خدا کے پاس سے لائے اس کو دل سے سچ جاننا اور زبان

سے اقرار کرنا۔

سوال: کسی کے ظلم اور جبر سے اگر زبان سے توحید کا اقرار نہ کرے اور دل سے سچ جانے تو مومن ہے یا نہیں؟

جواب: مومن ہے"۔

اوپر جو کچھ مذکور ہوا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ باندہ کے علاقے میں مختلف قسم کی نظم ونثر لکھی گئی تھیں، لیکن نظم میں غزل اور نثر میں مذہبیات کا پلہ بھاری معلوم ہوتا ہے۔

حواشی

شاعری

1-سعادت یار خاں رنگین	ص435
2-باندہ اور غالب	ص27تا29
3-شوکت نادری	ص70
4-ایضاً	ص68
5-تذکرہ تا	در ص114
6-گلشن بے خار	ص88
7-سعادت یار خاں رنگین	ص347تا348
8-اردو مثنوی	ص368
9-لکھنؤ کا دبستان	ص314
10-تلخیص معلا	ص164
11-سعادت یار خاں رنگین	ص386
12-ایضاً	ص13تا14
13-اردو مثنوی شمالی ہند میں	ص365
14-سعادت یار خاں رنگین	ص13
15-ایضاً	ص15
16-اردو مثنوی شمالی ہند میں	ص377

17-سعادت یار خاں رنگین ص271 تا 278
18-مخطوطات اردو خدا بخش ص6
19-سعادت یار خاں رنگین ص14
20-ایضاً ص229
21-ایضاً ص427 تا 453
22-ایضاً ص16 تا 17
23-ایضاً ص384 تا 393
24-سعادت یار خاں رنگین ص57
25-اردو مخطوطات علی گڑھ ص57
26-بائدہ اور غالب ص63
27-ایضا ص61
28-ایضا ص33 تا 34
29-سراپا سخن ص196
30-ایضا ص360
31-دیوان نوازش ص8

نثر

1-سعادت یار خاں رنگین ص344 تا 383
2-ایضا ص440 تا 403
3-ایضا ص12
4-علما کا حصہ ص171 تا 181
5-قاموس الکتب ج-1 ص249

6-بنارس

(الف) غزل 455

(1)

1-عاشق شیخ مظفر علی 455
2-ظہور ظہور محمد 456

(2)

3-خان اشرف علی خان 459
4-دیوانہ مرزا محمد علی 407
5-جنون مرزا نجف علی 407
6-ضمیری مرزا مظہر تاجدار 461
7-شوکت منیف علی 461
8-نواب میر نواب 462
9-ذوقا ذوقا شاہ 463

(3)

10-صولت قاسم علی خاں 465
11-مہجور عنایت حسین خاں 465

12-تصور تصور علی خاں 466

(ب) ہزل وغیرہ 467

1-ظریف میر امان اللہ 467

2-وجود سید محمد علی 468

3-دیوانہ طالب علی 468

(ج) مثنوی 469

1-ثابت مرزا ثابت علی بیگ 469

2-ظہور شیخ ظہور محمد 474

3-مہجور عنایت حسین 474

(د) نثر 477

1-ظہور ظہور محمد 477

2-فخر الدین 478

3-مہجور عنایت حسین خاں 479

4-نامعلوم 479

(ہ) تذکرہ 481

مدائح الشعرا 481

(و) مطبع 483

حواشی 484

بنارس کو قدیم زمانے سے ہندوؤں کے مقدس مذہبی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا قدیمی نام جیسا کہ تاریخ بیہقی میں آیا ہے ''بانارسی'' تھا۔ اپنی شان وشوکت اور آب وہوا کی وجہ سے ہر دور میں یہ شہر غیر ہندوؤں کے لیے بھی پُرکشش رہا ہے۔ اکثر مسلمان شاعروں نے اپنے اپنے زمانے میں اس مقام کے بارے میں عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

بنارس کے علاقے میں شاہزادہ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے قدموں کی برکت سے اردو شاعری کے نخل نے سر اٹھانا شروع کیا تھا اور بہت جلد یہ زبان مسلمان ہی نہیں ہندوؤں کی دلچسپی کا بھی مرکز بننے لگی تھی۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے ایک ہندو شاعر کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''اخگر تخلص، لالا لیک چند، دیوان میرزا خورم صاحب فرزند ارجمند مرزا جہاندار مرحوم است''۔

اس کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے۔

کون کہتا ہے کہ ہم نے مے پرستی چھوڑ دی　　رات دن پیتے ہیں مے، پر مے پرستی چھوڑ دی

وہ زمانہ تھا جب شاہی کے معاملات دگرگوں ہو رہے تھے۔ شاہزادہ کو بھی بنارس سے واپس جانا پڑ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کے لیے فضا پوری طرح سازگار ہونے سے پہلے ہی بگڑ گئی۔

نواب سعادت علی خاں کے وقت سے بھی پہلے یہ شہر بہ وجوہ انگریزوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ کچھ ہی مدت کے بعد سرکار انگریزی کا عمل ہو گیا تو اس علاقے میں

انگریزی زبان اور عیسائی مذہب کا اثر بتدریج بڑھنے لگا۔ پھر انگریزی سرکار کی ملازمت کو عزت و توقیر کا سبب خیال کیا جانے لگا اس صورت حال میں مسلمانوں میں اپنے وجود کو محفوظ و باقی رکھنے کے خیال کا ترقی کر جانا گویا قدرتی عمل تھا۔ اس شہر میں بلکہ آس پاس کے علاقے میں بھی ایسی تحریریں مقبول ہونے لگی تھیں جو خاص و عام کے دلوں سے مذہبی معاملات کی طرف سے بے رغبتی کو دور کرنے والی ہوں۔ شعری اور ادبی معیاروں کی طرف ایسے حالات میں توجہ کا موقع زیادہ نہیں تھا۔ استادی شاگردی کے سلسلے بھی اس شہر میں عموماً قائم نہیں ہو سکے تھے۔

(الف) غزل

(1)

1- عاشق

شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے بنارس کے ابتدائی زمانے کے ایک نوجوان شاعر کے تعارف میں جو لکھا ہے اس سے اس شہر میں اردو شاعری کی کیفیت کا بھی انداز کیا جا سکتا ہے، لکھا ہے:

"عاشق تخلص، شیخ مظفر علی، برادر خرد منشی ظہور محمد ظہور، جوانیست مہذب الاخلاق، از چندے بمقتضائے سوز ذاتی طبع بطور خود سوزوں می کند واز انجا کہ در بنارس کسے از استادان ایں فن نیست، ہنوز در حلقۂ شاگردی کسے نیامدہ، کلامش شستہ ورفتہ می نماید، عمرش بست و چہار سالہ خواہد بود"۔[2]

عاشق کا کلام میدان شاعری کے سبزۂ خودرو کی حیثیت رکھتا تھا جسے بنانے سوارنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نوخیز شاعر کے چند شعر نمونے کے طور پر درج ذیل ہیں۔

درد نے فرقت کی یہ صورت بنائی ہے کہ آہ
بیکلی سے دم ہے آنکھوں میں ترے بیمار کا

گرچہ تیغ اصفہاں میں جوہر بُرّش ہیں، پر
سامنا کب کر سکے اُس ابروِ خمدار کا

سن کے اے عاشق ہمارے دیدۂ گریاں کا شور
سرد ہنگامہ ہوا ہے ابر دریا بار کا

کب تلک آنکھوں سے یارب خوں فشانی کیجیے
وہ نہیں ہیں پاس، کیونکر زندگانی کیجیے

آتش ہجراں سے جس کی، دل جگر سب جل گیا　　اُس پہ ظاہر کس طرح سوز نہانی کیجیے
لکھیے گر احوال خوں ہونے کا دل کے، یار کو　　کاغذ مکتوب رو رو ارغوانی کیجیے

کلام میں حشو وزوائد بھی ہیں۔ اور بعض جگہ مناسبات کی بھی کمی کھٹکتی ہے، کچھ باتیں غیر واقعی ہیں، مثلاً دیدۂ گریاں کا شور نہیں ہوتا ہے البتہ زور ہوسکتا ہے وغیرہ۔

عاشق کی طبیعت کا زور بیان کے لیے نئی نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں کبھی کبھی قطعے بھی شامل کر دیتا ہے۔ اور اس طرح معنی آفرینی کی داد دینا چاہتا ہے، ایک قطعہ یہ ہے۔

دوستو گر ہوسکے تو حَسْبَۃً لِلّٰہ یوں　　جاکے اس سے عرض اب میری زبانی کیجیے
جاں بہ لب ہے آپ کا عاشق غم فرقت سے آہ　　چل کے اس کے حال پر تک مہربانی کیجیے

2-ظہور

اُس ماحول میں جہاں نہ کوئی نمونہ موجود تھا اور نہ کوئی راہ دکھانے والا ہی تھا۔ شاعر کو سارے اسباب خود ہی فراہم کرنے ہوتے تھے۔ اور خود ہی اپنے لیے راستہ بھی بنانا ہوتا تھا۔ ایسے میں نوجوان، نومشق ہر طرف ہاتھ پیر مارتے تھے، دوسرے شہروں میں جاکر کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے۔ چنانچہ عاشق کے بڑے بھائی ظہور کے حالات میں مصحفی نے قدرے تفصیل سے تحریر کیا ہے:

"منشی ظہور محمد ظہور تخلص، قوم شیخ، خلف محمد اسماعیل عُرف منشی نہال بلگرامی .... از ابتدائے شباب شوق شعر ہندی داشتہ، کلام اکثر اساتذہ نزد خود فراہم نمودہ، بمطالعہ واستفادہ حاصل ساختہ، وبمقتضائے شوخ مزاجی اوّل بہ طریق ہجو موزوں میکرد..... بہ ایمائے سولوی کرم محمد کرم تخلص.... مدتے سلام ومرثیہ گفت.... در سنہ یک ہزار ودوصد وسی ہجری در حلقۂ شاگردی فقیر آمدہ قوت نظمی پیدا ساختہ، کلامش عاشقانہ است... در زود خوانی قرآن وزود نویسی کتب سوائے منشی گری بے نظیر روزگار، عمرش ازی متجاوز خواہد بود"۔3

ظہور اصلاً بلگرامی تھے اور بلگرام کا ماحول مدت سے علمی تھا۔ اسی ماحول کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ شروع سے شاعری وغیرہ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ منشی گری ان کا مشغلہ تھا اور زود نویسی میں وہ معروف تھے چنانچہ اپنے شوق سے انھوں نے اکثر اساتذۂ فن کا کلام فراہم کرلیا تھا۔ بظاہر اُس

ابتدائی زمانہ میں انھوں نے جو اشعار جمع کیے تھے۔ وہ اساتذۂ دہلی کے ہوں گے۔ پھر جب مصحفی کے شاگرد ہوئے تو اہل دہلی کے طرزِ سخن سے اُنس زیادہ ہو گیا تھا، مصحفی کی اصلاحوں کے باوجود ظہور کے کلام میں پورب کے علاقوں کی بول چال بھی اپنا اثر دکھاتی رہتی تھی۔

ظہور نے مزاحیہ اور ہجویہ شاعری سے ابتدا کی تھی۔ پھر مرثیہ و سلام کی طرف توجہ کی اور پھر غزل گوئی میں مصروف ہوئے۔ ایک سے زائد دیوان مرتب کیے اور پھر اپنی مشاقی اور قادرالکلامی کے اظہار کے لیے خمسے کہنے شروع کیے، چنانچہ تذکرۂ مصحفی کے دوسرے نسخے میں یہ عبارت بھی موجود ہے:

''در کمتر مدت دیوانے ترتیب دادہ، اکنوں دیوان دوم ترتیب می دہد و ارادہ دارد کہ دیوان خمسہ ہم ترتیب دہد و دو کتاب نثر و رینختہ..''۔

اس طرح غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس شخص نے کئی طرح کے کام کر ڈالے تھے۔ نظم کی مروجہ بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی تھی، متون کی فراہمی اور ترتیب کا کام کیا تھا۔ نثر میں بھی دو کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور اس طرح اپنے بعد والوں کے لیے نظم و نثر کے تقریباً سبھی شعبوں کی راہیں کھول دی تھیں اور ان کے نمونے بھی پیش کر دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس ابتدائی نہج پر اس سے کسی بلند معیار کی توقع کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس کی غزلوں کے چند شعر یہ ہیں:

باغِ جنت میں بہت یہ دل دلگیر لگا — دی جو رضواں نے تری سامنے تصویر لگا
حال پوچھے تھا وہ زیں پوش تو اکثر میرا — کیا سبب اب جو خفا ہو گیا دلبر میرا
کیوں یار بیوفا پہ دلا مبتلا ہوا — رسوا ہوا، ذلیل ہوا تو، بھلا ہوا
اک نظر آ کے جو دیکھے ترا بیمار مسیح — آہ بیساختہ کھینچے وہیں اک بار مسیح
سر کو ٹکرا کے نہ سنگِ در دیوار کو توڑ — جوشِ وحشت ہے دلا تجھ کو تو کہسار کو توڑ
جو دوستوں سے ملاقات ہم کبھی کرتے — مغایرت کی وہ کاہے کو گفتگو کرتے

زیں پوش، پوچھے تھا، کبھو وغیرہ پورب والوں کی بول چال میں نہیں ہیں۔ انھیں دہلی کے اساتذۂ قدیم کے کلام کے مطالعہ کا اثر سمجھنا چاہیے۔ شاعر کی توجہ مضامینِ تازہ کی تلاش کی طرف زیادہ تھی۔ لیکن ابھی نازک خیالی کی صورت پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ زبان بطور مجموعی آسان اور طرزِ بیان سلیس اور عام فہم ہے اور یہی شعرائے بنارس کی عام روش معلوم ہوتی ہے۔

(2)

نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے زمانے تک بنارس کے علمی، ادبی اور شعری ماحول پر عموماً باہر سے آنے والے چھائے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد اُن کی معلوم ہوتی ہے جن کا بالواسطہ یا براہ راست تعلق دہلی سے تھا۔ یہ شاید شاہزادوں جواں بخت کے اخلاف کے قیام کا اثر رہا ہو۔ بعض لوگ البتہ سرکار انگریزی میں ملازمت کی عزت حاصل کرنے کے لیے یہاں آکر مقیم ہو گئے تھے۔

3- خانؔ

اشرف علی خاں نام تھا۔ یہ خود تو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کے بزرگ دہلی کے رہنے والے تھے، جن دنوں نواب سعادت علی خاں بنارس میں مقیم تھے، یہ اُن کے سواروں میں شامل تھے، اپنے والد کے اشارے سے انھوں نے شیخ مصحفی کی شاگردی اختیار کی تھی[4] اور استاد کے بقول چار پانچ برس کی مشق کے نتیجے میں یہ اپنے برابر والوں پر سبقت لے گئے تھے، ان کے چند شعر یہ ہیں۔

الفت میں جفا کار وہ پُر فن نظر آیا — سمجھے تھے جسے دوست وہ دشمن نظر آیا

نام تیرا ہے گو کہ اشرف خاں — سب سے بدتر جہان میں تو ہے

ہر بات پہ کہتے ہو کہ دیوانہ ہے یہ بھی ہر بات پہ گالی ، کوئی یارانہ ہے یہ بھی
اے خاں غم فراق میں تم زہر کھا مرو اس کے سوا نہیں کوئی تدبیر دوسری

خان اپنے زمانے کے باکمالوں میں تھے۔ چنانچہ سعادت خاں ناصر نے ان کو ''خانِ سامانِ دیوان سخنوری'' اور ''شاعر غیور'' کہا ہے اور ان کے بعض شاگردوں کا احوال بھی لکھا ہے۔ مثلاً محمد ہادی علی خاں آشفتہ اور شیخ محمد جان مشفق وغیرہ۔

4-دیوانہ

بنارس کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے، دہلی تک گئے تھے، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے بھی ملے تھے۔ چنانچہ انھوں نے تحریر کیا ہے:

''دیوانہ تخلص مرزا محمد علی خاں از مردم بنارس است، بہ مناصب ممتاز انگریزی سرفراز ماندہ، در ایامے کہ بہ ہمراہی روشن الدولہ کولبرک ناظم جہان آباد بہ جہاں آباد آمدہ بود، بالفقیر ہم درخوردہ''۔5

لالا سری رام نے ان کے حالات میں کسی قدر اضافہ کیا ہے اور لکھا ہے:

''دیوانہ مرزا محمد علی خان باشندۂ بنارس، 1840 (=1256ھ) کے قریب روشن الدولہ کولبرک کے وقت میں دہلی میں رہے، پھر علی گڑھ میں تحصیلدار ہو گئے تھے''۔

ان کے کچھ شعر یہ ہیں۔

اس کا آخر اُدھر کلام ہوا اپنا قصہ اِدھر تمام ہوا
بتاؤ تو دست جنوں کیا کروگے گریباں میں جس دم نہ اک تار ہوگا
آیا نہ بعد مرنے کے بھی وہ مزار پر خاک اس کے پیچھے آپ کو ہم نے کیا عبث
مری سرگشتگی کو دیوانہ پہنچے کب آسمان کی گردش

5-جنوں

یہ دیوانہ کے بیٹے تھے۔ باپ کے تخلص کی مناسبت سے انھوں نے اپنا تخلص جنوں مقرر کیا، خویشگی نے ان کے حال میں تحریر کیا ہے:

''جنوں تخلص، مرزا نجف علی خاں، پسر نامور مرزا محمد علی خاں است، کہ

متخلص بہ دیوانہ است، وطن والد و مولود بنارس است، بیشتر در سرکار انگریزی بہ عہدہ
ہائے جلیل مثل تحصیلداری و سررشتہ داری مقرر بود، طبع موزوں و اردو فصاحت و لطافت
از کلامش می بارد"۔9

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

اپنے چہرے سے مت نقاب الٹ　　دیکھ جاوے نہ آفتاب الٹ
دل کو شاید کوئی ستاتا ہے　　قاصد اشک تیز جاتا ہے

6۔ضمیری

یہ جہانیاں جہاں گشت تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان کے بارے میں جو لکھا ہے مختصراً اس طرح ہے:

"ضمیری تخلص، مرزا مظہر تاجدار، ساکن بنارس، وارستہ مزاج، درویش وضع، ...سیاحی کے وسیلے سے نو اور روم و شام اور غرائب شرق و غرب اس کی نظر عبرت نگر سے گذر گئے تھے، اشعار فارسی اس کے درستی محاورہ سے خالی نہ تھے، زبان ریختہ بھی صاف ہے، مگر اس سے کم مشقی تراوش کرتی ہے، اب عرصہ دس برس کا ہوا کہ سفر آخرت کیا"۔10

ان کے دو شعر یہ ہیں۔

ہائے مطعون شیخ و شاب ہوئے　　تجھ سے مل کر بہت خراب ہوئے
یوں عادتوں کو تیری کیا کیا نہ جانتے تھے　　لیکن تجھے ستمگر ایسا نہ جانتے تھے

7۔شوکت

سرکار انگریزی کی سرپرستی میں عیسائی مبلغین اپنے عقائد کی تلقین و تبلیغ کرتے رہتے تھے، دنیاوی عزت و توقیر کے سامان ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ بعض بعض ہندو اور مسلمان بھی متاثر ہو کر ان کے مذہب کو قبول کر رہے تھے۔ شوکت بھی انھیں میں سے ایک تھے، شیفتہ کا بیان ہے کہ:

"شوکت تخلص، منیف علی خلف میر رستم علی از مردم بجنور است، فن نظم را از عشرت بریلوی گرفتہ، نقل کردہ اند کہ وے را در بنارس با شخصے از اہل فرنگ مخالطت فراواں رو دادہ، و بہ تعلیم و تحریص وے العیاذ باللہ ترک اسلام گفتہ بہ روش نصاریٰ بر آمدہ،

اکنوں در میرٹھ بہ تعلیم اطفال ازیں طایفہ بسری بُرد، وصنف مسیح نام کردہ است، ایں
ابیات ازاں قبیح مسیح دجال است"۔10

معلوم ہوتا ہے کہ پایۂ تخت دہلی اور اس کے مضافات یعنی میرٹھ وغیرہ مقامات پر عیسائی مشنری کا اثر زیادہ نہیں تھا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصے کے بعد شوکت عیسائی مذہب چھوڑ کر دوبارہ مسلمان ہوگیا تھا۔ خوشگی نے اس کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

"شوکت باز رجعت بہ اسلام کردہ وایمان را بخیر بُرد وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ، مزارش اندریں
قصباست، کہ وطن گاہ اوست"۔11

اس واقعہ سے دہلی اور بنارس کے ماحول کے فرق کا اندازہ کیا جانا چاہیے۔ تذکروں میں شوکت کے یہ دو شعر ملے ہیں۔

کاٹ ہے جو ابروِ خمدار میں ہے یہ بُرش کب کسی تلوار میں
مجھ میں اور ابر میں ہے معرکہ آرائی آج سرخرو کیجیو تو اے دیدۂ خونبار مجھے

8-نواب

بنارس میں جس زمانے میں اردو شاعری کا چلن ہوا وہ شیخ امام بخش ناسخ کا دور تھا اور جلدی ہی ان کے اثرات وہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے میں تحریر ہے کہ:

"نواب تخلص، سلالۂ خاندان سیادت، میر نواب، ساکن بلدۂ بنارس، صحبائے جناب
مرزا خورّم بخت مرحوم، ساکنین شہر مذکور کی نظر میں عزت واعتبار سے بسر کرتا ہے، شیخ
امام بخش ناسخ کی شاگردی کے ساتھ مشہور اور اب سخن سنجان بنارس کی زبان پر بہ حرف
استادی مذکور ہے"۔12

کہا جاسکتا ہے کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم کے وقت سے بنارس میں شعر وسخن کا وہ دور شروع ہوتا ہے جب وہاں ناسخ کے شاگردوں کے اثرات مرتب ہونے لگے تھے۔ نواب کے دو شعر یہ ہیں۔

پیکاں ہر ایک غنچہ ہے دن اس کے آنکھ میں نشتر ہے باغ میں مجھے نالہ ہزار کا
اپنی برہنہ پائی سے ہر آبلے کو آج کیا کیا مزہ ملا خلش نوکِ خار کا

9-ذوقا

بنارس کے رہنے والے کوئی جہاں گشت درویش تھے۔شہرت ان کی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی،شیفتہ نے لکھا ہے:

''ذوقا تخلص،ذوقا شاہ نام،از اہل بنارس درویشے است سرو پا برہنہ برہشت بہ میرٹھ ہم کشید''۔13

لالا سری رام کا کہنا ہے کہ میرٹھ آکر شرف الدین احمد کے پاس رہتے تھے14۔ان سے یہ دو شعر منسوب ہیں۔

قدر تم نے صاحب نہ جانی ہماری گئی رائگاں جاں فشانی ہماری

نے بام کی ہیں زیب،نہ زینت کسی در کے ہم ہاٹ کے روڑے ہیں اِدھر کے نہ اُدھر کے

ذوقا قواعد اور لغت کے پابند نہیں تھے۔جیسا بولتے تھے ویسا ہی نظم کر دیتے تھے۔کہیں کہیں محاوروں کی بندش سے کلام پُر لطف ہو جاتا ہے۔

(3)

10-صولت

وقت کے ساتھ ساتھ بنارس میں شعروسخن کا مذاق عام ہوتا جارہا تھا۔ چنانچہ صورت حال یہ ہوئی کہ اس شہر میں بعض ایسے گھرانے بھی ابھر کر سامنے آئے جن میں ایک سے زائد پشتوں تک شعرگوئی کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ مرزا قادر بخش صابر نے صولت تخلص کے ایک شاعر کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے:

''صولت تخلص، قاسم علی خاں، خلف کاظم علی خاں متخلص بہ حیراں، ابن نور خاں رستم دستاں متخلص بہ آگاہ، ابن قائم خاں مزاری، سکنائے بنارس، اور روشناس مردم معتبر ہے''-14

اس کے دو شعر یہ ہیں۔

تربت میں آنکھیں بعد فنا بھی کھلی رہیں — تھا زیست میں مزا جو مجھے انتظار کا

ہے شغل غزل خوانی بہت خوب، پہ صولت — دنیا کے ہمیں رنج سے فرصت نہیں ملتی

11-مہجور

محسن کے تذکرے میں ان کا تعارف اس طرح درج ہے:

''نواب اقبال الدولہ عنایت حسین خان بہادر مہجور خلف نواب نصیر الدولہ نصیر الدین
علی خان بہادر صمصام جنگ نصیر تخلص ابن نواب امین الدولہ عزیز الملک علی ابراہیم خان
بہادر نصیر جنگ خلیل باشندۂ بنارس، ایک دیوان، ایک تذکرہ ان کا ہے''۔15

ان کی تصانیف متعدد ہیں چنانچہ ان کا حال آگے آئے گا۔ یہاں ان کے صرف دو مطلعے نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

ہے جو آہوں کا ہماری یہ دھواں بالائے سر　　تازہ تر پیدا ہوا ہے آسماں بالائے سر
پھولا ہے آبلوں سے جو گلزار پاؤں میں　　کانٹے چبھیں گے کیونکہ نہ ہر بار پاؤں میں

12۔تصور

بنارس میں شعر وسخن کا شوق تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ بعض شاعروں نے اپنے دیوان بھی مرتب کرنے شروع کر دیے تھے۔ رامپور کی رضا لائبریری میں تصور علی خاں تصور بنارسی کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ جس کی کتابت 1261ھ (1845) میں 145 ورقوں پر شاعر نے خود اپنے ہاتھ سے کی تھی۔

(ب)-ہزل وغیرہ

جیسا کہ مذکور ہوا بنارس میں اردو شاعری کا رواج بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔ اُس ابتدائی زمانے میں سیاح اور فقیر منش شاعروں کے زیر اثر کچھ اشعار ظریفانہ انداز کے بھی کہے جارہے تھے۔ پھر کچھ شاعروں نے اسی طرز کو اپنالیا۔ مرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرے میں ان میں سے بعض کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

1-ظریف

"ظریف تخلص، میر امان اللہ، اصل اس کی لاہور ہے، لیکن چالیس برس سے ترک وطن کیا اور بیشتر بنارس اور کمتر شاہجہاں آباد میں مقیم رہا۔ اب حسب ضرورت عیال اور اطفال کے ساتھ بلدۂ لکھنؤ میں ہے۔ یہ شعر اس کا یاد تھا۔

وعدۂ وصل تلک بھی نہ جیے صد افسوس مر کے ہم ایسے پشیماں ہیں کہ جی جانے ہے"[1]

مرنے سے پہلے مرنے کے مضمون کا نظم کیا جانا اس زمانے میں عام تھا، چنانچہ اس شعر میں بھی یہی صورت ہے۔ زبان پر قدامت کا اثر نمایاں ہے۔ شاعر نے اپنے تخلص کی مناسبت سے عام مطالب میں بھی ظرافت کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسوس ہے کہ اس ظریف کا مزید کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔

2-وجود

''وجود تخلص، سید محمد علی ساکن بنارس، ہزل گوئی میں زبان اس کی دا اور سلسلہ اس کی شاگردی کا صاحقراں تک پہنچتا ہے۔ تذکرہ کی ضرورت سے یہ ایک شعر مرقوم ہوا''۔2

تذکرے کے مرتب نے فحش ہونے کی وجہ سے وجود کے مذکورہ ایک شعر کو بھی نقل نہیں کیا ہے۔ بہر حال اس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ شاعر فحش گو بھی تھا اور اسی طرز کو وہ ہزل گوئی خیال کرتا تھا۔

3-دیوانہ

عبدالباری آسی نے اپنے تذکرے میں دیوانہ تخلص کے ایک شاعر کا حال مختصراً اس طرح لکھا ہے:

''دیوانہ طالب علم نام تھا، بنارس میں قیام تھا، اور یہ نمونہ کلام تھا، 1872 (1289ھ) تک زندہ تھے۔

اپنے مرنے کا کیا دعویٰ تو بولے ہنس کے — بولتے ہو مر کے، تم دنیا میں زندہ پیر ہو وہ

بندہ بے داموں بکا ہے آپ کی سرکار میں — شوق سے بیچو کھڑا کر کے مجھے بازار میں

مجھ کو حیرت ہے لڑائی کے لیے چھوڑا ہے کیا — گالیاں دیتے ہیں وہ دشمن کو ہر دم پیار میں

ہو گیا ناز اُن کو اپنے حُسن پر حد سے سوا — جو نہ کہنا تھا کہا سب ہم نے ان سے پیار میں

آسی نے ذوقا شاہ وغیرہ کا بھی ذکر اپنے تذکرے میں مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے کیا ہے۔

(ج) مثنوی

طویل نظمیں عموماً اسی زمانے میں لکھی جاتی ہیں جب دل و دماغ کو سکون میسر ہو۔ بنارس میں بظاہر یہ صورت موجود نہیں تھی۔ اس لیے بہ گمانِ غالب وہاں مثنویوں کے لکھے جانے کا رواج نہیں ہو سکا تھا۔ ایک دو مثنویوں کے ایسے قلمی نسخے دستیاب ہیں جن کی کتابت اسی شہر میں ہوئی تھی۔ لیکن وہ مجہول المصنف ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں کچھ کہنا لاحاصل ہے۔

1 - ثابت

مرزا ثابت علی بیگ نام، ثابت تخلص، آ کا حسن علی بیگ کے بیٹے تھے۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اور عارف اللہ شاہ ملول لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔ غزل کے علاوہ لکھنؤ میں مرثیہ کہنے کے لیے بھی معروف تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے فرزند نواب امین الدولہ معین الملک مرزا مینڈو بہادر ناصر جنگ امیر تخلص کے وابستگان دولت میں سے تھے۔ ثابت نے 1258ھ (=1842) سے چند سال پہلے وفات پائی تھی۔

نواب سعادت علی خاں کے آخر زمانے میں مرزا ثابت علی بیگ ثابت کسی ضرورت سے بنارس میں آئے تھے۔ یہاں کی رونقیں دیکھیں۔ دل لگ گیا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ یہیں رہ پڑے، یہاں سے واپس جانے کے لیے دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ عاشق مزاجی رنگ لائی اور یہاں رہ کر

انھوں نے کم سے کم تین مثنویاں لکھ ڈالیں۔ اپنی نوعیت میں یہ تینوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لحاظ سے بہت توجہ کے لائق ہیں۔

1-مثنوی سیر بنارس:

یہ مثنوی ثابت نے بنارس پہنچنے کے کچھ ہی مدت بعد لکھی ہوگی۔ اس میں اپنے بنارس میں آنے کے ذکر کے علاوہ، اس شہر کے کوچہ و بازار کی رونقوں اور یہاں کے بسنے والوں کی خوش حالی وغیرہ کا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شاعر کا دل یہاں کے حالات سے بہت متاثر ہوا ہے، کہتا ہے۔

جو ہے شہر میں خورّم و شاد ہے　　غرض خوب وہ شہر آباد ہے

اس ذکر کے بعد شاعر نے اپنے دل کی بات اس شعر میں کہہ دی ہے۔

اسی شہر میں دل مرا لگ گیا　　مگر دل کو ایک راہزن ٹھگ گیا

اسی سلسلے میں شاعر نے بنارس کے راجا اودت نرائن کی مجلس عیش و طرب کا ذکر کر کے مثنوی کو ختم کر دیا ہے، آخر میں سلطان ہند (= اکبر شاہ ثانی؟) اور نواب عالی مقام وزیر زماں (= سعادت علی خاں؟) اور مہاراج (= مداری لال؟) کی خوش و خرّمی کے لیے بھی دعا کی ہے۔

اس مثنوی میں کُل تین سو ستاسی شعر بنائے گئے ہیں، آغاز ان شعروں سے ہوتا ہے۔

خدا کی ثنا کیجیے کیا مجال　　کہ اس میں زباں انبیا کی ہے لال

دہن نطق کا غنچہ ساں تنگ ہے　　فرس عقل و فرہنگ کا لنگ ہے

فرس اس میں گم گشتۂ آوازہ ہے　　نے کلک اک بے نواساز ہے

اور اس کے خاتمے کے اشعار یہ ہیں۔

سخن سے مرے سب کو محظوظ رکھ　　مجھے آفت بد سے محفوظ رکھ

الٰہی بحق رسولؐ و بتولؓ　　سخن کو مرے بخش حُسن قبول

الٰہی بحق علیؓ ولی　　جہاں میں ہو مشہور یہ مثنوی

2-مثنوی در ہجو بقال:

یہ ثابت کی بظاہر دوسری مثنوی ہے۔ اس میں گنگا رام نام کے ایک بقال کی بیوی کے عاشق کا حال نظم کیا ہے۔ مثنوی کا آغاز ان شعروں سے ہوا ہے۔

یارو اک نقل ہے یہ طرفہ تر　　لوٹ دل ہوگیا جسے سُن کر
ایک بنیا تھا ایک بستی میں　　اس کی جورو جو آئی مستی میں
آنکھ ہر شخص سے لڑانے لگی　　راہ چلتوں کو یوں لگانے لگی

اس عورت کی ایک مرزا صاحب سے آشنائی ہوگئی تھی۔ ثابت بقول خود "مرد عاشق مزاج" تھے اور ایک مثنوی میں اپنے ایک معاشقہ کا حال نظم بھی کر چکے تھے۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ یہاں بھی "مرزا جی" سے وہ خود ہی مراد ہوں۔ مثنوی کا خاتمہ ان شعروں پر ہُوا ہے۔

تب تو بقال پیٹ سر بولا　　سچ ہے جی، ہوگا موتی انمولا
رکھے پرمیشور اب ہماری لاج　　آج مینہ برسا کل پڑے گی گاج

یہ مثنوی مختصر ہے۔ اس میں کل سینتالیس شعر ہیں۔

3- خط منظوم:

ثابت کے شاہ اجمل الہ آبادی کے ساتھ عمدہ روابط تھے۔ جب انھوں نے وفات پائی تو ثابت نے چار شعروں پر مشتمل قطعۂ تاریخ کہا، آخری شعر یہ ہے۔

باغبان ارم زردئے ایوب　　گفت آمد برائے سر بہشت

1 + 1235ھ=1236ھ

شاہ اجمل کے صاحبزادے شاہ ابوالمعالی عالی ان کی جگہ سجادہ نشیں ہوئے، یہ ثابت کے خرد تھے اور ثابت ان سے محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ بنارس جانے سے پہلے غالباً ثابت الہ آباد میں بھی مقیم رہے ہوں گے، ثابت کو الہ آباد سے نکلے ہوئے کئی برس ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ابوالمعالی نے اس پر تشویش کا اظہار کر کے انھیں الہ آباد آنے کے لیے لکھا تھا۔ جواب میں ثابت نے یہ منظوم خط ارسال کیا تھا۔ شروع اس طرح کیا ہے۔

شاہ صاحب مہربان دوستاں　　لطف فرما، قدر دان دوستاں
منکشف ہو آپ پر بعد سلام　　ثابت مہجور کا حضرت پیام

اس کے بعد کہتے ہیں کہ میں نے جو مدت سے خط نہیں لکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میں یہاں (بنارس میں) ایک پری رو پر عاشق ہو کر ہوش و حواس گم کر بیٹھا ہوں۔ آنا چاہتا ہوں مگر موقع

نہیں ملتا، اس خط میں کل اُنتیس شعر ہیں۔ آخری شعر یہ ہیں۔

دیکھیے کب دن یہ دکھلائے خدا　　تم تلک پھر مجھ کو پہنچائے خدا
ہے یہی میری دعا ہر صبح وشام　　پھر تمھیں دیکھوں ، زیادہ والسلام

ظاہر آیہ خط شاہ اجمل کی وفات کے بعد کسی زمانہ میں لکھا گیا ہوگا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے فہرست نویس (افسر صدیقی امروہوی) نے ثابت کی مثنویوں کا زمانہ "تقریباً 1250ھ" لکھا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مثنویاں یکے بعد دیگرے نہیں لکھی گئی تھیں، ان کے درمیان میں کئی کئی برس کا وقفہ حائل ہوسکتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ درمیانی مدت میں ثابت نے اور بھی ایک یا زائد مثنویاں لکھی ہوں۔

مذکورہ تین کے علاوہ مرزا ثابت علی بیگ ثابت کی اور بھی چند مثنویاں دستیاب ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب اور کہاں لکھی گئی تھیں۔ ان مثنویوں کی کیفیت اس طرح ہے۔

4- مثنوی گلشن عشق:

دستور کے مطابق یہ مثنوی بھی حمد ونعت سے شروع ہوتی ہے اور اس میں حمد کا جزو خاصا طویل ہے۔ حمد ونعت کے بعد شاعر نے پانچ شعر مداری لال کی مدح میں کہے ہیں۔ اس شخص کے حالات تو معلوم نہیں ہوسکے، البتہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بنارس کے امرا میں سے تھے۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ مثنوی وہیں لکھی گئی تھی اور قیاساً اس میں شاعر نے اپنے اسی معاشقہ کا بیان کیا ہے جس کا تذکرہ اس نے شاہ ابوالمعالی کے نام کے نامۂ منظوم میں کیا ہے۔

مرزا ثابت نے اپنی مثنوی گلشن عشق میں ایک عنوان اس طرح بھی قائم کیا ہے:

"داستان در بیان حالت ثابت کہ مرد عاشق مزاج است"

اس کے علاوہ اور بھی کئی عنوانات میں شاعر کا تخلص آیا ہے مثلاً:

"عاشق شدن ثابت ناکام بر دلارام"

"رفتن ثابت دیوانہ وار بہ تلاش آں دلآرام گلعذار"

"رفتن ثابت در کوچۂ دلارام وتوجہ نمودن آں نگار"

''نامہ نوشتن ثابت بہ سوئے ولا رام''۔

مثنوی کے آخر میں دونوں طرف کی خط و کتابت بھی نقل ہوئی ہے اور پھر دونوں کے ملنے اور ایک جگہ پر ساتھ رہنے کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس مثنوی میں ساڑھے سات سو کے قریب اشعار ہیں۔

5-مثنوی بحر حیرت:

یہ بھی ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں ایک خوبصورت جوہری زادہ پر ایک ''مسلمان صاحب تمکین طالب علم'' کے عاشق ہونے اور اسی عشق میں مبتلا رہ کر دونوں کے مرجانے کا بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کوئی پونے چار سو شعروں پر مشتمل ہے، شروع کے شعر یہ ہیں۔

نے صنم ہے نہ برہمن ہے عشق — مظہر رب المنن ہے عشق
عشق سے کوئی شے نہیں باہر — پرتو عشق سب میں ہے ظاہر
عشق سا آہ سحر ساز نہیں — اس سے دل کون سا گداز نہیں

اور خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

مجھ سے بولے بہ دیدۂ پُر خوں — ثابت اس قصے کو تو کر موزوں
ان کی خاطر سے میں نے بادل زار — بیٹھ کر نظم یہ کیے اشعار
جب سُنی مثنوی انھوں نے تمام — بحر حیرت تب اس کا رکھا نام

6-خط بہ نام ہیرالال:

اس ہیرالال کا احوال وثوق سے کچھ معلوم نہیں۔ افسر صدیقی امروہوی نے اس کے بارے میں اتنا لکھا ہے:

''ہیرالال نام ایک پٹواری تھا۔ وہ شاید راجا کا دیوان ہو گیا تھا۔ اس خط میں مرزا ثابت نے اس سے اپنی تنخواہ کا تقاضہ کیا ہے''۔1

شیخ محمد ابراہیم ذوق کے ایک شاگرد کا احوال لالا سری رام کے تذکرے میں اس طرح لکھا ہے:

''عبرت منشی دولت رام دہلوی ولد رائے ہیرالال برادر زادۂ راجا کنول نین مرحوم

ساکن کوچہ بلاقی بیگم، صدی پیشہ تھے، 1289ھ (1876) میں ستر برس کی عمر پائی قضا کی"۔2

اگر یہی وہ ہیرالال ہو جس کے نام مرزا ثابت علی بیگ کا یہ منظوم خط ہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ مرزا ثابت دہلی میں بھی رہے تھے۔ اس خط میں کل اٹھائیس شعر ہیں۔ نامہ کو انھوں نے شروع اس طرح کیا ہے۔

جا کے ہیرا لال سے بعد از سلام　　کہہ صبا میری طرف سے یہ پیام
اے لعین روسیہ اے بد گہر　　حیلہ سازی کام میں میرے نہ کر

ثابت نے اس خط کو ان شعروں پر تمام کیا ہے۔

سوچ اے دیوانے از خود بے خبر　　کس طرف بھولا ہے اپنی لے خبر
آج تو اتنا ہی کر بھیجا رقم　　کل چلا دونگا ترے آکر قلم

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے معاملات میں ثابت خاصے سخت تھے۔

مرزا ثابت علی بیگ ثابت قادرالکلام اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کی مثنویوں کی زبان اور ان کے طرز بیان میں پختگی ہے۔ اور یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہر قسم کی مثنوی لکھنے پر قادر تھے۔

(ب) ظہور

ان کا مذکور پہلے آچکا ہے۔ محسن نے ان کا احوال اس طرح لکھا ہے:

"منشی شیخ ظہور محمد ظہور، نام میں تاریخ تولد کا ظہور ولد منشی اسماعیل عرف منشی نہال بن حافظ محمد صالح باشندہ بلگرام، صاحب دیوان و ایک مثنوی مسمی بہ ظہور عشق ان سے یادگار ہے، شاگرد غلام ہمدانی مصحفی"۔3

ظہور کی مثنوی ظہور عشق کو شہرت ملی تھی۔ چنانچہ عبدالغفور خاں نساخ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ شاید یہ آخر زمانے میں لکھی ہوگی۔ اسی لیے مصحفی کے تذکرے میں اس کا بیان نہیں آیا۔ اب ظہور کی بعض دوسری تحریروں کی طرح یہ مثنوی بھی نایاب ہے۔

(ج) مہجور

عنایت حسین خاں مہجور کا حال لکھا جا چکا ہے۔ انھوں نے بہ کثرت مثنویاں بھی لکھی تھیں اور

ان کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔اس کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ۔

سوا سو مثنوی ہے اس میں مرقوم　　کہ ان کا حال ہو دیکھے سے معلوم

افسوس کہ مہجور کی مثنویاں بھی ہمیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔

(د) نثر

بنارس میں شعر وسخن کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو نثر نویسی کو بھی چلن حاصل ہوا۔ اس شہر میں کئی لوگوں نے کم وبیش ایک وقت میں نثری کتابیں لکھی تھیں۔

1 - ظہور محمد

ان کا شاعر کی حیثیت سے مختلف تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے۔ سعادت خاں ناصر نے بھی لکھا ہے کہ:

''صاحب عقل وشعور، منشی ظہور محمد تخلص ظہور، خلف منشی اسماعیل عرف منشی نہال ساکن بلگرام، پہلے سلام ومرثیہ کہہ کر ثواب حاصل کرتا تھا، بعدۂ غزل گوئی اختیار کی اور متابعت کی میاں مصحفی کی''۔1

ظہور محمد کے استاد شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اردو نثر میں ان کی دو تصنیفوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ اس طرح ہیں:

''ظہور.... دو کتاب نثر در ہفت یکے بہ انیس ظہور دوگرے خاتم سلیمان نیز تحریر ساختہ است وایں ہمہ از اصلاح فقیر درست شدہ است''۔2

معلوم ہوتا ہے کہ ظہور کی یہ دونوں نثری کتابیں بہت جلد ضائع ہوگئیں۔اس لیے محسن بھی ان سے واقف نہ ہوسکا اور اس کا تذکرہ بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔

2-فخر الدین

مفتی سید نور الہدیٰ کے خلف رشید مفتی حکیم سید فخر الدین احمد محمد آباد بنارس کے رہنے والے صاحب علم اور طبیب حاذق تھے۔انھوں نے عربی اور فارسی میں علم طب سے متعلق کتابوں کو مشکل خیال کر کے عوام الناس کے فائدے کے لیے اردو میں ایک کتاب لکھی جس کا تاریخی نام

"مظہر العجائب"

1262

مقرر کیا، افسر صدیقی امروہوی نے اس کا سال تصنیف 1212ھ لکھا ہے 3 اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اسی کو اس کی طباعت کا سال بتایا ہے۔1212ھ میں بنارس ہی نہیں لکھنو اور کانپور وغیرہ میں بھی مطبعے قائم نہیں ہوئے تھے۔اس لیے اس سال میں کتاب کے طبع ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"مظہر العجائب" سے 1262 کے عدد حاصل ہوتے ہیں۔البتہ اگر یائے تحتانی کے بجائے ہمزہ کا عدد ایک شمار کریں تو اس کتاب کا سال تصنیف 1253ھ (=1837) ماننا ہوگا۔اس کتاب کے مطالب اس طرح ہیں:

پہلا باب امور طبعیہ کے بیان میں۔اس میں پانچ فصلیں ہیں۔

دوسرا باب تشریح کے ذکر میں۔اس میں سات فصلیں ہیں۔

تیسرا باب انسان کے بدن کا حال اور اس کے علامات و اسباب کے بیان میں اس میں چار فصلیں ہیں۔

چوتھا باب نبض اور قارورہ کی بحث میں اس میں چھ فصلیں ہیں۔

پانچواں باب تندرستوں کی تدبیر اور بیماروں کے علاج کے ذکر میں اس میں دس فصلیں ہیں۔

ڈاکٹر ابو اللیث کے اندراج کے مطابق یہ کتاب 192 صفحوں پر مطبع اسماعیلیہ لکھنؤ سے 1212ھ میں چھپ کر شائع ہوئی تھی اور سال طباعت اس کا جیسا کہ مذکور ہوا 1253ھ اور

اس میں:

''طب یونانی کے اصول، امزر طبعیہ، تشریح الاعضاء، اور تشخیص و تجویز کے اصول''4

قلمبند کیے گئے ہیں۔ چھپ جانے کے باوجود یہ کتاب بھی اب تقریباً نایاب ہے اور اس کے بارے میں فی الوقت کوئی اور بات اور مفید مطلب معلوم نہیں ہو سکی ہے۔

3- مہجور

عنایت حسین خاں مہجور کا غزل گو کی حیثیت سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ کلب حسین خاں نادر نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''مہجور اقبال الدولہ نواب عنایت حسین خاں، صاحب دیوان خلف نواب نصیر الدین علی خاں.... حاکم عدالت بنارس''۔5

انھوں نے خود اپنی تصانیف کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''پانچ دیوان، دو خیالی افسانے، ایک مجموعۂ مثنویات، اور ایک مجموعۂ ادعیہ و نقوش و نسخہ جات''۔6

افسوس ہے کہ ان کی بیشتر تصانیف اب دستیاب نہیں ہیں۔

1959 میں ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی نمائش کتب میں ان کی ایک طویل نثری داستان بھی آئی تھی جس کا نام ''سلطان القصص'' ہے۔ اس داستان کا قلمی نسخہ سید محمد علی خاں صاحب حسین آباد شیخ پورہ ضلع مونگیر کی ملکیت میں تھا۔ فی الوقت یہ داستان ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ خود مہجور کے بیان کردہ دو خیالی افسانوں میں یہ داستان بھی شامل تھی یا یہ ان کے علاوہ ہے۔

4- نامعلوم

اردو نثر میں بنارس کے علاقے میں اس ابتدائی دور میں اور بھی بعض تحریریں وجود میں آئی تھیں۔ ان میں کچھ کے بارے میں اب تفصیلات دستیاب نہیں ہیں مثال کے طور پر ایک مجہول المصنف رسالہ جس میں نظم و نثر ملی ہوئی ہے ''تنبیہ بے نمازاں'' کے نام سے انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کا ترقیمہ اس طرح ہے:

''یہ نسخہ تنبیہ بے نمازاں کا بہ فضل اللہ المستعان باہتمام.... بہ تاریخ پانزدہم ماہ نومبر

1849 مطابق بتاریخ بست وہشتم ماہ ذی الحجہ مبارک 1265 ھ نبوی ﷺ روز
پنجشنبہ بوقت پہر روز برآمدہ بخط خام ناقرجام بندہ گلدار خاں بطبع ڈاکٹر اچیسن؟ اسپتال
بمقام چھاؤنی سکرول بنارس مختتم رسید، فقط"۔8

اس میں لفظ "نیٹو" (NATIVE) خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ ہندوستانیوں کے لیے اس لفظ کا استعمال اس وقت تک ظاہراً شمالی ہندوستان کے دوسرے مراکز پر عام نہیں ہوا تھا۔ اردو نثر و نظم پر بنارس کے علاقے میں انگریزی معاشرت وغیرہ کے علاوہ الفاظ و مصطلحات کا بھی چلن غالباً جلد ہو گیا تھا۔

اگرچہ بنارس میں جلدی ہی مطبعے قائم ہو گئے تھے۔ کتابوں کی طباعت کا رواج کسی قدر بعد میں ہوا تھا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ بنارس کی کئی مفید تصنیفات وقت کے ساتھ ضائع ہو گئیں۔

(۵) تذکرہ

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں بنارس میں صرف ایک تذکرے کا لکھا جانا معلو ہوتا ہے۔ اس تذکرے کا نام ''مدائح الشعرا'' ہے اور اس کے مؤلف عنایت حسین خاں مہجور تھے۔ مہجور نے اپنے اس تذکرے کے بارے میں خود کہا ہے ۔

لکھا اک تذکرہ ہے شاعروں کا　　خود اس کے طرز کا موجد ہے بندہ
کلام وشعر کو ہر ایک کے بس　　مثلّث اور مربّع اور مخمس
کیا اس تذکرے میں میں نے داخل　　ہوا یہ طرز تازہ تر ہے حاصل

مہجور کے ایک عرصے کے بعد عبد الغفور خاں نساخ نے مثلث وغیرہ کے بجائے مختلف شاعروں کے قطعات جمع کر کے ایک تذکرہ قطعۂ منتخب کے نام سے تالیف کیا تھا۔ مہجور نے اپنے تذکرے کے ''سبب تالیف'' میں اس کی کیفیت اس طرح قلمبند کی ہے:

''مطابق ارشاد بعضے دوستان یک دل و یک رو موزوں طبعان رنختہ گو بہ خاطر وتردد
ذخایر آوردہ کہ بہ رُخے از کلام بلاغت التزام شاعران رنگین بیان را مخمس ومسدس
ومثلّث ومربّع نمودہ زیب اوراق بیاض نماید، آں را ذخیرہ ساختم وبہ تذکرۂ مدائح

الشعراء موسوم گردانیدم، بالجملہ چوں بہ سبب سکونت ایں دیار بسیار از بسیار تحریر اشعار
تذکیر اطوار شعرائے سخن رس بنارس مخلوط و منظور بود، لہذا تذکرہ مختصر شد"۔1

اس تذکرے میں کُل اڑسٹھ شاعروں کا حال مندرج ہے اور ان میں تخلصوں کے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب قائم کی گئی ہے۔ اس تذکرہ کا زمانہ تالیف 1253ھ (1837) سے کچھ پہلے خیال کیا گیا ہے اور اس میں 1260ھ (1844) تک اضافے کیے گئے ہیں۔

مطبع

راجا صاحب کے چلے جانے کے بعد بنارس پر انگریزوں کا پوری طرح تسلط ہو گیا اور اس شہر میں بھی انھوں نے اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق کاروبار شروع کر دیے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس شہر میں انگریزی طریقۂ علاج اور ادویہ کے کام کو زیادہ ترقی ہوئی۔ بعد کے زمانے میں وہاں سے انگریزی اور ہندوستانی معالجہ وغیرہ سے متعلق کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں۔

بنارس میں پہلا مطبع 1826 /42-1241ھ میں مطبع میڈیکل ہال کے نام سے قائم ہوا تھا۔ نادر علی خاں پر تعجب ہے کہ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے:

"(علی گڑھ) آزاد لائبریری میں (اس مطبع کی) 1826 کی مطبوعہ کتاب محفوظ ہے"۔[1]

اس کتاب کو اگر انھوں نے خود دیکھا ہوتا تو اس کا نام ضرور لکھتے۔ افسوس ہے کہ راقم کو اس کتاب کا حال معلوم نہیں ہو سکا اس لیے وہ خاں صاحب کے اس بیان کی تصدیق نہیں کر سکتا ہے۔

حواشی

صفحہ

1-مجموعہ نغز جلد2 ص374

2-ریاض الفصحا ص207

3-ایضاً ص192 تا193

4-ایضاً ص90

5-خوش معرکۂ زیبا جلد1 ص474

6-گلشن بے خار ص73

7-سخنانہ جاوید جلد3 ص218

8-گلشن ہمیشہ بہار ص105

9-گلستان سخن جلد2 ص173

10-گلشن بے خار ص113

11-گلشن ہمیشہ بہار ص198

12-گلستان سخن جلد2 ص451

13-گلشن بے خار ص83

14-گلستان سخن جلد2 ص136

15-سراپا سخن ص367

ہزل

صفحہ

1-گلستان سخن جلد2 ص186

2-ایضاً جلد2 ص464

3-خندۂ گل ص221

4-ایضاً ص226

مثنوی

1-اردو مخطوطات انجمن کراچی جلد5 ص264تا267

2-مخزنہ جاوید جلد2 ص571تا572

3-سراپا سخن ص138

نثر

1-خوش معرکۂ زیبا جلد2 ص427

2-ریاض الفصحاء حاشیہ ص193

3-اردو مخطوطات انجمن کراچی جلد3 ص27تا28

4-سائنسی ادب کا اشاریہ ص4

5-تذکرہ نادر ص153

6-دستور الفصاحت دیباچۂ مصحح ص96

7-مخطوطات نمائش پٹنہ ص29

8-اردو مخطوطات انجمن کراچی جلد6 ص4تا5

تذکرہ

1-اردو شعرا کے تذکرے ص295تا302
2-دستور الفصاحت دیباچۂ مصحح ص95تا97

مطبع

1-ہندستانی پریس ص101

ماخذ

[متن میں جن کتابوں کا تعارف یا تجزیہ کیا گیا ہے ان کا نام اس فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے]

1-آب حیات	مولانا محمد حسین آزاد	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ	1920
2-آصفیہ کتب خانہ کے اردو مخطوطات	پہلی ودوسری جلد	مرتبہ نصیر الدین ہاشمی	
3-اردو رباعیات	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1963
4-اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	انجمن ترقی اردو کراچی	1998
5-اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن ترقی اردو ہند دہلی گڑھ	1969
6-اردو مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی	جلد 2، 3، 5	مرتبہ انور صدیقی امروہوی	1775
			1978
7-اردو مخطوطات خدا بخش لائبریری پٹنہ	جلد اول	مرتب عابد امام زیدی	1964
8-اردو مخطوطات سمینار خدا بخش //	1987	شائع کردہ خدا بخش لائبریری	1999
جنوبی ایشائی علاقائی		پٹنہ	
9-انتخاب دواوین	امام بخش صہبائی	شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی	1987
	مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی		
10-انتخاب یادگار (تذکرہ)	امیر مینائی	اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ	1982
11-باندہ اور غالب	صالحہ بیگم قریشی	شائع کردہ برگ اکادمی باندہ	1994
12-بمبئی کی جامع مسجد کے اردو مخطوطات	مرتب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی	مطبوعہ دہلی	1990
13-بیاض غالب (نو دریافت)	نقوش۔ غالب نمبر حصہ دوم	مطبوعہ نقوش پریس لاہور	1984
	مدیر محمد طفیل	بار دوم	
14-تذکرۃ الذاکرین	مولف سید آغا اشہر لکھنوی	شمسی پریس جھانسی	1946
15-تذکرہ سرور (عمدۃ المختار)	میر محمد خاں سرور	مرتب خواجہ احمد فاروقی	دہلی 1961
16-تذکرہ شعرائے بے پور	احترام الدین احمد شاغل	انجمن ترقی اردو دہلی گڑھ	1958
17-تذکرہ نادر	کلب حسین خاں نادر	مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی	

		کتاب نگر لکھنؤ	1957
18-تذکرہ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	مرتبہ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو ہند	
19-تذکرہ اردو مخطوطات	جلد 1، 4	مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مطبوعہ	1984
20-تلخیص معمّا	کلب حسین خاں نادر	مرتبہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ	
21-جائزہ مخطوطات اردو	مشفق خواجہ	مرکزی اردو بورڈ لاہور	1979
22-خمخانۂ جاوید جلد 3 تا 5	لالا سری رام دہلوی	مطبوعہ دہلی	
23-خمخانۂ جاوید جلد 4	مرتب خورشید خاں یوسفی	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	1990
24-خندۂ گل	عبدالباری آسی الدنی	نگار شین پریس لکھنؤ	1929
25-خوش معرکۂ زیبا جلد 1، 2	سعادت خاں ناصر مرتبہ مشفق خواجہ	مجلس ترقی ادب لاہور	1972
26-دستور الفصاحت	احمد علی خاں یکتا مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی	ہندوستانی پریس رام پور	1943
27-دہلی کے اردو مخطوطات	ڈاکٹر صلاح الدین	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	1975
28-دہلی کا یادگار مشاعرہ	مرزا فرحت اللہ بیگ	ایجوکیشنل بک ڈپو	
29-دیوان اعظم	سید اعظم علی اعظم الہ آبادی	بہ اہتمام منشی سدا سکھ لال بک ہاؤس علی گڑھ	سال طبع 1285
30-دیوان ذوق	شیخ محمد ابراہیم ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد	علمی پرنٹنگ ورکس دہلی	1933
31-دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ)	بہ اہتمام امر جان	ساکار پبلشرز، بمبئی مطبع احمدی دہلی شاہد	1988
32-دیوان غالب۔ تاریخی ترتیب سے	مرتب کالی داس گپتا رضا	مع تقریظ نیر درخشاں	1861
33-دیوان نوازش	آغا نوازش حسین خاں عرف مرزا خاں مرتبہ قاضی عبدالودود	شائع کردہ خدا بخش لائبریری پٹنہ	1993

34-راجستھان میں اردو ادب کے لیے غیر مسلموں کی خدمات	ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی	عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک	1985
35-راجستھان میں اردو زبان وادب 1857 تک	ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی	راجستھان اردو اکادمی جے پور	1992
36-ریاض الفصحا	غلام ہمدانی مصحفی	مرتبہ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو ہند	
37-ریاض دلربا	گمانی لال	مرتب ڈاکٹر ابن کنول ڈبائیوی	
38-ساختی ادب کا اشاریہ	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	مقتدرہ قومی زبان کراچی	1981
39-سخن شعرا	عبدالغفور خاں نساخ	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	1982
40-سراپا سخن	سید محسن علی موسوی	مطبع نولکشور لکھنو	
41-سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر صابر علی خاں	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	1956
42-شوکت نادری (تذکرہ)	کلب حسین خاں نادر	اردو ترجمہ: ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نامی پریس لکھنؤ	1984
43-صبح گلشن	سید علی حسن خاں	مطبع مفید عام آگرہ	1298ھ
44-صوبہ شمالی مغربی کے اخبارات	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	1962
45-صہبائی ایک مختصر تعارف	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ	1986
46-طبقات شعرائے ہند	مولوی کریم الدین	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	1983
47-طور کلیم	سید نور الحسن خاں کلیم	مطبع مفید عام آگرہ	1298ھ
48-علما کا حصہ اردو نثر کے ارتقا میں	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	1988
49-علی گڑھ کے اردو مخطوطات	مرتبہ ڈاکٹر عطا خورشید	شائع کردہ خدا بخش لائبریری پٹنہ	1995
50-عود ہندی (غالب کے خطوط)		مطبع رام نرائن لعل الہ آباد	1912
51-غالب ہمہ گیر انی (کتابیں)	محمد انصار اللہ	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	
52-فہرست مخطوطات نرائن پٹنہ	مرتبہ قاضی محمد سعید	ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ	1959 1975

53-قاموس الکتب جلد 1 تا 2	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو کراچی	1961
54-کاشف الحقائق	نواب لمداوامام اثر	کارونیشن پریس لکھنؤ	
55-کاملان رامپور (تذکرہ)	احمد علی خاں شوق	خدا بخش لائبریری پٹنہ	1985
56-کلیات ذوق (اردو)	مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی دوسرا ایڈیشن	1989
57-گلستان بے خزاں	حکیم میر قطب الدین باطن	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	1982
58-گلستان سخن (دو جلد)	مرزا قادر بخش صابر گورگانی	مجلس ترقی ادب لاہور	1966
59-گلشن بے خار	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	1982
60-گلشن ہمیشہ بہار	نصر اللہ خاں خویشگی مرتبہ اکبر اسلم فرخی	انجمن ترقی اردو کراچی	1967
61-گلشن ہند	مرزا علی لطف	مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	1906
62-گلزار ابراہیم	علی ابراہیم خاں خلیل مرتبین محی الدین قادری زور مولوی شبلی و مولوی عبدالحق		
63-لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	شائع کردہ غضنفر اکیڈمی کراچی	1987
64-مجالس رنگین	سعادت یار خاں رنگین	مرتب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب	
65-مجموعہ نغز	قدرت اللہ قاسم مرتب حافظ محمود خاں شیرانی	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	
66-مخطوطات اردو رامپور لائبریری	مرتب امتیاز علی خاں عرشی	مطبوعہ رامپور	
67-مخطوطات پنجاب پبلک لائبریری لاہور	مرتب منظور احسن عباسی		1964
68-مخطوطات اردو گنج بخش	سید عارف نوشاہی	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	1988
69-مخطوطات اردو ذخیرہ کاشیرانی میں	سید جمیل احمد رضوی	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	1986
70-مقالات شیرانی جلد 1 تا 3	مرتبہ اکبر مظہر محمود شیرانی	مجلس ترقی ادب لاہور	1966
71-مقالات شیرانی جلد 9	مرتبہ اکبر مظہر محمود شیرانی	مجلس ترقی ادب لاہور	1999

72-نسخۂ شیرانی اور دوسرے مقالات — سید قدرت نقوی — مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور — 1988

73-نسخۂ حمیدیہ دیوان غالب — مرتب پروفیسر حمید احمد خاں — مجلس ترقی ادب لاہور — 1983

74-نمونہ منثورات — احسن مارہروی — مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد — 1986

75-وقائع راجستھان یا تاریخ راجگان ہند — حکیم محمد اشفی خاں — مدرسہ برقی پریس لکھنؤ — 1927

76-ہادی ہریانہ — پروفیسر منظور الحق صدیقی

77-ہندوستان پریس — ڈاکٹر نادر علی خاں — یوپی اردو اکادمی لکھنؤ — 1990

78-یادگار غالب — الطاف حسین حالی — غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی — 1996

79-یادنامۂ داؤدی — حسین فراقی — دارالذکر، لاہور — 2003

(2) رسائل و جرائد

1-ششماہی اردو — کراچی — جنوری تا مارچ — 1969

2-سہ ماہی تحریر — نئی دہلی — جلد 4 نمبر 4

3-مجلہ معاصر — پٹنہ — حصہ 12

4-ماہنامہ نگار — لکھنؤ — مومن نمبر

5-ہفتہ وار ہماری زبان — علی گڑھ — 22 جولائی، 15 اگست یکم نومبر — 1960

6-ششماہی غالب نامہ — نئی دہلی — جنوری — 1985

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل)

مصنفین : گیان چند جین
سیّدہ جعفر
صفحات: 462
قیمت: -/454 روپے (سیٹ)

تاریخ ادب اُردو (جلد دوم)

مصنفین : گیان چند جین
سیّدہ جعفر
صفحات: 527
قیمت: -/545 روپے (سیٹ)

تاریخ ادب اُردو (جلد سوم)

مصنفین : گیان چند جین
سیّدہ جعفر
صفحات: 464
قیمت: -/545 روپے (سیٹ)

تاریخ ادب اُردو (جلد پنجم)

مصنفین گیان چند جین
سیّدہ جعفر
صفحات: 443
قیمت: -/545 روپے (سیٹ)

اُردو کے ادبی معرکے

مصنف: محمد یعقوب عامر
صفحات: 448
قیمت: -/85 روپے

اُردو ڈراموں کا انتخاب

مصنف: محمد حسن
صفحات: 600
قیمت: -/156 روپے

₹ 126/-

ISBN : 978-81-7587-770-2
9 788175 877702

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025